BROWN BOOK

UNIVERSAL LIBRARY
OU_224349
UNIVERSAL LIBRARY

ایشیا

اس نمبر کے چند لکھنے والے

جوش ملیح آبادی
لطیف الدین احمد اکبر آبادی
ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری
رام پرتاپ بہادر ایم اے
ارشاد بیگ
جان نثار اختر
اختر الایمان
اکرام قمر ایم۔اے
راحت سعید

مدیر اعلیٰ ساغر نظامی

ثروت آرا بیگم

محترمہ حمیدہ سلطان کا شاہکار

حمیدہ سلطان صاحبہ جو ہندوستان کی ادیب خواتین میں ممتاز درجہ رکھتی ہیں۔ ادبی حلقوں کے پیہم اصرار و تقاضوں سے متاثر ہو کر اپنی قدیم تصنیف "ثروت آرا بیگم" شائع فرمادی ہے۔ یہ اخلاقی و ادبی لحاظ سے ایک خاص مرتبہ کا ناول ہے جس میں زندگی اور سماج کی کامل اور صحیح تصویر کھینچی گئی ہے۔ "ثروت آرا بیگم" میں قیاس سے بعید تصوریت اور گذری ہوئی شعریت کی جھلک نہیں ناول میں مقررہ ماحول اور کردار کی مطابقت سے واقعیت نگاری کو خاص اہمیت دی گئی ہے اور وہ واقعیت نگاری ایک خاص ماحول سے تعلق رکھتی ہے۔

"ثروت آرا" کی زبان اُسے نمایاں طور پر دوسرے ناولوں سے اک امتیاز بخشتی ہے۔ اس کا ہر صفحہ مُنہ سے بول رہا ہے کہ یہ ایک دہلوی خاتون کی تصنیف ہے۔ زبان کی بے ساختگی اور لطافت نے اس ناول کو بڑی امتیازی حیثیت دیدی ہے۔ یہ بڑی تسکین دہ بات ہے کہ اندازِ بیان اور اسلوب میں روایتی رومان نگاری اور افسانویت نہیں پائی جاتی لفظی ترکیبیں اور لہجے کی بے ساختگی سادگی، وقار اور مکالمہ میں زبان کا معیاری لوچ یہ تمام عناصر ایسے گھلے ملے ہوئے ہیں کہ کتاب شروع کرنے کے بعد کوئی اسے ادھورا نہیں چھوڑ سکتا یہی نہیں "ثروت آرا بیگم" اپنے انداز کا خاص کلچر تہذیب اور تمدن رکھتی ہے۔ اُس کو پڑھ کر دلی کی مٹی ہوئی تہذیب کا نقشہ آنکھوں میں کھنچ جاتا ہے۔ اسکے مطالعہ سے دسیوں محاورے جو دلی کے مردوں میں نہیں عورتوں میں بولے جاتے ہیں معلوم ہوجاتے ہیں۔

حمیدہ سلطان صاحبہ نے اس ناول کو اپنے برادرِ محترم آنریبل مسٹر فخرالدین علی احمد سابق ریونیو منسٹر (آسام) کے نام معنون کیا ہے شروع میں فخرالدین صاحب کی تصویر بھی شریکِ کتاب ہے۔ قیمت عہ/ علاوہ محصول۔

ملنے کا پتہ:- **مکتبہ ساغر ادبی مرکز میرٹھ**

(سنہ ۱۹۳۵ء میں جاری ہوا)

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی ماہنامہ

ایشیا

منظور شدہ

محکمہ تعلیمات حکومت صوبہ متحدہ حکومت بہار

حکومت سی پی اور حکومت صوبہ پنجاب

مرتبہ

ساغر نظامی

ناشر

مکتبہ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

بت سالانہ پانچ روپیہ (ہندوستان سے) — جملہ حقوق محفوظ — قیمت سالانہ آٹھ روپیہ (بیرونی ملکوں سے)

قیمت فی نمبر ۸ آنے — (نمونہ مفت نہیں بھیجا جاتا) — ایجنسیوں کو ۲۵ فی صدی کمیشن

ایشیا

جلد ۷	اگست ۱۹۴۲ء	نمبر ۷

فہرست مضامین

شمارہ	مضمون	مضمون نگار	نمبر صفحہ
	نئی صبح (ادبیات وسیاسیات)		
۱	اشارات	ساغر نظامی	۱۰
۲	آنیوالی دُنیا کی جھلک	مرزا ارشاد بیگ	۱۱
۳	روسو کا نظریہ مشیت عامہ	اکرام قمر ایم۔ اے	۲۰
۴	قطعات	راحت سعید	۲۳
۵	سنگھائے سیل	عرش تیموری	۲۴
۶	اٹھارویں صدی کے دو ڈانی کی	قاضی عبدالغفار	۲۹
۷	صحافت اور اسکے چند نمونے		
	نیا راگ (نظم وغزل)		
۸	نیا راگ	ساغر نظامی	۳۴
۹	اربابِ شکستہ	عندلیب شادانی	۳۵
۱۰	آدمی	جوشؔ	۳۶
۱۱	مچلکے	اختر الایمان	۳۸
۱۲	قلوبطرہ کا جلوس	م۔ش حقی دہلوی	۳۹
۱۳	ایک حسین منظر	شاہد صدیقی	۴۱
۱۴	تخریب کا ترانہ	حسن یحییٰ عندلیب ایم۔اے	۴۲
۱۵	در وصفِ امینہ خانم	حسرت موہانی	۴۳
۱۶	انعکاسات	ساغر نظامی	۴۵
۱۷	(دو غزلیں)		۴۶
۱۸	آخری آنسو	حسرت ترمذی	۴۶
	فکر عالی	جمیل الدین عالی	۴۶
۱۹	ستارے	مخدوم محی الدین حیدر آبادی	۴۷

شمارہ	مضمون	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۲۰	شکست	خورشید الاسلام بی اے (علیگ)	۴۸
	نئی کہانی (افسانے و ڈرامے)		
۲۱	نئی کہانی	ساغر نظامی	۵۰
۲۲	جذباتی کیڑے	مو دھو سودن	۵۱
۲۳	سڑک	پرتھوی ناتھ شرما	۵۷
۲۴	شام	رام پرتاپ بہادر ایم۔اے	۶۳
۲۵	بیگم	مسعود زاہدی	۶۹
	کسوٹی (تنقید وتبصرہ)		
۲۶	کیا گوری کیا سانولی	میراجی	۷۴
	نئی کتابیں		
۲۷	جگ بیتی	ادارہ	۷۸
۲۸	ادب کثیف	″	
۲۹	جوانی دنیا کے عجائبات	″	۷۹
۳۰	نغمۂ زندگی	″	
۳۱	دیوان جوشش	″	
۳۲	تمہیدی خطبے	″	
۳۳	ہماری غذا	″	
۳۴	تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ	″	
۳۵			
۳۶	محمد رسول اللہ	″	۸۱
۳۷	گورکی کی آپ بیتی	″	۸۲
۳۸	ٹراٹسکی کا بیان	″	۸۳
۳۹	شانِ خدا	″	۸۳
۴۰	ناستبت	″	۸۴
۴۱	ہندوستانی کھیل	″	۸۵

1952

نئی صبح

اشارات

موجودہ مشکلوں سے بھری دُنیا میں اشیا کی قدریں خود ہی اہم اور بلند ہوگئی ہیں۔ "کاغذ و سیاہی" سونے چاندی کی قیمت رکھتے ہیں۔ اس گراں قدر زمانہ میں ہر ادارہ کو یہ محسوس کرنا چاہئے کہ محض کاغذ سیاہ کرنے کی جدوجہد وقت اور قوّت کا ضائع کرنا ہے اگر آج کوئی کتاب یا رسالہ اپنا معیار قائم نہیں رکھ سکتا تو اس کا فنا ہوجانا زندہ رہنے سے بہتر ہے۔ اس لحاظ سے بھی کہ بدذوقی کی اشاعت میں کمی ہوجائے گی اور اس اعتبار سے بھی کہ اس کے حصّہ کا کاغذ دوسرے مستحقین کو مل سکے گا۔

ایشیا کا جون و جولائی مشترک نمبر میری عدم موجودگی میں شائع ہوا۔ دکن میں میری نگاہ سے گزرا، پہلی نظر ہی میں میرے ضمیر نے مجھے حکم دیا "تم دونوں میں سے ایک کی فنا فرض ہوگئی ہے"!؟ یہاں مجھے نہ ذمہ دار اراکین پر نکتہ چینی کرنی ہے، نہ کسی اور پر، مگر یہ ضرور اعتراف کرنا ہے کہ مجھے اپنی غیر ذمہ داریوں کا احساس ہوا، اور میں نے فیصلہ کرلیا کہ ایشیا کا بند کردینا پسند کروں گا مگر اس کی یہ حالت نہ ہونے دوں گا جو مشترک نمبر کی ہوئی۔ اس حالت کا واحد ذمہ دار صرف "ساغر" ہے، جسے آپ چاہیں معاف کردیں مگر میں معاف نہیں کرسکتا۔!؟

تازہ نمبر صحتِ کتابت اور اپنے مقالات، مضامین، افسانوں، نظموں اور تنقیدی جزو کے اعتبار سے اپنے معیّنہ اور مقررہ معیار پر شائع کیا جارہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہماری خواہش تو یہی ہے کہ ممکن طور پر بلند ہوں، اور ایشیا جو کچھ پیش کرے اس کی حیثیت اِک آئیڈل کی حیثیت ہو، مگر بعض اوقات ایسی فروگزاشتیں ہوجاتی ہیں کہ ان کی تلافی ممکن نہیں ہوتی۔

ارشاد بیگ صاحب نے "آنے والی دُنیا کی جھلک" اس مرتبہ بھی دکھائی ہے، حیاتیاتی مسائل پر ڈارون ہربرٹ اسپینسر اور لزلی اسٹیفن نے ایک خاص مرکز تک غور و فکر کے بعد کچھ اخلاقی نظریّہ مرتب کئے۔ اسپینسر اور اسٹیفن نے غور و فکر کی بنیاد ڈارون کے نظریات پر قائم کی۔ ارشاد بیگ نے اِن سب کا گہرا مطالعہ کیا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسپینسر اور اسٹیفن سے بھی آگے جانا چاہتے ہیں؛ پہلے مقالہ کی بہت کچھ تصریح اِن کے تازہ مقالہ میں پائی جاتی ہے، تیسرے مقالہ میں وہ اپنے مطالب کو اور بھی واضح کریں گے۔

"روسو کا نظریۂ مشیّتِ عامّہ"، مختصر مضمون ہے۔ اس میں اکرام قمر نے ایک بڑی بحث کو چھیڑ کر جلد ختم کردیا ہے، طامس ہوبز، لوک اور روسو کے مقابلہ میں ملوکیت پسند تھا وہ مشیّتِ عامّہ کا قائل نہیں تھا، فرد کی اطاعت اور شخصی جابریّت، کو مانتا تھا۔ لوک نے ہوبز کے نظریّوں میں ترمیمات کیں، اور انھیں عملی سیاسیات سے ہم دوش کیا۔ روسو نے لوک کی تعلیمات کی روشنی میں حاکمیّت اور آزادیٔ رعایا کے مابین ایک معاہدۂ سیاسی کا نظریہ پیش کیا۔

روسو کے پیش کردہ ان مسائل اور نظریات پر بہت کچھ وضاحت سے لکھا جاسکتا ہے، تاہم اس مختصر مضمون میں ان تمام مسائل پر طائرانہ نگاہ ڈالی گئی ہے، جو افادیت سے خالی نہیں۔

"اٹھارویں صدی کے دورِ ثانی کی صحافت اور اُس کے چند نمونے" قاضی عبدالغفار کا مضمون ہے؛ جو یہ اندازہ کرنے کے لئے نہایت دلچسپ چیز ہے کہ اُردو کتنے چولے بدل کر ہم تک پہونچی ہے۔

ساغر

ارشاد بیگ

آنے والی دُنیا کی جھلک

غیر شعوری ارتقاء میں قباحتیں

غیر شعوری ارتقاء کے زمانہ میں نہ مرنا اچھا ہے نہ جینا کیونکہ زندگی میں تخریب و تباہی کے علاوہ تعمیر و تسکین کے پہلو مفقود ہیں۔ اصل میں اس وقت تک ہماری قوتِ حیات ترتیب و تشکیل اور اضافہ (ADDITION) و تغیّر (ALTERATION) کے عمل سے گزر رہی تھی۔ زندگی تو تھی ہی نہیں بلکہ قوتِ حیات کی شعوری منزل حاصل کرنے کے لئے محض ایک جد و جہد تھی۔ اور آگے بڑھتا تھا مگر ماحول اور سماجی نظام سابقہ معیار پر قائم رہتا تھا۔ اس طرح زندگی اور ماحول میں تطابق قائم نہیں ہوسکتا تھا۔ اس عدم تطابق کا لازمی نتیجہ تباہی اور جمود کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا۔ اور ہمارے جذبات اور آرزوئیں تشنہ رہ جاتی تھیں۔ مگر اب ترتیب و تشکیل کا یہ کھیل ختم ہو رہا ہے۔ یہ تمام کھیل تو صرف اس لئے تھا کہ ہم ایک اعلیٰ شعوری ارتقاء کے مرتبہ پر پہنچ جائیں۔ اب قوتِ حیات شعوری حیثیت اختیار کرے گی اور ایک ایسا درجہ معرضِ شہود میں آجائے گا جہاں ذہن اور ماحول ایک ساتھ شعوری حیثیت میں ترقی کریں گے۔ زندگی شعوری سمت میں آگے بڑھے گی۔ شعوری درجہ قائم ہونے کے بعد زندگی کا صحیح نظام قائم ہوجائے گا۔ قوتِ حیات کی پامالی اور غیر شعوری رفتار کے بجائے ایسی زندگی وجود میں آئے گی جو ادراک کے شعوری خاکوں کا نتیجہ ہوگی۔ اور آئندہ تمام ارتقاء انہی شعوری خاکوں میں اضافہ کی صورت میں ہوگا۔ آئندہ زندگی میں "ریاست" "وطن" یا "مذہبی خدا اور سچائی" کے نام پر ہر فرد کو اپنی خواہشات اور مسرّتوں کی قربانی نہیں کرنی پڑے گی نہ اعلیٰ صداقت اور اقتدار کے تصوّرات اور بلند آدرشوں کو کامیاب بنانے کے لئے جذبات احساسات کی زندگی کو کچلنے کی ضرورت ہوگی۔ یہ باتیں تو صرف اس لئے تھیں کہ دوسرے کم درجہ کے تصوّرات اور میلانات ہماری ذات کے نشو و ارتقاء کو نہ روک سکیں لیکن شعوری مرتبہ کے بعد ارتقاء میں غیر شعوری غلط اور کم درجہ کے میلانات کے حارج ہونے کا مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوگا۔ غیر شعوری ارتقاء کے زمانہ میں انسانوں کو گھر بار۔ بیوی بچے۔ مال و دولت۔ سماج میں پوزیشن محبّت اور اپنی دلچسپیوں وغیرہ کو اکثر قوتِ حیات کے ارتقاء کے لئے (سچّائی۔ وطن۔ اخلاق یا فرض کے نام سے یا اعلیٰ مقصد بنا کر) کچل دینا پڑتا تھا۔ آئندہ زندگی میں خود یہ تمام چیزیں انسان پر نچھاور ہوں گی یعنی انسانی زندگی میں تشنگی اور کرختگی کا نشان بھی باقی نہیں رہیگا۔

مُستقبل کی تاریخ

آئندہ تاریخ میں زوال کا کہیں ذکر نہ ہوگا۔ "زوال" اُس قوّتِ حیات کے گرنے کا نام تھا جو آگے بڑھنے کی صلاحیت اور اپنا فائدہ زائل کرچکی تھی اور اس کے بجائے دوسری تازہ قوّت اُبھرتی تھی۔ ایک کے زوال اور دوسرے کے عروج کی اصل وجہ یہ تھی کہ قوّتِ حیات سب کو شیرازہ بند کرکے ایک (UNIT) کی طرح ترقی نہیں کرتی تھی۔ نوعِ انسان کی جدّ و جہد قوّتِ حیات کی شیرازہ بند اور شعوری جدّ و جہد نہیں تھی۔ آئندہ تاریخ میں نوعِ انسان ایک ہی مرکز اور ایک ہی مقصد کیلئے شعوری جد و جہد کرے گی۔ اس لئے زوال کا مسئلہ پیدا نہیں ہوگا زوال اور عروج دو چیزوں کا وجود چاہتا ہے یعنی ایک گرنے کے لئے موجود ہو اور دوسری اُبھرنے کے لئے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ انسان کی قوتِ حیات دو سمتوں میں کام کرے۔ آئندہ

تاریخ میں ایسا نہیں ہوگا۔ جنگ بھی ایک مشترکہ مقصد کی عدم موجودگی اور صحیح شعور سے دوری کا نتیجہ تھی۔ اور یہ ارتقاء کی ایک گذر جانے والی حالت تھی۔ مختلف گروہ۔ مخالف جماعتیں رجعت پسند ادارے۔ مساجد۔ مندر۔ گرجے۔ محض قیاسی مسائل پر تحقیقات کرنے والی سوسائٹیاں۔ دماغی قوتوں کو زائل کرنے والی بیکار یونیورسٹیاں۔ ان سب کے ذکر سے نئی تاریخ کے اوراق آلودہ نہیں ہوں گے۔ آج کہیں پان ہندوازم ہے کہیں پان اسلام ازم۔ کہیں یورپین جمہوریتوں کے اتحاد کی تجاویز ہیں۔ کہیں ایشیائی نظام تو کہیں نازیوں کا نیا نظام ہے۔ کہیں قادیانیوں اور بہائیوں کی نئی دُنیا ہے۔ "ہر ایک ہاتھ میں ایک جام ہے مگر خالی"۔ غرض اذہان دُنیا کے ہر گوشہ میں ایک دوسرے سے متضاد۔ باطل اور غیر حقیقی تصورات میں ضائع ہو رہے ہیں۔ آئندہ دُنیا میں ایک صحیح جانا بوجھا آئیڈیل ہوگا جس پر جد و جہد کی بُنیاد رکھنے کے بعد نوع انسان کا ذہن ضائع نہیں ہوگا۔ زندگی شانت اور مالامال ہو جائے گی۔ پادری مولوی۔ پنڈت۔ اور سیاہی سماج کے کارفرما عوامل میں سے
نہیں ہوں گے۔ آئندہ دنیا میں نقصان (WASTE.) کے ۱۲
امکانات بھی باقی نہیں رہیں گے۔

۱۔ نقصاناتِ جنگ کا ازالہ ہو جائے گا۔

۲۔ علم بردارانِ مذاہب کا کوئی مقام اور عمل باقی نہیں ہوگا۔ پادری۔ مولوی۔ پنڈت۔ سماج پر بوجھ بن کر نہیں رہیں گے۔

۳۔ تبلیغی مراکز۔ قیاسی مسائل پر تحقیقات کرنے والی سوسائٹیاں۔ نوجوانوں کی زندگی کو بیکار کرنے والی یونیورسٹیاں یہ تمام ادارے معدوم ہو جائیں گے۔

۴۔ مخالف جماعتیں۔ غلط تصورات اور "ازم" وغیرہ میں ذہنوں کا ضائع ہونا ختم ہو جائے گا۔

۵۔ نسل اور مذہب کے تعصب کی وجہ سے پیدا شدہ تمام نقصانات کے امکانات مٹ جائیں گے۔

۶۔ جیل خانے نہیں رہیں گے۔

آئندہ تاریخ میں قوموں کی غلامی اور نسل انسانی کی پامالی کی داستانیں معدوم ہو جائیں گی۔ کیونکہ ماحول اور نظام کی ہیئت یکسر مختلف ہوگی۔

حیاتیاتی طاقت کا طلوع

حیاتیات کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ عمرانیات کے مسائل کسی معاہدہ کی بناء پر طے و حل نہیں ہوتے بلکہ طاقت کی بناء پر فیصل ہوتے ہیں۔ عمرانی مسائل کو طے و حل کرنے کیلئے یہ طاقت قوتِ حیات سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ قوتِ حیات از خود ذہن انسانی میں نہیں اُبھرتی تھی۔ بلکہ غیر ترقی یافتہ قوتِ حیات کی وجہ سے جو نئے طریقے اور ذرائع انسان معلوم کرتا تھا وہی طاقت کی بنیاد ثابت ہوتے تھے جس میں زیادہ جان ہوتی تھی وہی زیادہ نئے طریقے اور ذرائع معلوم کر سکتا تھا۔ اور اس طرح خود کو زیادہ قوی بناتا تھا میکانی ذرائع کے پس پشت دراصل ذہنی اور قوتِ حیات کی صلاحیت ہی کام کرتی رہی ہے دوسرے الفاظ میں حیاتیاتی صلاحیت ہی میکانی صلاحیت کا سرچشمہ ہے آج وہی حیاتیاتی قوتِ حیات ترقی پاکر نئی شکل میں اُبھر رہی ہے اس لئے اس کے سامنے میکانی طاقت بیکار ہو جائے گی کیونکہ میکانی طاقت اسی قوتِ حیات کی غیر ترقی یافتہ صورت تھی۔ فرد میں قوتِ حیات کا ہونے والا نشو و ارتقاء اجتماعیات پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ انگریزوں اور ہندوستانیوں کی حاکمی و محکومی کا مسئلہ کسی معاہدہ سے طے نہیں ہوا تھا۔ مغرب کا مشرق پر قبضہ اور غلبہ کسی معاہدہ کا نتیجہ نہیں تھا۔ بلکہ قوتِ حیات کے نشو و ارتقاء نے جو اجتماعی اثر ڈالا اس کی بناء پر تاریخ نے یہ شکل اختیار کی۔ آئندہ نظام میں مسائل کسی معاہدہ کی بناء پر طے نہیں ہوں گے۔ بلکہ نئی حیاتیاتی قوتِ حیات ہی حکم بنکر مسائل کا فیصلہ کرے گی۔ اور چونکہ یہ نئی حیاتیاتی طاقت صحیح شعور کی حیثیت اختیار کرے گی اس لئے لوٹ کھسوٹ اور ناانصافی پر مبنی نتائج ظہور پذیر نہیں ہونگے جیسے معاہدہ ورسیلز کے وقت ہوئے تھے۔ اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ آئندہ نظام کی بنیاد حیاتیاتی حقائق پر ہوگی اور تاریخ میں شعوری ارتقاء کا ایک نیا آغاز ہوگا۔

تاریخ کا حیاتیاتی نظریہ

حیاتیاتی عناصر تاریخ انسان کی تشکیل میں جو اہم اور بنیادی پارٹ ادا کرتے ہیں اُن کا اندازہ ذیل کے مدارج سے ہو سکتا ہے۔

۱۔ تاریخ کا ارتقاء حیاتیاتی ارتقاء ہے۔

۲۔ موجودہ بحران حیاتیاتی عمل کے مکمل نہ ہونے کی وجہ سے تھے۔

۳۔ آنے والا انظام اچانک صورت میں ظاہر ہوگا۔ کیونکہ حیاتیاتی ارتقا غیر مرئی ہوتا ہے۔

۴۔ تمام نوعِ انسان کے ادراک کو نئی قوتِ حیات مقیّد کرے گی۔ اور نظامِ عالم معطل حالت میں رک جائیگا۔

۵۔ حیاتیاتی قوّتِ حیات میکانی قوّت کی بجائے خود عمرانی مسائل کے حل کے لئے ایک قوّت بن جائے گی۔

۶۔ شعوری ارتقار کا زمانہ شروع ہو جائیگا۔ نوعِ انسان کا ذہن آزادانہ ترقی کرے گا۔ غیر شعوری میلانات کی غلط مزاحمت اور اَن دیکھی قوتوں کی مخالفت کا خدشہ نہیں رہیگا۔

۷۔ نوعِ انسان کی پامالی کا پہلو ختم ہو جائیگا۔ کیونکہ اب قوتِ حیات غیر شعوری اور اندھے ارتقار کے عمل سے گزر چکی ہوگی۔

عمرانی صلاحیت

آئندہ زمانہ میں عمرانی صلاحیت منتشر اور اندھی حالت میں کام نہیں کریگی بلکہ ایک منضبط اور شعوری حیثیت اختیار کرے گی۔ یہی نہیں بلکہ ارتقار کی ایک اعلیٰ ہیئت بھی اختیار کرے گی۔

یہ یاد رکھیئے کہ ارتقار قوتِ حیات میں رونما ہوتا ہے اور قوتِ حیات کی لطافت ہی انسان میں الوہیت کی شان پیدا کر دیتی ہے۔ انسان میں ترقی اسی لطیف کیف و ہیجان کی مرہونِ منّت ہے۔ تخلیق اور نئے طریق کا تعلق اسی لطیف قوّتِ حیات سے ہے۔ خدا کا تعلق بھی عملی قوتِ محرکِ تخلیق اور عمرانی صلاحیت سے ہے۔ چونکہ خدا کا تعلق اس قوت سے ہے جو نوعِ انسان کی جدوجہد کی محرک اور رہنما ہے۔ اس لئے خدا زندگی پر قادر قرار پاتا ہے۔ لیکن آج مذہب کا خدا زندگی پر سے اپنا کنٹرول اور اقتدار کھو چکا ہے۔ اسے زندگی کی دھڑکن اور حرکت سے دور کی بھی نسبت نہیں ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ قوّتِ حیات حیاتیاتی نقطۂ نگاہ سے ہر انسان میں جاری و ساری ہے اس لئے خدا مشترکہ خدا ہے اور چونکہ انسان ابھی تک ایسے مقام پر نہیں پہنچا ہے جہاں لطیف قوتِ حیات ہمارے ذہن پر منکشف ہو جائے۔ اس لئے خدا ابھی ابھی تک ایک راز ہے۔ لیکن نئی ہیئت ذہنی میں خدا کا عرفان حاصل ہوگا۔ کیونکہ انسان حیوانی سطح سے بلند ہو جائے گا اور اس کے حواس و ذہن ایک اعلےٰ مرتبہ پر پہنچ جائیں گے۔ اتنا ہی نہیں ہوگا بلکہ دُنیاوی جدوجہد سے بھی بہیمیت اور حیوانیت کی بو نہیں آئے گی۔ خدا ایک حیاتیاتی قوت۔ علم اور تخلیق کا سرچشمہ ہے اور عملی جدوجہد سے انسلاک رکھتا ہے۔ مگر مذہب کا خدا اعتقاد کی حدود سے آگے نہیں بڑھتا۔

جب قوتِ حیات ایک اعلیٰ شکل میں ارتقا پذیر ہونا چاہتی ہے۔ اس کا تموّج انسان کے ذہن پر نہایت تیز پڑتا ہے اس تموّج کے پرتو سے خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ اس عالم میں اگر انسان گفتگو کرنا چاہے تو الفاظ اس کے مُنہ سے ادا نہیں ہو سکتے کیونکہ گفتگو ادراک سے وابستہ ہے۔ یعنی بولنا ہماری سمجھ کا حیاتیاتی اظہار ادراک ہے۔ لیکن ادراک ایک خیرہ کُن حیثیت میں ہونے کی وجہ سے اپنا حیاتیاتی اظہار کرنے سے معذور ہو جاتا ہے۔ جب قوتِ حیات نے اس خیرہ کُن تموّج کو ذہن
۱۳ برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے تو اس کے بعد شعوری ارتقار کے درجات شروع ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس سے پہلے ادراک ایک خیرگی میں اسیر ہوتا ہے۔ جب تک حواس قوّتِ حیات کی اُبھرتی ہوئی لہروں کو قبول کرنے کے قابل نہ ہو جائیں قوّتِ حیات مردہ حیثیت میں رہیگی۔ یعنی جب تک نوعِ انسان کے جسم میں قوتِ حیات کی لہریں ذی ہوش طریقے سے کام کرنے کے قابل نہیں ہوں گی ایک موت کی سی حالت نوعِ انسان کی حیات پر طاری رہے گی۔ آج ہر شخص پر موت طاری ہے۔ یعنی قوّتِ حیات ایک ایسی اندھی گلی کے سرے پر آ گئی ہے کہ اس سے آگے قدم رکھنا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ حواس قوتِ حیات کی اتنی اونچی لہروں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اور ذہن اپنا فعل جاری نہیں رکھ سکے گا۔ اس لئے ہر فرد کو اندھی گلی اور موت کی حالت سے بچنے کے لئے خود شعوری ہیئت ذہنی اور نئی قوّتِ حیات کے سہارے چلنا ہوگا۔ یہ ہی نوعِ انسان کے وجود کے باقی رہنے کا واحد حیاتیاتی طریقہ ہے۔

نئی قوّتِ حیات کو مزید ارتقار حاصل کرنے کیلئے نہایت دشوار مدارج طے کرنے پڑتے ہیں۔ پہلے ذہن کو کئی سال تک خموشی

کی حالت سے گزرنا پڑتا ہے۔ جب دماغ اور احساسات اتنی صلاحیت حاصل کر لیتے ہیں کہ نئی قوت حیات کی لہروں کو جذب کر سکیں۔ تو تین مدارج اور طے کرنے ہوتے ہیں۔ یعنی غیر ترقی یافتہ قوّتِ حیات کی ان تین نوعیتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جو وہ اجتماعی اور انفرادی زندگی میں اختیار کرتی ہے۔ پہلی نوعیت سیاسی قوت اور حکومت ہے دوسری نوعیت مسئلہ جنسی ہے۔ اور قوّتِ حیات کی تیسری نوعیت اُنسِ بالمثل یعنی مرد کا مرد سے محبّت کرنا ہے۔ جب تک نئے ارتقا کی دعویدار قوتِ حیات' غیر ترقی یافتہ قوّتِ حیات کی ان شکلوں کو کنٹرول نہ کرے۔ صحیح نظام شروع نہیں ہو سکتا کیونکہ قوّتِ حیات کی یہ تین نوعیتیں غیر ترقی یافتہ ہونے کی وجہ سے حیوانی حیثیت سے اونچی نہیں اُٹھ سکتیں۔ یہ تین نوعیتیں حیوانی حیثیت میں (۱) قتل وخونریزی۔ حرص وآز۔ (۲) حرام وبیسوائیت اور (۳) آوارگی۔ کی فضا پیدا کرنے کی ذمہ دار ہیں۔ اس لئے ان تین نوعیتوں کی جو قوّتِ حیات کا ہیجان زندگی میں اختیار کرتا ہے حقیقی مدارج ارتقا کے ذریعہ ہی کنٹرول کیا جا سکتا ہے محض مذہبی اپیل یا اخلاق یا وعظ سے دُنیا میں کبھی ان تین نوعیتوں کو صحیح لڑی میں نہیں پرویا جا سکتا۔ جب ایک ایسی بلند حیاتیاتی سطح ذہنی دُنیا میں قائم ہو جائے گی جو ان تین غیر ترقی یافتہ نوعیتوں سے حیاتیاتی کشمکشوں کو طے کرنے کے بعد صحیح اور تکمیل یافتہ حیثیت میں ظہور پذیر ہو گی تو ان تین نوعیتوں کی حیوانی حیثیت باقی نہیں رہے گی۔ کیونکہ یہ نئی قوتِ حیات کے کنٹرول میں آجائیں گی۔ اور لوٹ کھسوٹ اور حیوانی طور و طریق کا مظاہرہ کرنے کے لئے آزاد نہیں ہوں گی۔ اس لئے جنگ اور غلامی بھی دم توڑ دے گی۔ امن تسکین اور آزادی کی راہیں کھل جائیں گی۔ جنسی تعلقات میں اوباشی جاتی رہیگی کیونکہ جنسی تعلقات کا صحیح نظم پیدا ہو جائے گا۔ اولاد کی سرکشی اور آوارگی بھی ختم ہو جائے گی اور اولاد کی ذہنیت غلط سمت میں پرواز نہیں کریگی۔ جب یہ سب کچھ ہوگا تو دُنیا کی جد وجہد میں انتشار باقی نہیں رہیگا۔ اس مثلث میں مسائل کا حل ملاحظہ کیجئے۔

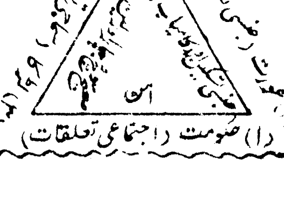

پہلے مقالہ میں سرسری طور پر ان مسائل کا ذکر کر چکا ہوں۔ تا حال حکومت اور سیاسی واجتماعی تعلقات خود غرضی۔ لوٹ کھسوٹ اور اسی قسم کے دوسرے عناصر سے پاک نہیں تھے۔ اس لئے دُنیا کی فضا بد امنی۔ تباہ حالی۔ ناانصافی اور خونریزی سے گھری ہوئی تھی۔ لیکن خود شعوری پر مبنی نظام میں اجتماعی تعلقات صحیح بنیادوں پر قائم ہوں گے اور امن اس کا لازمی نتیجہ ہوگا۔

اس وقت تک جنسی معاملات میں مرد ہمیشہ عورت کے در بھکاری ثابت ہوتا رہا ہے اور اس کی ساری توجہات عورت کی طرف راجع رہی ہیں۔ ہماری دُنیا میں ایسی مثالیں پائی جاتی ہیں کہ مرد ہر قسم کی عورت سے ملتفت ہوتا ہے۔ لیکن ایسی مثالیں بہت کم ہیں کہ عورت بھی اسی طرح ہر قسم کے مردوں سے ملتفت ہوتی ہو۔ اس وقت تک عورت کی فطرت ایک مجہول محبوبیّت کے دائرہ میں ڈانواڈول رہی ہے۔ جس کی وجہ سے نسل انسانی میں عمیق جنسی لگاؤ۔ تناسب اور گہری جنسی وابستگی نہیں پیدا ہو سکی۔ مرد کی بڑھتی ہوئی طالبیّت کے قدم بقدم عورت نے بھی مقابلہ کی طالبیّت نہیں دکھائی۔ اگر عورت بھی خود محبوبہ نہیں۔ عاشق بنتی تو سماج کے جنسی دھارے کا رُخ زیادہ صحت بخش ہوتا۔ مگر اب عورت مرد کی طرف رجوع ہو گی۔ اور مرد سے زیادہ دلچسپی اور لگاؤ کا اظہار کرے گی۔ نوع انسان میں صحیح شعور بھی پیدا ہو جائے گا۔ اس لئے مرد بھی عورت سے ناانصافی پر مبنی اور غلط برتاؤ نہیں کرے گا۔ علاوہ ازیں آئندہ قوت حیات کے منتشر نہ ہونے اور ارتقا کے بلند مقام پر پہنچنے کی وجہ سے مرد مطمئن ہو کر عورت کی جنسی تسکین کے سامان مہیا کر سکے گا۔

بچہ ہی بڑھ کر آدمی بنتا ہے۔ لڑکے کے ذہن پر کنٹرول گویا مرد کے ذہن پر کنٹرول ہو جاتا ہے۔ اولاد نہ صرف یہ کہ فرمانبردار ہو گی بلکہ ہر لڑکا خود ایک صحیح باپ بھی ثابت ہوگا۔

قوتِ حیات کے یہ تین پہلو جب منضبط اور صحیح حالت میں اعلیٰ حیاتیاتی سطح ذہنی سے منسلک ہو جائیں گے تو زندگی کے لئے ایک نعمت' ایک عظمت اور ایک برکت ثابت ہوں گے ان کا انتشار ہی دُنیا کی پراگندہ فضا کا باعث ہے اور اس انتشار ہی کی وجہ سے عمرانی صلاحیت ضائع ہوتی ہے اور یہ ضائع ہونا ایک دوسرے کے لئے تباہ کن ثابت ہوتا ہے۔ لیکن قوتِ حیات سے متعلق ان حقیقی اور عملی مسائل کو وہی نظام حل کر سکتا ہے جو

قوتِ حیات کے سائنٹفک حیاتیاتی مدارج سے گزر کر ایک اعلیٰ ہیئت اور بلند ارتقائی صورت میں خود کو دُنیا کے سامنے ظاہر کرے کوئی مذہبی دستور یا فزکس یا کیمسٹری کی قوتوں سے تعلق رکھنے والا نظام ان مسائل کا حل پیش نہیں کر سکتا۔

قوتِ حیات کی یہ تر ہیئت اُسی وقت ایک صحیح نظام کی صورت میں ظاہر ہو سکتی ہے جب قوتِ حیات ان تین بکھری ہوئی حالتوں کو غیر مرئی طور پر کنٹرول کرے۔ غیر محسوس طور پر دُنیا اور نوعِ انسان اسی عمل سے گزر رہی ہے۔

جب دُنیا میں ایک حیاتیاتی خود شعوری سطح ذہنی قائم ہو جائے گی اور ایک نئے نظام کی صورت میں ظاہر ہو گی تو چونکہ ہمارے تمام افعال احساسات کے اشارے پر صادر ہوتے ہیں۔ .... اعلیٰ نمونہ کے انسان میں وہ جذبات و احساسات ایک کڑی ہوتے ہیں اور یہ ذہن کے سوچ و چار اور خیالات کو صحیح سلسلۂ حیات اور عالم پر محیط روحِ مطلق سے ملا دیتے ہیں اس طرح نئے نظام کا خاکہ صحیح ترین فطری خاکہ ہو جاتا ہے جس میں غلط شعور کا دخل نہیں ہو گا۔ دوسرے یہ کہ روح کی تمام دبی ہوئی طاقتیں اُبھر آئیں گی۔ اصل اور مرکزی چیز ایک برتر اور اعلیٰ سطح ذہنی ہے۔ اسی سے تمام حیاتیاتی تبدیلیوں اور ذہن کی نئی ہیئت اور نئے نظام کے تمام کے مسائل کا تعلق ہے۔ یہی بنیادی اور مرکزی نکتہ ہے جو نئے نظام کے خاکہ کو سنبھالے ہوئے ہے اور یہی تمام حیاتیاتی اور ذہنی ترقی و تبدیلیوں کا سرچشمہ ہے اس لئے ہمارا نصب العین اسی سے وابستہ ہے۔

ہمارے افعال کی باگ قوتِ حیات کا ہیجان ہی سنبھالے ہوئے ہے۔ ادراک اسی قوت حیات کا ذہنی فعل ہے۔ تخیّل اور ادراک کے فرق کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ تخیّل کے پسِ پُشت قوتِ حیات کا تموّج نہیں ہوتا بلکہ تخیّل دماغ کی پرواز ہوتا ہے اس لئے اگر انسان تخیّل میں وہ کچھ بننا چاہے جس کا اس کی قوّتِ حیات کا ہیجان ادراک کی صورت میں خود کو اہل نہیں پاتا تو اسے ناکامی ہو گی۔ انسان کی قوتِ حیات کا ہیجان اس کے تخیّل کا ساتھ نہیں دیگا۔ انسان خود کو اور اپنے تخیّل کو کھوکھلا محسوس کرے گا۔ انسان کا ہیجان ہی اسے بتاتا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے۔ یہ ہیجان انسان کی قوتِ حیات کے تموّج ہی کا پرتو ہے۔ اس لئے انسان کی جد وجہد اس کی قوتِ حیات کی منّت کش ہے۔ انسان کا خارجی ماحول انسان کی قوت حیات کے ہیجان کو چھوتا ہوا چلتا ہے۔ قوتِ حیات کا یہ ہیجان انسان پر چھایا ہوا ہے وہ اس کی گرفت سے نہیں بچ سکتا۔ بیشک یہ ہیجان اب تک منتشر حالت میں ہے۔ اور غیر شعوری رو میں بہہ رہا ہے لیکن انسان کو اس سے مفر کہاں؟ انسان کے مزاج اور نفسی کیفیات کو یہی ہیجان تبدیل کرتا ہے۔ انسان اس کے اشارے پر ہر کام سرانجام دیتا ہے۔ قوّتِ حیات کے اس ہیجان کے اصول محکم ہیں۔ یہ انسان میں ایسے تناؤ اور لہریں پیدا کرتا ہے کہ انسان کی جدّ وجہد ان کی پابند ہو کر سفر کرتی ہے۔ لیکن تاحال یہ تمام عمل غیر شعوری، منتشر اور بے ترتیب حالت میں ہے۔ جب قوتِ حیات کا ہیجان خاموش ہو جاتا ہے تو انسان کا خیال باوجود کوشش کے خود کو جد وجہد پر آمادہ نہیں کر سکتا اور جب انسان میں یہ ہیجان پوری قوت سے کروٹیں لیتا ہے وہ ایک شدید جد وجہد کے لئے مستعد ہو جاتا ہے۔ خارجی جد وجہد انسان کی قوتِ حیات کے ہیجان کے خلاف نہیں جا سکتی۔ اس لئے موجودہ خارجی جد وجہد قوّتِ حیات کے ہیجان کے نئے ارتقاء اور اعلیٰ مقام کے لئے فضا پیدا کر رہی ہے اور دُنیا کو اسی سمت میں لے جا رہی ہے۔ کیونکہ خارجی جد وجہد قوتِ حیات کے ہیجان کے ارتقاء سے الگ کسی اور شے کی پیدا کردہ نہیں ہے۔ پس اب خارجی جد وجہد بھی مکمل طور پر ہمیں ایک تبدیلی کے ساحل پر پہنچا دیگی کیونکہ قوتِ حیات کا ہیجان اب مکمل طور پر ایک نئی ہیئت حاصل کر رہا ہے اور قوت کے نئی ہیئت میں آ جانے سے ہماری خارجی جد وجہد کا نقشہ بھی قطعی تبدیل ہو جائے گا۔

حیاتیاتی اصولِ اصلح

آج کی صحبت میں یہ سوال اہم ترین سوال ہے کہ آخر وہ کیا چیز ہے جو انسان کو .... زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے قابل بناتی ہے۔ بدقسمتی سے اس سوال کا جواب آج تک صحیح نہیں دیا گیا اور اس مسئلہ پر جس قدر روشنی ڈالی گئی وہ نہایت غلط طور پر ڈالی گئی۔ میری کوشش ہو گی کہ میں آپ کو یہ بتاؤں کہ قوتِ حیات کا ہیجان اور نفسی جولانگاہ ہی وہ چیز ہے جو حیات کے قائم رکھنے اور آگے بڑھانے میں حصّہ لیتی ہے۔ قوت حیات کا ہیجان اور تموّج ہمارے ذہنی اور جسمانی تمدن میں

ایک روح پھونک دیتا ہے۔ دماغ کو نئے نئے طریقے معلوم ہو جاتے ہیں۔ نئی نئی باتیں سوجھتی ہیں۔ یہی قوتِ حیات کا تموّج نئے نئے ذرائع کی صورت میں ہمیش ماحول پر قابو پانے کی قوت عطا کرتا ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ جس فرد میں قوتِ حیات کا ہیجان دب جاتا ہے وہ فرد جامد و ساکت اور بے دست و پا ہو جاتا ہے وہ تخریبی قوتوں پر جوابی وار نہیں کر سکتا۔ نہ اسے نئی نئی راہیں سوجھ سکتی ہیں اور نہ اسے اپنے وجود میں قوت محسوس ہوتی ہے۔ ایسے فرد میں بڑھتے ہوئے زمانہ کے ساتھ چلنے کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے۔ فرد کے زندہ اور باصلاحیت ہونے کا معیار یہ ہے کہ اسکی نفسی جولانگاہ نت نئی صورتوں میں ظہور پذیر ہونے کے لئے متحرّک رہے۔ زندہ فرد میں ہیجان اور تموّج شدّت کے ساتھ پایا جائیگا اس کے برخلاف مردہ فرد میں سکون اور موت کی سی خاموشی ہوگی وہ عاجز نگاہوں سے انتہائی درد کے ساتھ خود کو مٹتا اور کچلتا ہوا دیکھتا رہیگا۔ لیکن اس کے وجود میں قوتِ حیات کا ہیجان کوئی طاقت بنکر نمودار نہیں ہوگا۔ وہ اپنے دماغ۔ اعضاء اور قویٰ کو استعمال کرنے کی راہیں نہیں پائے گا۔ بلکہ وہ ایسا محسوس کریگا کہ اس کے پر کاٹ دئے گئے ہیں۔ اس کی قوت سلب کر لی گئی ہے۔ ......(ADAPTABILITY.) مطابقت کا لفظ نہایت ہی مہلک تصوّر پیدا کرتا ہے۔ پنپنے کا بنیادی اصول یہ ہے کہ بڑھتی ہوئی قوتِ حیات کے ہیجان کی راہ میں رُکاوٹ نہ ڈالی جائے۔ اسے دبایا نہ جائے بلکہ اس سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جائے۔ بڑھتی ہوئی قوتِ حیات کے تموّج کو صحیح طور پر آشکارا کرنا ہی زندگی کی کنجی ہے۔ ماحول نتیجۃً بنتا چلا جائے گا۔ ایک اہم چیز غور کے قابل یہ بھی ہے کہ عبوری دور میں کوئی ماحول نہیں ہوتا جس سے تطابق کیا جائے۔ بلکہ ایک تخریبی کیفیت ہوتی ہے۔ تخریبی حالتوں میں سے وہی آگے بڑھتے ہیں اور وہی نیا ماحول بناتے ہیں جو قوتِ حیات کے ہیجان کی رو کو معطل نہیں ہونے دیتے۔ ماحول سے تطابق کا اصول نہایت ہی مبہم اور بیکار سا ہے صحیح چیز قوتِ حیات کے ہیجان کو کامل قوتِ اظہار بخشنا ہے قوتِ حیات کے تموّج کو نہ روکنا ادراک کے اشارے پر آگے بڑھنا ہی ارتقاء کا ذریعہ ہے۔

ایک اور بھی غلط اصول ہے۔ اعضاء کے استعمال اور عدم استعمال کا۔ یعنی یہ کہ جس عضو کو استعمال نہیں کیا جائے گا وہ بیکار ہو جائے گا۔ اور جس کو استعمال کیا جائیگا وہ نشو و نما پائے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ قوتِ محرّکہ کونسی ہے جو ایک عضو کے استعمال اور دوسرے کے عدم استعمال کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اگر غور و فکر کی نگاہ سے دیکھا جائے تو قوتِ حیات کا تموّج ہی ایک ہی عضو کے استعمال پر اُکساتا ہے اور دوسرے کے استعمال میں تساہل برتنے والا میلان پیدا کرتا ہے۔ جب قوتِ حیات کا ہیجان اعضاء میں تھپیڑے مارنے لگتا ہے تو اعضا اپنے اندر ایک جوش محسوس کرتے ہیں۔ جو انھیں اپنے استعمال کی طرف راغب کرتا ہے اور اعضا نشو و نما پاتے ہیں۔ لیکن ان کی نشو و نما اسی حد تک ہوگی جس حد تک قوتِ حیات کا تموّج انھیں نشو و نما دیسکتا ہے۔ قوتِ حیات کے تموّج کی پشت پناہی کے بغیر محض استعمال نشو و نما کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ اور نہ اس کے بغیر استعمال کرنے کا رجحان پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر قوتِ حیات کے ہیجان کے بغیر استعمال جاری رکھنے کی کوشش بھی کی جائے۔ تو یہ ایک ٹہنی کو درخت سے توڑکر الگ نشو و نما دینے کے مترادف ہوگا۔ جب قوتِ حیات کا ہیجان اعضاء میں جاری نہیں ہوتا تو اعضا استعمال کی قوت سلب ہوتی ہوئی محسوس کرتے ہیں اور بالآخر ساکن و سامت ہو جاتے ہیں۔ فرد میں اس تموّج کے خاموش ہو جانے پر اگر ذہن کو استعمال کرنے کی کوشش بھی کی جائے تو یہ ایسا ہے جیسے پانی کے بغیر درخت کا پھلنا پھولنا۔ وہ خود بخود سوکھ جائے گا۔

اس کے علاوہ ایک چیز اور ہے جسے طبعی انتخاب (NATURAL SELECTION) کہا جاتا ہے طبعی انتخاب بھی دراصل قوتِ حیات کے ہیجان یا تموّج کے سلسلہ سے الگ کوئی چیز نہیں ہے لیکن اصلیت سے واقف نہ ہونے کی بنا پر اسے بھی ایک مدرجی اصول بنا کر پیش کیا گیا۔ ہوتا یہ ہے کہ جس نوع میں قوتِ حیات کا تموّج قوی اور شدید نہیں ہوتا وہ نوع خود کو قدرت کی خارجی طاقتوں سے بچانے کے طریقے اخذ نہیں کر سکتی اور ان کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ انسان کی نفسی جولانگاہ ماحول کو نت نئے طریقوں اور قوتوں سے بہم پہنچاتی ہے۔ جیسے سائنس کی ایجادیں مشین۔ ذرائع آمد و رفت اور جد و جہد کے مختلف نفسی اور ذہنی طریقے۔ تو پھر وہ نوع جو ایسی نفسی جولانگاہ سے محروم ہوتی ہے کہ ایسے ہی طریقے خود بھی معلوم کر سکے یا ان سے آگے بڑھ سکے وہ ان کا شکار بننا شروع ہو جاتی ہے۔ جیسے

آجکل کی دُنیا آلاتِ جنگ کا شکار ہو رہی ہے۔ کیونکہ وہ ان کے علاوہ آگے ترقی کرنے اور ماحول پر قابو کرنے کے طریقوں سے نابلد ہے۔

آپس میں نوع کا مقابلہ اس طرح ہوتا ہے کہ ایک شخص کا ذہن بندوق ایجاد کرتا ہے لیکن دوسرے کا ذہن اتنا اہل نہیں ہے اس کے پاس محض تلوار اور بھالا ہی ہے تو قدرتی طور پر وہ بندوق والے کے مقابلہ میں دب جائے گا۔ مشرق مغرب سے اسی طرح ارتقاء میں پیچھے رہ گیا تھا . . . . بھی کام کرتا ہے لیکن طبعی انتخاب بھی قوتِ حیات کی صلاحیت اور اہلیت سے الگ کوئی قطعاً خارجی اصول نہیں ہے۔ آج نفسی جولانگاہ اور قوتِ حیات کا تموج ہمارے ذہن اور اعضا کو زیادہ اہل اور قوی بنا رہے ہیں۔ اور ان کی نشو و ارتقا نفسی جولانگاہ اور قوتِ حیات کے تموج کی ہی مرہونِ منت ہے۔

حیاتیات اور موجودہ بحران کے اسباب

حیاتیات موجودہ بحران کے متعلق جو نقطۂ نظر قائم کرتے ہیں وہ زیادہ گہرا اور عملی حقائق سے نزدیک ہے۔ حیاتیات کے نزدیک یہ بحران اس لئے نہیں برپا ہے کہ انسان خدا سے دور ہو گیا ہے یا سرمایہ کی تقسیم غلط ہونے کی وجہ سے شدید حالتوں کا مقابلہ کرنا پڑا ہے بلکہ حیاتیاتی قوتیں ترتیب و تشکیل کے دور سے گزر رہی ہیں اور ایک نیا انسان ابھر رہا ہے۔ سرمایہ داری کی وجہ سے یہ بحران پیدا نہیں ہوا ہے بلکہ خود اس بحران کا نتیجہ سرمایہ داری ہے۔ اصل میں بحران تعمیری اور مثبت قوتوں کے فقدان کا نام ہے۔ بحران کو دُور کرنے کا طریقہ یہ نہیں کہ اس تخریبی فضا اور ان ہی طریقوں کی بنا پر ایک معتدل حالت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ بلکہ نئی حیاتیاتی قوتوں کو معلوم کیا جائے جو اس انتشار میں انضباط پیدا کر دیں۔ ہماری ترقی نے ایک مشینی ماحول قائم کیا۔ اسی مشینی ماحول نے بہت سے لوگوں کو بیکار کر دیا۔ یہ چیز نئی مصروفیتوں اور نئے مقاصد کی مقتضی بنکر سامنے آئی ہے۔ غلط تقسیم کے نتیجہ کے طور پر سامنے نہیں آئی زندگی کی ترقی کا اصول یہی ہے کہ اس خلا کو نئی قوتوں کے ذریعہ پُر کیا جائے نہ کہ اسے پیوند کرنے کی کوشش کی جائے یعنی بحران میں ہی تعمیری فضا پیدا کرنے کی سعی کو مقصد بنا لیا جائے۔

اصل میں سرمایہ داری اُن ذہنی قوتوں کے فقدان کی وجہ سے ہے جو نئے صنعتی نظام اور میکانی طریقوں پر قابو پا کر ایک موجودہ نظام سے بھی بلند سماجی نظام قائم کریں۔ اس طرح نوعِ انسان حیوانیت کے دور سے انسانیت کے دور میں ایک ارتقائی قدم بڑھا سکتی ہے۔ اور صحیح حیاتیاتی خاکوں کے ماتحت یہ بحرانی حالت جو چاروں طرف محیط ہے زیادہ مطمئن طور پر حل ہو جائے گی۔

ایک وقت تھا کہ ارتقائی قوتوں نے دُنیا میں نیا ماحول پیدا کیا۔ آج وہی ماحول صلاحیت و اصلح کے اصول پر نوعِ انسان پر حملہ کرنے لگا۔ اور نئی قوتوں اور نئے طریقوں کا اقتضا پیدا ہوا۔ آج آلاتِ حرب نوعِ انسان کو فنا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اَب نوعِ انسان اسی صورت میں خود کو زندہ رکھ سکتی ہے کہ ایسے طریقے معلوم ہوں اور ایسا نظام قائم ہو جو موجودہ ماحول اور آلاتِ حرب پر قابو پا سکے۔ یہ انتظام وہی نظام کر سکتا ہے جسے افعالِ انسانی پر پوری طرح قابو ہو اور انسان کا ارادہ و شعور اس کی گرفت سے گریز کر سکیں۔ اس کے لئے نئی ہیئت ذہنی کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر نوعِ انسان اور معاشرہ کی زندگی تباہی اور عذاب کے جنگل سے نجات نہیں پا سکتی۔ موجودہ سوشلزم کا نظریہ اس بلند ارتقاء کا حامل نہیں ہے۔ موجودہ سوشلزم کا فلسفہ حیاتیات سے عدم واقفیت پر مبنی ہے۔ بغیر تخلیقی قوتوں، صلاحیتوں کے اضافہ کے سرمایہ کی تقسیم بدلنے کی کوشش کے یہ معنی ہیں کہ انسان کو کسی بلند ارتقائی نظام یا ذہنی سطح کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صرف سرمایہ کی تقسیم بدلنے سے ہی مقصد پورا ہو سکتا ہے۔ اس طرح انسانیت کی توجہ ان نئی قوتوں۔ انکشافات اور راہوں سے ہٹ جاتی ہے جو اس کی سرزمین ذہن میں دبی ہوئی ہیں۔ سرمایہ کی تقسیم کو مقصد بنانا خود کو اس تخلیقی ذریعہ سے غافل رکھنا ہے جو انسانی سماج کو صحیح بنیادیں عطا کرنا یعنی خود شعوری ارتقاء کا حصول۔ اور اس طرح نوعِ انسان کی زندگی کا معیار اس معیار سے کہیں زیادہ بلند ہو سکتا ہے جس کا سوشلزم وعدہ کرتا ہے کیونکہ خود شعوری ارتقاء کے دور میں ہمارا ذہن آزادانہ ترقی کرے گا۔ آج کی طرح غلط تصوّرات اور مقاصد کا غلام نہ ہو گا بہت سے نقصانات مع جنگ کے دُنیا سے مٹ جائیں گے۔ اس بلند ارتقائی منزل کے بغیر اگر ہم مصنوعی تناسب یا خوشحالی پیدا کرنا چاہیں تو زندگی اتنی خوش آیند نہیں ہو سکے گی جتنی شعوری ارتقاء کے دور میں ہو سکتی ہے۔ لہذا اوّلیں مسئلہ انقلاب کے حیاتیاتی عمل کی تکمیل اور شعوری ارتقاء کا حصول ہے۔ موجودہ حالت میں سوشلزم قائم کرنا دُنیا کو عبوری حالت میں روک دینے کے مترادف

ہے۔ اور ہونے والا انقلاب کبھی روکا نہیں جا سکتا۔ میں پھر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ سرمایہ داری اصل مسئلہ نہیں ہے بلکہ عبوری مسئلہ ہے جو صحیح حیاتیاتی نظام قائم ہونے پر باقی نہیں رہیگا۔ غلط تقسیم تباہی اور جمود اور نوع انسان کے مصائب کی ذمہ دار نہیں بلکہ جمود کے قائم رہنے اور بلند ارتقائے حاصل نہ ہو سکنے کا نتیجہ سرمایہ داری ہے۔ انسان کو ایک ایسا نظام قائم کرنا ہے جو ذہن کے جدید شعور و ارتقا پر مبنی ہو۔

آج مشین ایک قوت ہے۔ مزدور کو اس سے بڑھ کر ایسی تخلیقی اور انکشافاتی قوتیں پیدا کرنی چاہئیں جن کی وجہ سے وہ اپنے وجود کو معاشرہ کے لئے زیادہ سودمند ثابت کر سکے۔ اگر وہ زندگی میں ارتقائی قدم اُٹھائے بغیر ماحول سے چمٹنا چاہے گا تو وہ سماج پر ایک مردہ بوجھ ہوگا اور یہ عمل ارتقا کے سراسر خلاف ہوگا۔ آج ماحول میں صحیح نظم پیدا کرتے اور زندگی کو خوش حال بنانے کے لئے نئی حیاتیاتی قوتوں کی ضرورت ہے جن سے کام لیکر رجعت پسند رکاوٹوں کو دور کیا جا سکے۔ ہمارا ذہن اتنا بلند نہیں ہے جتنا ماحول کا تقاضا ہے۔ اور ہمیں اس خامی کو دور کرنا ہے آج ماحول کے تقاضوں اور زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے انسان میں نئے حواس، اور نئی ذہنی صلاحیت پیدا ہو رہی ہے۔

موجودہ بحران ایسے بلند حیاتیاتی اور شوشل طریقوں اور ذہنی ترقیوں کی عدم موجودگی کا نتیجہ ہے جو اس میکانی ماحول کی ضرورت کو پورا کر سکیں۔ حیاتیاتی عمل ہمیں اس طرف لیجا رہا ہے، ہمارا کام ایک بلند فطری اور طبعی نظام حاصل کرنا ہے جس میں سرمایہ داری اور دیگر مسائل کا حل زیادہ مطمئن کن اور حیاتیاتی سائنٹفک حقائق کی بنا پر موجود ہو۔ موجودہ تخریبی قوتوں کو ہی تعمیری نہیں بنایا جا سکتا بلکہ ان سے بلند تعمیری قوتوں کی ضرورت ہے۔

تعمیر

انسان کا عمل اور حرکت تحت الشعوری ذہن پر منحصر ہے آج ہماری زندگی میں تحت الشعور ترقی کرتے کرتے بہت بلند درجہ پر کارفرما ہے لیکن ہم سوچتے اور کام کرتے وقت پرانے اور انتہائی کم درجہ کے شعور سے کام لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا شعور ہمارے عمل اور موجودہ ماحول پر قابو پانے سے عاجز رہتا ہے کیونکہ تحت الشعور بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ ہمارا عمل تحت الشعور کا نتیجہ ہے تحت الشعور کے آگے بڑھنے کی وجہ سے ہماری عملی قوتیں بہت آگے بڑھ چکی ہیں جو موجودہ تعمیر کو گرا رہی ہیں۔ ہمارا تحت الشعور اتنے بلند درجہ پر کام کر رہا ہے کہ پہلا شعور نہ اس پر قابو پا سکتا ہے نہ سمجھ سکتا ہے کیونکہ شعور کی جد و جہد خیال پر مبنی ہوتی ہے اور عمل اور تعمیر تحت الشعوری احساسات پر۔ اکثر مفکر آئندہ زمانہ اور دُنیا کا اندازہ لگاتے وقت پُرانے شعور کے خیال سے کام لیتے ہیں۔ اس لئے دُنیا کو ان پر یہ اعتراض کرنے کا موقعہ ملتا ہے کہ یہ تعمیر سب خیالی ہے اور ابھی عمل کی دُنیا سے دور ہے لیکن ان اوراق میں بیان کردہ مسائل کی بنیاد تحت الشعور پر قائم ہے اور تحت الشعوری احساسات کے عمل کا اندازہ پُرانا شعور اپنے درجہ کے مطابق کرتا ہے۔ اس لئے مسئلہ اُلٹ کر یہ ہو جاتا ہے کہ اعتراض کرنے والوں کی بنیاد خیال پر اور ان مسائل کی بنیاد بلند اور حقیقی تحت الشعوری عمل پر ہے جس کا اندازہ پُرانے شعور کی رکاوٹوں کی وجہ سے نہیں ہو رہا ہے

آج تحت الشعوری ارتقا کا خاکہ تبدیلی کی طرف مائل ہے۔ اور کل تحت الشعور شعور کا درجہ حاصل کرنے والا ہے پہلے ہمارا شعور تحت الشعور کا صرف نامکمل جزو تھا۔ اب شعور اور تحت الشعور دونوں ایک سطح پر آنے والے ہیں۔ اس طرح ارتقا کا مرکز قائم ہو جائیگا اور آنے والا ارتقا شعوری ارتقا ہوگا۔ یعنی آج تک کا ارتقا غیر شعوری تھا۔ آئندہ ہماری زندگی کو عبوری دور اور جمود سے واسطہ نہیں پڑیگا انسانی ترقی ایک " لامتناہی اور حقیقی صبح " کی گود میں بیدار ہو گی۔

یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ تمام سائنس کا تعلق تحت الشعور سے ہے اور تمام سائنس کے انکشافات تحت الشعور سے کروٹیں لیکر اٹھتے ہیں۔ جن کو ماحول اور حواس کے ذریعہ پرکھنے سے درست پایا جاتا ہے۔ حواس اور تجربات کا کام پرکھنا اور تصدیق کرنا ہے۔ تمام اصول اور نظریات تحت الشعور کے منت کش ہیں۔

اسی طرح تمام کلچرل ترقی تحت الشعور سے ہی ہوتی ہے روحانی اقتدار (روحانی سے مراد کلیسائی یا مذہبی اقتدار نہیں ہے) کا تعلق بھی تحت الشعور کے لطیف ترین عنصر سے ہے۔ اس کے علاوہ اس بات میں ذرہ بھر شک نہیں ہے کہ اصل میں عملی قوت اور طاقت بھی تحت الشعور کے علاوہ کہیں اور نہیں۔

جب انسانیت ایک ایسے مقام پر آجائے گی جہاں دماغ کا تحت الشعوری حصہ ارتقا کے ذریعہ شعور کا درجہ حاصل کر لیگا اس

وقت تحت الشعور کے تمام پوشیدہ خزانے۔ بہترین کلچر، صحیح اور مکمل سائنس۔ صحیح روحانی اقدار۔ انسانیت کی آغوش میں آکر نوعِ انسان کو مالا مال کردیں گی۔ اور خیالی نہیں بلکہ تمام عملی قوتیں انسان کے ساتھ ہوں گی۔ اس طرح انسان کی امیری عملی پشت پناہی سے وابستہ ہوگی۔ یہ ایک واضح حقیقت ہوگی۔ کوئی خواب اور خیال کی دُنیا نہیں۔

انسان فطری طور پر انتہائی سائنٹفک۔ انتہائی مقدس انتہائی افادہ طلب۔ اور انتہائی عملی ہے۔

جب تحت الشعور اور شعور ایک سطح پر آجائیں گے تو انسانیت کے حیوانی دور کے بجائے صحیح انسانی دور شروع ہو جائے گا۔ انسان کی فطرت جذبات و احساسات کی پیچیدگیوں اور نظام سے بنی ہے۔ نئے دور میں اس نفسی و جسمانی نظام میں ایک مکمل تبدیلی رُونما ہوگی۔ انسان کی کیفیت ہی دوسری ہو جائے گی۔ تحت الشعور کے لطیف ترین عنصر کے ارتقا کی وجہ سے دماغی قوت میں اضافہ ہوگا اور چونکہ دماغ کے ساتھ تمام رگوں کا بھی تعلق ہے اس لئے انسان کی صحت بھی موجودہ صحت سے بہتر ہو جائے گی۔ انسانی اعضائے تناسل کا تعلق بھی دماغ سے ہے اس لئے دماغی ترقی اور نفسی ترقی کی وجہ سے انسان کی جنسی طاقتوں میں بھی ترقی ہوگی۔ نسل انسانی کو بہترین حظ حاصل ہوگا۔ مرد اور عورت کے تعلقات زیادہ خوشگوار ہو جائیں گے۔ عورتوں کی اوباشی دُنیا سے مٹ جائے گی۔ انسان کا عمل تحت الشعوری ارتقار کے ماتحت ہونے کی وجہ سے شعوری گرفت سے آزاد رہا ہے اور نامکمل شعور اپنی صلاحیت کے مطابق کام کرنا چاہتا ہے۔ تحت الشعوری طاقت دوسری نوعیت سے کارفرما ہوتی ہے۔ اس لئے قدرت انسان کو ہمیشہ اپنے خلاف چلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ عبوری دور میں تو مکمل طور پر قدرت انسان کو اپنے خلاف ہی نظر آتی ہے۔ لیکن تحت الشعور کے تمام حصّوں کے شعور میں آجانے کی وجہ سے انسان کا خیال اندھیرے میں نہیں رہیگا وہ اپنے عمل کو سمجھ سکے گا۔ اس طرح تمام چیزیں اور واقعات حتیٰ کہ ہوا تک بھی انسان کے موافق چلے گی۔ کیونکہ انسانی مشینری کائنات اور دُنیا میں اس طرح فٹ ہے کہ قوانین کے مطابق صحیح نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ انسان کی زندگی سے اسرار بالکل مٹ جائیں گے کیونکہ اسرار شعور کے اندھیرے میں رہنے اور عدم تکمیل کا نتیجہ ہیں۔ تحت الشعور اور شعور کے ایک سطح پر آجانے کے بعد اسرار کا وجود ختم ہو ہی جانا چاہئے۔

غرض انسانی زندگی بلندترین نعمتوں سے لبریز۔ انسانیت پر مبنی۔ اور جہل قوتوں سے محفوظ۔ عبوری دور اور خطرات سے پاک زیادہ صحت مند اور عورت مرد کے تعلقات کے لحاظ سے زیادہ پائیدار ہوگی۔

خدا کا تعلق تحت الشعور کے لطیف ترین عنصر سے ہے جس میں ارتقا ہوتا رہتا ہے اور جس کے ماتحت عمل بھی ہوتا ہے اس لطیف ترین تحت الشعوری عنصر کا شعور خدا کا عرفان ہے اس طرح خدا ایک اعتقاد نہیں بلکہ ایک ادراک۔ ایک قوت اور ایک عملی حیثیت اختیار کرلیتا ہے مشرق کا خدا تخیلی ماورا اور بیکار ہے لیکن آئندہ دُنیا میں انسان خدا کی تمیز کا شرف حاصل کر سکے گا۔

19 "اہنسا" کا فلسفہ ایک اپیل اور مضحکہ انگیز چیز ہے جو عملی حیوانی قوتوں پر کنٹرول نہیں کرسکتا۔ حیوانی قوتیں اپنا کام کرتی رہتی ہیں۔ لیکن آئندہ دُنیا میں تحت الشعور کی عملی قوت جنگ کو ختم کردے گی کیونکہ حیوانی ارتقا اور عبوری دور ختم ہو چکے ہوں گے اور انسانی ارتقا خود شعوری حیثیت اختیار کرلیگا۔

احساسات ہی ہمیں پرورش دیتے اور متحرک رکھتے ہیں۔ مگر خود ترقی کر جاتے ہیں اور ماحول کو سکونیاتی و جامد چھوڑ جاتے ہیں اس کے بعد ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ ان ماحولات کو ہمارے احساسات۔ جذبات اور خواہشات کا کوئی پاس ہی نہیں ہے یہی حال ہمارے آج کے احساسات و جذبات کا ہے جو اس جامد سکونیاتی نظام میں اپنے لئے کوئی جگہ نہیں پاتے یعنی ایک بلند نظام ہی میں ہماری آرزوؤں اور ماحول کا رشتہ قائم ہو سکتا ہے۔ اس طرح انسانی سوسائٹی پنپ سکتی ہے اور شیرازہ بند ہو سکتی ہے۔

اکرام قمر، ایم، اے

رُوسو کا نظریۂ مشیّتِ عامّہ

یورپ میں ازمنۂ وسطیٰ میں سلطنت اور کلیسا کا نزاع اہمیّت اختیار کر گیا تھا۔ سلطنت کے حامی بادشاہ کو اور کلیسا کے مؤیّد اسقف اعظم کو کلّی اختیارات تفویض کر رہے تھے، اور ایک کو دوسرے پر فوقیت دے رہے تھے۔

اصلاح مذہب (ریفارمیشن) کی تحریک نے دین اور دُنیا کو الگ الگ کر دیا۔ ریاست اور مذہب دو علیحدہ علیحدہ ادارے قرار دئے گئے۔ اب ملوکیت پرستوں نے ایک اور طرح ڈالی۔ اور بادشاہ کو خُدا کا خلیفہ قرار دیکر اس کی اطاعت لازمی کر دی، ریاست کو خدا کی بنائی ہوئی کہا اور بادشاہ کو خدا کا نمائندہ ٹھیرایا لیکن تمام ملوکیت پسند اشخاص بادشاہ کے نائب خدا ہونے کے نظریّہ کو مکمل طور پر اپنا نہ سکے۔ ان میں طامس ہوبز (۱۵۸۸ء—۱۶۷۹ء) کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ لیکن وہ ریاست کی حاکمیت کا زبردست حامی، قانون موضوعہ کی قطعیت کا زبردست مؤیّد، اور رعایا کے حق بغاوت کا زبردست مخالف تھا چنانچہ اس نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "عفریت" (لیوائتھن) میں ریاستی حاکمیّت کے نظریہ پر زور دیا ہے۔ اس کے نزدیک ریاست کی بُنیاد ایک نا قابلِ تنسیخ معاہدۂ عمرانی پر ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ دورِ جاہلیت کے انسان اکٹھے ہو کر ایک ریاست بناتے ہیں۔ اس ریاست اور ریاست کے فرمانروا کی اطاعت لازمی اور غیر مشروط ہے اور فرمانروا کلّی اختیارات کا مالک ہے۔ جان لوک (۱۶۳۲ء—۱۷۰۴ء) نے اس کے نظریّات میں چند ترامیم پیش کر کے انھیں عملی سیاست کے موافق بنانے کی کوشش کی۔

جان لوک ۱۶۸۸ء کے انقلاب انگلستان کا مؤید تھا۔ اس نے مشروط بادشاہت کا نظریّہ پیش کیا۔ موثر پیرایہ میں ہوبز کے نظریّہ میں اعتدال پیدا کیا اور حاکمیت کی سختیوں کو کم کیا۔ اس کا خیال ہے کہ ریاست کی حقیقی بنیاد دورِ جاہلیت کے افراد کے درمیان معاہدۂ عمرانی پر ہے اور اس معاہدہ کے بعد ایک قابل تنسیخ حکومتی معاہدہ ہوا ہے جس میں ایک فریق تو تمام قوم کی ہیئتِ اجتماعی ہے اور دوسرا فریق وہ فرمانروا ہے جسے قوم اپنا سردار چنتی ہے۔ لوک کہتا ہے کہ قوم اپنے تمام قدرتی حقوق اپنی بنا کردہ حکومت کے سپرد نہیں کرتی بلکہ صرف وہ حقوق اس کے سپرد کرتی ہے جو قومی وجود کے لئے لازمی ہیں اور ریاست کا مقصد وحید فرد کے بقیہ قدرتی حقوق بالخصوص زندگی، آزادی اور ملکیت کے قدرتی حقوق کا تحفظ ہے۔

لوک کی تعلیمات کے زیر اثر روسو (۱۷۱۲ء—۱۷۷۸ء) معاشری و سیاسی انقلاب کے خواب دیکھنے لگا۔ اس نے شخصی آزادی کا جذبہ لوک سے بھی زیادہ ظاہر کیا۔ ریاستی حاکمیت اور آزادیٔ رعایا کو کس طرح اکٹھا کیا جا سکتا ہے؟ یہ وہ مسئلہ ہے جسے حل کرنے کی روسو نے کوشش کی ہے۔ وہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے یہ تصوّر کرتا ہے کہ دورِ جاہلیت کی آزادی کے مالک انسان رضا کارانہ طور پر ایک معاہدہ کرتے ہیں جس سے خود بخود ایک قوم وجود میں آ جاتی ہے جس میں فرد جو قوم کا ایک جزو ہے قوم کے بالکل مترادف ہے اور فرد کی شخصی رائے اور قوم کی مشیّتِ عامہ (GENERAL WILL.) میں کوئی اختلاف و تضاد نہیں۔

روسو کے مشیّت عامہ کے نظریہ کو علم سیاست میں ایک اہم جگہ حاصل ہے۔ سادہ الفاظ میں مشیت عامّہ کا مطلب قوم کی رائے ہے بشرطیکہ اس میں سب کا فائدہ ہو۔ اس نظریّہ کا مدعا و منشا حاکمیت کا جواز، اور ریاست اور شخصی آزادی کے درمیان ربط پیدا کرنا ہے۔

روسو کہتا ہے کہ ہر کوئی مشیت عامہ کی اطاعت کلّی کر کے اپنی ہی رائے کی اطاعت کرتا ہے اور ظلم و استبداد سے اپنے آپ کو بچاتا ہے کیونکہ کوئی بھی یہ نہیں چاہتا کہ سماجی شرائط کڑی ہوں اور مشیت عامّہ کے ذریعہ انسان ہیئت اجتماعی کی اطاعت کرتا ہے، کسی فرد کی نہیں۔ جو حقوق وہ دوسرے کو دیتا ہے وہی وہ دوسرے سے حاصل بھی کر لیتا ہے، اس طرح کوئی شخص گھاٹے میں نہیں رہتا۔ جو کچھ وہ دیتا ہے وہ اُسے مل بھی جاتا ہے، جو کچھ وہ کھوتا ہے، وہ پا لیتا ہے۔ اور اپنی ملکیتوں کے

تا کہ اُسے زیادہ قوت حاصل ہوجاتی ہے۔

چونکہ سماج کی ہیئت حاکمہ کی تشکیل میں ہر فرد کی رائے کو دخل حاصل ہے اس لئے سماج کے فیصلوں کی مخالفت فرد کی طرف سے خود اپنی مخالفت ہے۔ لیکن آزادی کا مطلب یہ ہے کہ ہر فرد کو اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کی آزادی ہو۔ مگر مشیت عامہ کے نظریہ کی رو سے باغی خود اپنے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ روسو کا خیال ہے کہ ایسے مواقع پر آزادی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ فرد اپنی اس رائے کی متابعت کرے جس میں مفاد عامہ مضمر ہو۔ سماج کے قیام کا مقصد فرد کی بہبود ہے اور فرد نے سماج کے قیام میں حصہ لیا ہے اس لئے جب فرد اپنی اس رائے کی پیروی کرتا ہے جو سماجی احکام میں شامل ہے تو درحقیقت وہ کسی کی تابعداری نہیں کرتا بلکہ آزاد ہوتا ہے۔ روسو اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ اگر ایک شخص سماج کی مشیت عامہ کی تعمیل سے انکار کرے تو اسے اس تعمیل پر مجبور کر دینا چاہئے۔ بالفاظ دیگر اسے جبراً آزادی دیجائے۔

روسو مشیتِ عامہ کے متعلق مندرجۂ ذیل خیالات کا اظہار کرتا ہے:۔

"اوّل۔ چونکہ مشیتِ عامہ مشترکہ مفاد کے لئے ہوتی ہے۔ اور اس کا تعلق کسی گروہ یا طبقہ کے مفاد سے نہیں ہوتا اس لئے یہ ہمیشہ راستی پر اور ہمیشہ غیر جانبدار ہوا کرتی ہے۔ اس کا مآخذ سماج کے تمام افراد ہیں اور یہ سب پر عائد ہوتی ہے۔ مشیت جتنی عام ہوگی اتنی ہی منصفانہ ہوگی۔ درحقیقت آوازِ خلق نقارۂ خدا ہوا کرتی ہے۔

دوم۔ ہر مسئلہ کا ایک پہلو بہبود عامہ سے زیادہ تعلق رکھتا ہے اور کسی گروہ یا فرد کے مفاد سے وابستہ نہیں ہوتا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ریاست کا کوئی بھی شخص مشیت عامہ کی اطاعت نہ کرے لیکن یہ امر مشیتِ عامہ کے عدم وجود پر دلالت نہیں کرتا۔ چنانچہ مشیت عامہ ہمیشہ مستقل، ناقابل تغیر اور خالص ہوتی ہے۔

سوم۔ مشیتِ عامہ اور تمام کی رائے کی میں نمایاں امتیاز ہے۔ خواہ تمام متفق ہی کیوں نہ ہوں۔ ان کی رائے خود غرضی اور ذاتی مقاصد پر مبنی ہوتی ہے، لیکن مشیت عامہ کی بُنیاد مُشترکہ مفاد پر ہوتی ہے۔

چہارم۔ مشیتِ عامہ کا اظہار سماج کی رائے کی صورت میں ہوتا ہے۔ روسو کہتا ہے کہ ریاست ایک اخلاقی وجود اور ایک ایسی مشیت رکھتی ہے جو ہمیشہ ہر جزو و کل کے مفاد و بقا پر مبنی ہوتی ہے اسی مشیت پر قانون کی بُنیاد ہے اور یہی مشیت حق و انصاف کا معیار ہے"۔

روسو کے ان خیالات کے سرسری مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس کے نزدیک فرد اور ریاست علیحدہ علیحدہ شخصیتیں ہیں، قوم کا اپنا ضمیر ہوتا ہے، اور قوم مشیت عامہ کی حامل ہے سیاسی ادارہ قوانین کے ذریعہ مشیت عامہ کو عملی جامہ پہناتا ہے۔ چنانچہ قوانین آزادی عطا کرتے ہیں، کیونکہ یہ سب پر برابر عاید ہوتے ہیں اور مشترکہ مفاد کے لئے سب کی رضامندی پر استوار کئے جاتے ہیں۔

روسو یہ سوال کرتا ہے کہ اگر انسانی فطرت کی خودسری کے ماتحت فرد اپنی مخصوص رائے کا اظہار کرتا ہے جو مشیت عامہ سے برعکس یا مختلف ہے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ روسو کہتا ہے کہ اسے جبراً منایا جائے گا۔ مگر اس صورت میں فرد کی قدیم و غیر منفک آزادی کا کیا بنے گا؟ روسو کہتا ہے کہ اس طرح آزادی میں کسی قسم کی کمی نہیں آتی۔ روسو کا خیال ہے کہ بعض اوقات فرد صداقت کو نہیں جان سکتا اس لئے قومی مفاد کا یہ تقاضا ہے کہ اسے کسی خاص فعل کے لئے مجبور کیا جائے۔ چونکہ اس قسم کے افعال مشیت عامہ پر مبنی ہوتے ہیں اس لئے یہ لازمی ہے کہ اگر فرد کو حقیقت کا علم ہو تو وہ انہیں افعال کو از خود سرانجام دے۔ روسو کہتا ہے کہ انسان کی خودسری صرف یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ اپنی حقیقی رائے سے ناآشنا ہے۔ جبر اس کی حقیقی رائے کے مترادف ہے، قوم اس پر صرف اس لئے جبر کرتی ہے تاکہ اسے آزاد ہونے پر مجبور کر دے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کسی شخص کو آزاد ہونے پر مجبور کرنا اسے اطاعت گزاری پر مجبور کرنا ہے اس طرح سے روسو کا مندرجۂ بالا سوال لاینحل ہی رہ جاتا ہے۔

جب ہم روسو کے نظریۂ مشیت عامہ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں یہ چیز کھٹکتی ہے کہ یہ نظریہ روسو کے فلسفۂ خود غرضی سے ہم آہنگ نہیں۔ وہ انسان کو خود رائے اور خود غرض قرار دیتا ہے۔ اس لئے ہم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ یہی انسان اپنی خود غرضی کو کس طرح بالائے طاق رکھ کر مشترکہ مفاد کے لئے رضامند ہو سکتا ہے؟ چنانچہ ہم اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے مجبور ہیں کہ مشیت عامہ کا نظریہ خود روسو کے فلسفہ سے ٹکراتا ہے۔

مشیت عامہ کی سختی سے پابندی حکومتوں کے خلاف اکثر بغاوتوں پر منتج ہوگی۔ روسو ہمیں یہ غیر مبہم طور پر بتاتا ہے کہ اکثر حکومتوں کی بنیاد مشیت عامہ پر نہیں بلکہ مخصوص مفادات پر ہے، لیکن فرد پر مشیت عامہ کی اطاعت فرض ہے۔ اس لئے اسے اکثر علم بغاوت

بلند کرنا ہوگا۔ اس طرح اس امن و نظم کی جڑیں کھوکھلی ہو جائیں گی جو سیاسی ادارہ کے قیام کا مقصد تھے۔

مشیت عامہ کی تحقیق و دریافت نہیں ہو سکتی۔ یہ جاننا محال ہے کہ کون مشیت عامہ کا ترجمان ہے اور کون سی چیز مشیت عامہ کے مطابق ہے۔ متفقہ فیصلہ کسی فیصلہ کی اچھائی کا ثبوت نہیں۔ روسو کہتا ہے کہ اگر انسان یہ جان جائے کہ اس کا ہر فیصلہ دوسروں پر بھی اثر انداز ہوتا ہے تو ہر انسان مشترکہ بہبود کیلئے سوچنا شروع کر دے گا۔ ہر فرد یہ کہے گا کہ "میرے نزدیک فلاں فعل مشترکہ فلاح پر منتج ہوگا۔ اور میرا خیال ہے کہ دوسروں کی بھی یہی رائے ہے"۔

لیکن روسو کے اس سوال کے خلاف دو اعتراض ہیں:۔

(الف) اگر کوئی شخص کسی فعل کا قائل نہ ہو اور وہ اپنی رائے کا اظہار کرے، تو اس اظہار رائے کے لئے روسو کا نظریہ کوئی تحفظ پیش نہیں کرتا۔

(ب) تمام انسان شاذ و نادر ہی ایک سا سوچتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ دو مخلص اشخاص کی رائیں آپس میں بالکل متضاد ہوں۔

ان حالات میں کوئی خدا کا فرستادہ قانون ساز ہی مشیتِ
۲۲ عامہ کا ترجمان ہو سکتا ہے لیکن خدا کے اس فرستادہ کی بعثت کی کوئی اُمید نہیں۔ مجلس عامہ ہی مشیت عامہ کو ظاہر کر سکتی ہے۔ اس طرح روسو کا سر بفلک نظریہ جمہوریت محض ہو کر رہ جاتا ہے لیکن اب یہ سوال سامنے آجاتا ہے کہ اقلیت کیوں اکثریت کے فیصلوں کی پابندی کرے۔ روسو اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ اکثریت کو مشیت عامہ کی مظہر نہیں سمجھا جا سکتا۔ کیونکہ یہ ممکن ہے کہ اقلیت کی رائے مشترکہ بہبود کی حامل ہو۔ گویا کہ مشیت عامہ کی تلاش بالکل بے سود ثابت ہوتی ہے۔ حکومت کے پاس کوئی ایسا واضح ادارہ نہیں جو مشیتِ عامہ کو بیان کرے۔

اندریں حالات یہ امر ازحد حیران کن ہے کہ اس قسم کا اضداد سے لبریز نظریہ سیاسی فلسفہ میں اس قدر اہمیت اختیار کر گیا ہے اور اس کا علمبردار روسو ایسا مفکر اعظم ہے۔ روسو اس نظریہ کی حمایت میں جو کچھ کہتا ہے وہ اس کی اپنی مخصوص نفسیاتی حالت کا نتیجہ ہے اسے اپنے گناہوں کا احساس تھا اور وہ ان سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اپنی اخلاقی نجات کے لئے اس نے جو ذریعہ سوچا وہ نہ مذہب تھا اور نہ کلیسا۔ بلکہ اس نے سماج کی دنیوی طاقت کو نجات کا ذریعہ سمجھا۔ لوگوں میں مذہبیت کا جذبہ موجود ہے جس کا نتیجہ عقلیت ہے۔ عقلیت مشترکہ بہبود اور متحدہ انسانوں کا مطالبہ و تقاضا کرتی ہے۔ مشیت عامہ ذریعہ اتحاد بھی ہے اور سماج کی اخلاقی ہیئت حاکمہ بھی جو سماج کے ارکان کی اخلاقی نجات کی اہلیت رکھتی ہے کیونکہ سماج کی مشیت فرد کی بھی رضا ہے۔ اور فرد سماج کی اطاعت سے اپنی ہی اخلاقی مشیت کی پیروی کرتا ہے۔ اور نجات حاصل کر لیتا ہے۔

اس نظریہ میں بعض بنیادی سچائیاں بھی موجود ہیں، اور یہ انسان، سماج اور ہیئت حاکمہ کے متعلق بعض صحیح خیالات پیش کرتا ہے۔

یہ نظریہ ہیئت حاکمہ اور قانون کی اطاعت کا جواز پیش کرتا ہے۔ ریاست قانون کے ذریعہ لوگوں کی رائے کو پیش کرتی ہے۔ بالفاظ دیگر قانون "معقول مدنی الطبع قلب" (SOCIAL MIND RATIONAL) .... کا اظہار ہے۔ اس طرح یہ نظریہ قانون کی اطاعت کی ضرورت و جواز بتاتا ہے۔ قانون کے سامنے ہر شخص کو مساوی حیثیت حاصل ہے۔ فرد کو کسی قسم کی طبقاتی یا شخصی مراعات عطا نہیں کی جاتیں۔ ہر شخص قانون کی ایک سی اطاعت کرے گا۔ درحقیقت روسو کے جنون مساوات نے اس کے جنون آزادی کو تحریک دی ہے۔

یہ بالکل بجا ہے کہ ہر مسئلہ کا ایک پہلو راستی پر مبنی ہوا کرتا ہے۔ اس لئے اس پہلو کو سمجھنے اور عملی جامہ پہنانے کی کوشش لازمی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ایک مجلس عامہ میں طبقاتی مفادات آپس میں ٹکرا کر مشیت عامہ کے لئے راستہ صاف کر دینگے۔

روسو سے پہلے قوم کے ایجابی عمل کو تسلیم نہیں کیا جاتا تھا قوم کو آہستہ آہستہ اور غیر مرئی ترقی کرنے والی سمجھا جاتا تھا۔ قانون صرف قانون قدرت تھا۔ جو حالات کے مطابق ڈھال لیا جاتا تھا لیکن روسو یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ قوم مشیت عامہ کے ذریعہ ایجابی عمل کرتی ہے۔

المختصر، مشیت عامہ قائم و دائم ہے، ہم سب میں موجود ہے، ہمیشہ حق پہ ہوتی ہے اور اطاعت کی بنیاد ہے۔ لیکن کوئی ایسا واضح ادارہ موجود نہیں ہے جسے مشیت عامہ کا ترجمان سمجھا جا سکے۔

روسو نے بادشاہ کی بجائے قوم کو حاکمیت کا مالک قرار دیا۔ لیکن وہ قوم کے خلاف فرد کو کوئی تحفظ نہ دے سکا۔

اگرچہ روسو فرد اور قوم کے تعلق کے مسئلہ کو حل کرنے میں ناکام رہا ہے۔ مگر اپنی بحث و نظر کے دوران میں اس نے علمِ سیاسیات میں مستقل اور گرانقدر اضافہ کیا ہے۔

پروفیسر ہیرن شا اپنی کتاب "ارتقائے نظریاتِ سیاسی" کے باب "دورِ عقلیت" میں رقمطراز ہے:۔

"روسو کہتا ہے کہ سیاسی طاقت کی بنیاد عوام پر ہے مشترکہ مفاد حکومت کا اصلی مقصد ہے۔ اس کے نزدیک ریاست ایک عمرانی تنظیم ہے اور ایک تنظیم ہونے کی حیثیت سے اس میں قومی احساس بھی ہے اور مشیتِ عامہ کا وجود بھی۔ وہ اس جمہوری نظریہ کا حامی ہے کہ سیاسی فریضہ کا حقیقی معیار رضامندی ہے۔ وہ آزادی اور حاکمیت کے اتحا کو ممکن قرار دیتا ہے .... اس کے نظریاتِ انقلابِ فرانس میں ممد و معاون ثابت ہوئے ہیں۔ جس طرح مانٹسکیو نے بوربونز کے سیاسی استبداد کی جڑوں کو کھوکھلا کر کے رکھدیا تھا۔ اور والٹیئر نے رجعت پسند و بداطوار کلیسائے کال کی طاقت کو کمزور کر دیا تھا۔ ٹھیک اسی طرح روسو نے فرانس کے غیر منصفانہ معاشرتی نظام کی اخلاقی و ذہنی بنیادوں کو اکھیڑ کر رکھدیا۔

راحت سعید

قطعات

"خط کے جواب میں!"

تُو نہ مُجھے بُھلا سکی اِس کا خیال ہے مُجھے　　میں نے تجھے بُھلا دیا اس کا ملال کچھ نہیں
جب بھی تری تلاش تھی، اب بھی تری تلاش ہے　　عشق کی صبح و شام میں ماضی و حال کچھ نہیں!

"یاد"

شام سے کچھ دیر پہلے دامنِ کہسار میں　　سُن رہا تھا گوشِ دل سے نغمہ ہائے آبشار
اِس طرح آتی تھی تیری یاد رہ رہ کر مجھے　　جس طرح سوتے میں کوئی گدگدائے بار بار!

"ماضی و حال"

یک بیک اِک نرم جھونکے سے ہَوا کے اِس طرح　　ابر کے ٹکڑوں سے باہر آ گیا ہے ماہتاب
میری کیفِ شوق میں ڈوبی نگاہوں سے کبھی　　دفعتاً جیسے ہُوا تھا تجھ کو احساسِ شباب!

عرش تیموری

سنگھائے میل!

نوشادی شدہ چاند!

تاریک سایوں میں ـــــ اس طرح لرز رہا ہے جیسے کسی کے شدتِ جذبات میں ہونٹ! اور کوئی یہ سوچ رہا ہے کہ وہ نہ الم کا ہے نہ خوشی کا پرستار، ـــــ چٹکیری زندگی، دو رُخی زندگانی، یا پُرشور مگر بے سُری تہذیب اس کے لئے کوئی دلبستگی نہیں رکھتی۔ ہرچند کہ اسی گردِ دمیش میں گرفتار ہے لیکن یک رنگ زندگی، یک سو زندگانی یا حقیقی انسانی تہذیب کی جستجو اس کے دل کو پریشان بھی رکھتی ہے اور اسی دھن میں مست و سرشار بھی رہتا ہے۔

کوئی سوچتا ہے کہ جس ادیب کی نظر و فکر کی کاوشیں غرض و مقصد سے عاری ہوں وہ دو حال سے خالی نہیں، اگر مجنوں ہے تو مرفوع القلم ہے، اور اگر شاعر و ادیب ہے تو اسے کبھی کبھی اپنی ادبی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے رہنا چاہیئے! اپنی منزل کی مسافت کا اندازہ کرتے رہنا چاہیئے ـــ!

کسی کی ادبی زندگی کم سن سہی، کسی کے ادبی کاموں کا حجم چھوٹا سہی، دیکھنا تو یہ ہے کہ گزشتہ تین چار برس میں کسی نوعمر ادیب کی سرگرمیوں میں کوئی ارتقا بھی ہوا ہے یا نہیں؟

اس سے پہلے کہ کسی کی ادبی زندگی سے چند اقتباسات پیش کئے جائیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ادب کے بارے میں زاویۂ نظر بیان کر دیا جائے۔

اصلی ادب وہی ہے جو ایک شاہراہ کی مانند ہو۔ جس پر سے مختلف الحیثیت مخلوق معمولی حالات اور روزمرہ کے لباسوں میں بے تکلف گزر رہی ہو ـــــ ایسا ادب عبرت انگیز بھی ہوتا ہے اور جنوں خیز بھی!

باوجودیکہ یہاں نہ تو رسیلے جذبات کی موجیں ہوتی ہیں نہ چٹکیلے خیالات کے طوفان، بلکہ بالکل سادہ زندگی اور اصلی زندگانی کی سچی تصویریں! ـــــ تاہم ایسا ادب قوتِ تمیز کو اُبھارنے والی عبرت اور خلّاق عمل جنون پیدا کرتا ہے! ـــــ یہی عقل اور عشق مل کر شخصی تہذیب اور قومی تعمیر کے لئے بنیاد کا کام دیتے ہیں!۔

زندگی میں نہ کوئی رس ہے نہ مزا۔ نہ چٹک ہے نہ مہک، وہ تو ایک بے طوفان سمندر، ایک بے نشیب و فراز میدان ہے۔ البتہ زندگانی حرکت و سکون کا چھلکتا ہوا کٹورا ہے۔ اسے چاہے طوفان کہہ لیا جائے اور چاہے نشیب و فراز!۔

ادیب یا شاعر کی نظر زندگی پر ہوتی ہے اس کا ادب زندگی کی لازوال ہمیشگی سے بھرپور ہوتا ہے زندگانی کے طوفان یا نشیب و فراز تو پڑھنے والوں کو سوجھتے ہیں۔

اداکار کی دو شخصیتیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو درون پردہ ہوتی ہے دوسری وہ جو بیرون پردہ۔ ادیب و شاعر کی بھی ایسی ہی دو شخصیتیں ہوتی ہیں۔ ان دونوں شخصیتوں میں اُلجھ کر ادیب گیٹے کے کردار "فاوسٹ" کی طرح مسلسل کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور اس کی زندگی ایک ادا بن کر رہ جاتی ہے۔

کسی کی رائے میں ادیب و شاعر کو چاہیئے کہ وہ اپنی دونوں شخصیتوں کو ایک دوسری میں سمو دے اور اس طرح اپنے میں ایک تیسری شخصیت پیدا کرے جو متذکرہ صدر دونوں شخصیتوں سے بالاتر ہو۔ جو ان کی نگرانی بھی کرے اور نگہبانی بھی۔ یہی وہ تیسری شخصیت ہے جو ادیب و شاعر کو پیغمبرانہ اوصاف سے قریب کر دیتی ہے۔

کسی کے خیال میں ادیب و شاعر اپنے اصولِ نظر و فکر کو ایک چوک کے رُخ کھلتا ہوا دریچہ بنائے اور جو کچھ اس دریچہ میں سے دیکھے ہوبہو الفاظ و عبارات کا جامہ پہنا کر سلیقہ کے ساتھ پیش کر دے!

اگر کہیں ضرورتاً ع گفتہ آید در حدیث دیگراں

بھی واقع ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔ پیش کرنے کا سلیقہ، خیالات کی ترتیب، بیان کی دلنشینی، ادیب و شاعر کی موجودہ قابلیت پر منحصر ہے

ور یہی قابلیت ادب کو سحر و اعجاز کا مرتبہ بخشتی ہے۔

ادیب و شاعر کو چاہئے کہ تیر سے زیادہ ہدف کو اہمیت دے ور یہی جذبہ اس کے آرٹ کی ایک کشش سے نمایاں ہونا چاہئے۔

انسان کو آدمی سے مفر نہیں اور آدمی کو انسان کے بغیر چارہ نہیں، بالکل اسی طرح جیسے جسم کو سایہ سے گریز نہیں اور سایہ کو جسم کے بغیر وجود نہیں۔ لیکن عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ جسم اور سایہ کو الگ الگ دو مستقل ہستیاں قرار دیا جاتا ہے۔ یہ غیریت و دوئی کا نظریہ ہے اس سے آرٹ تباہ اور مختلف ہنگاموں میں گم ہو جاتا ہے۔

آجکل کے شعر و ادب میں کوئی نیا زاویۂ نظر نہیں پیدا کیا جا رہا ہے، انہی پرانے طریقہ ہائے نظر و فکر کی تشریح و توضیح کی جا رہی ہے اور سب سے زیادہ تنقید کے نام سے تمدید و تقبیح پر ہر ادیب قلم برداشتہ لکھتا جا رہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ادب و شعر نوح کی طرح قواعد کر رہا ہے — یعنی موجودہ شعر و ادب نہ کوئی قدم حکم (مقررہ قواعد و ضوابط) کے خلاف اٹھا سکتا ہے نہ رکھ سکتا ہے۔

مختصراً ادیب کو نہ تو "ادب برائے ادب" کے اصول پر کاربند ہونا چاہئے اور نہ "ادب برائے مقصد" کے اصول کا معتقد! یعنی نہ پروانہ کی طرح شعر و ادب میں فنا اور نہ بلبل کی طرح شعر و ادب کا وکیل یا دلال!

لہذا کوئی چاہتا ہے کہ ایک ادبی نمائش گاہ کھولے اور اپنی اپنی پسند کے نوادر انتخاب کرنے کی دعوت دے۔

نمائش گاہ تو بہت وقت، انتظام اور اہتمام چاہتی ہے بالفعل مشق و ربط (ریہرسل) کے طور پر چند نمونے پیش کئے جائیں۔

اقتباسات

حسن و شباب:۔ "ہر عطر ایک خوشبودار تیل یا عرق پر کشید کیا جاتا ہے جسے زمین کہتے ہیں۔ حسن کی زمین بھی شباب ہے۔ جس طرح اچھا عطر اپنی زمین پر غالب رہتا ہے اسی طرح حسن کامل بھی اپنے آگے شباب کو نمایاں نہیں ہونے دیتا۔"

حسن کے قوی مظاہر:۔ "بعض حسن نظر فریب ہوتے ہیں بعض سامعہ نواز۔ حسن نظر فریب ہوش و حواس کے پرخچے اڑا دیتا ہے اس لئے اس کا منکر ناپید ہے، لیکن حسن سامعہ نواز ایک طویل داستان ہے جس کا آغاز ازل سے ہوا اور انجام ابد پر ہوگا۔ یہ داستان سوتوں کو گدگدا کر جگاتی اور جاگتوں کو تھپک تھپک کر سلاتی ہے۔ عالم امکان میں حسن سامعہ نواز کے منکر بہت ہیں لیکن انکار خود اس کے ہونے کی دلیل ہے۔"

حسن سے ہستی کی شناخت:۔ "ہستی کی تعریف فلسفی کے پاس کچھ نہیں۔ وہ اس کو حیات۔ علم اور ارادے کی دلیل سے پہچانتا ہے درانحالیکہ حیات۔ علم اور ارادے سے بھی ویسی ہی ناواقف ہے۔

اسی طرح فلسفی اور اس کی ذریات ایک مجہول سے دوسرے مجہول کا قیاس کر لیتے ہیں۔ لیکن ادیب یا شاعر ہستی کو حسن سے پہچانتا ہے۔ وہ صریحاً دیکھتا ہے کہ حسن فریبندہ نے عقل کے قدم ڈگمگا دئے اور جنوں کا بول بالا کر دیا۔"

بت پرست حسن پرست ہے اور خدا پرست عین حسن ہے:

"تمام کائنات خدا پرست ہے۔ ایک آدم ہی بت پرست ہے کہ اس نے انواع و اقسام حسن کی پرستش کی دھن میں کروڑوں بت بنا ڈالے لاکھوں صنم خانے تعمیر کر دئے، پھر بھی جی نہ بھرا تو مسجدوں میں غیر مرئی حسن کی پرستش پر کمر بستہ ہو گیا۔ یہاں سے بھی جی اکتا گیا تو خانقاہوں کے تاریک گوشوں میں دل کی گرمی کو پھونک پھونک کر روشن کیا اور اسی کو حسن کا مظہر بنا کر پوجا پاٹ کرنے لگا۔"

دل اور حسن:۔ "دل حسن کا آئینہ اور حسن تمام دلوں کا آئینہ خانہ ہے۔ لہذا عالم دل اور عالم حسن دو آئینہ خانے ایک دوسرے کے مقابل ہیں ؎

دریائے فراواں خود اک آئینہ خانہ ہے
ہر قطرے کو اپنے میں دریا نظر آتا ہے

حسن سیرت

آدمی:۔ "وہ گوشت کا لوتھڑا جو آدمی کی صورت لیکر دنیا میں آتا ہے مدت دراز تک اعلیٰ صفات انسانی سے محروم رہتا ہے۔ رفتہ رفتہ سیرت کی تخلیق ہوتی ہے اور کوئی چابکدست نقاش اس مرقع کی قلمکاری میں ہمہ تن منہمک رہتا ہے۔

آفات ارضی و سماوی کے علاوہ ذاتی خواہشوں اور ترغیبوں کے فوارے اس مرقع کو تر دامن کرتے رہتے ہیں اور گرد و پیش کے شیاطین الانس والجن اس کے خد و خال کو بگاڑنے کی تاک میں لگے رہتے ہیں لیکن وہی نقاش مینا کی طرح اپنی کمین گاہ سے مرقع پر ٹکٹکی لگائے سیرت کی بہتر سے بہتر تجویز اور دلکش سے دلکش تشکیل میں مصروف رہتا ہے۔"

صورت و سیرت: "حسن سیرت وہ خوش رنگ ٹھنڈی روشنی ہے جو صورت کے فانوس سے پھوٹ پھوٹ کر باہر آتی ہے اور دور دور تک فضاؤں کو منور کر دیتی ہے۔"

حسن سیرت کا تفوق: "حسن سیرت بدصورتی کے تمام عیوب کو چھپا لیتا ہے۔ وہی بھدے سے ناک نقشے حسن سیرت کی چمک دمک سے لقا رنگیوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتے ہیں۔"

آدم زاد اور دوام زندگی: "آدم زاد دوام زندگی کے لئے ہمیشہ سے ماہئ بے آب کی طرح بے تاب ہے لیکن جن کی خواہشوں میں لذت کی طلب غالب ہوتی ہے وہ غارت کر دی جاتی ہیں غارتگر بھی آدمی ہی ہوتے ہیں لیکن ان کے ہاتھ خدا کے ہاتھ اور ان کے دل و دماغ بے دردی یا ہمدردی کی بجائے عدل و انصاف کے تقاضوں سے بھرپور ہوتے ہیں ــــ اور جن کی خواہشوں میں قوت و ادب غالب ہوتا ہے ان کے جسم بھی ڈوبتے ہیں مگر لطیف روحیں مرغابی کی طرح دنیا کے سمندر سے خشک نکلتی اور دوام زندگی کی مالک ہو جاتی ہیں۔"

زوال پذیر قومیں: "سنتے آئے ہیں کہ زوال پذیر قوموں میں سیرتیں مسخ ہو جاتی ہیں۔ اب سوچنا یہ ہے کہ ہمیں اپنی سیرتوں میں حسن پیدا کرنے کیلئے کیسی تربیت درکار ہے۔ کیونکہ ہمارا تقاضائے فطری زندگی دوام کا طالب ہے۔" (اقتباس۔ مضمون "حسن")

گفتگو سے دل کی شناخت: "باتیں بھی دل کا دھواں ہوتی ہیں ــــ کسی دل میں عود دان روشن ہے اور کسی میں دہکتا ہوا گیم ــــ دھنواں دھنواں ایک مگر اثر و کیفیت میں فرق ہے! ــــ ابھی ہندوستان سونگھنے کی قوت سے محروم ہے! ــــ خیر وقت آئے گا۔" (خیال آفریں دماغ)

گمراہ دل: "گمراہ دل غبی بچے کی طرح دماغ کا آموختہ یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر ناکامی (غافلانہ عادتیں) رلائے دیتی ہیں۔" (تجزیاتی تمثیل ــــ "بستر کی گداز باہنوں میں")

احساس اور شاعر: "ہر چیز کا تعلق احساسات سے ہے کسی ویران قبرستان میں گراموفون بجائیے تو آپ کو لطف نہ آئیگا اور اگر وہی گراموفون کسی رسیلی چاندنی رات میں جھیل ڈل میں چلتی ہوئی کشتی پر بجائیے تو آپ بے خود ہو جائیں گے ــــ یہی حال شاعروں کا ہے کہ بہاران میں حسن کا احساس پیدا کر دیتی ہے۔ اس لئے خزاں کی کوئل کا نغمہ شاعروں کے نزدیک نغمہ نہیں۔ ان کیلئے تو بہار کی کوئل کی اور بہار کا نغمہ نغمہ ہے۔" (ٹیگور کے ساتھ دو سال ــــ رسالہ ایشیا)

علم بیماری ہے: "دوست عزیز! علم و فضل کی طرف مطلق توجہ نہ دو۔ اس لئے کہ علم بیماریاں پیدا کر رہا ہے۔ دماغی بھی اور قلبی و روحانی بھی۔ لوگ جتنے ذی علم ہیں اتنے ہی زیادہ بیمار۔" (خیال آفریں)

زندگی حماقت آفریں ہے: "زندگی کے متعلق کیا پوچھتے ہو! ــــ عمر کے مسافر کے گمراہانہ نقوش پا کے تسلسل سے ایک پگڈنڈی سی بن رہی ہے جس میں ہر قدم پر حماقتوں کی تجدید ہو رہتی ہے۔" (خیال آفریں دماغ)

خدا کا بت: "یہ حمد! ــــ یہ کیا ہے؟ سراسر توہین! انسان نے الفاظ کا بت تیار کیا۔ اور لوگوں نے اس لفظی بت کی پرستش شروع کر دی، بعینہ اسی طرح جیسے کہ سامری نے سونے کا بچھڑا بنا ڈالا اور قوم بنی اسرائیل سربسجود ہو گئی!

ڈنلپ موٹر ٹائر کمپنی کے مالک کو خوب سوجھی کہ اس نے اپنے کارخانہ کے اشتہار میں ایک آدمی کی تصویر پر ٹائر ہی ٹائر پینٹ کرا دئیے ــــ ہاتھوں اور پیٹ کے ہلکے آدمی نے خدا کے تصور کو لفظوں کے اس قدر لباس پہنائے کہ کثرت لباس اصل تصور کا مزار بن گئی۔ اور یہ اندھی مخلوق اسی مزار یا تصور یا لفظی بت کے آگے سربسجود ہے۔"

انقلابی علمبردار اور ہندوستان: "انقلاب کے علمبردار! ــــ یہ انقلاب کے علمبردار ادیب جو خیالات کے گھوڑے دوڑاتے ہیں میں ان سے خوب واقف ہوں! ...... میں پوچھنا چاہتا ہوں۔ ہاں! ان انقلابیوں سے! ...... تمہیں ایسی بے شرمی سے جینے کا کیا حق ہے؟ ــــ تم نے ہندوستان کے آلام و مصائب کو مطبوعہ لفظوں اور عبارتوں سے جانا ہے! ...... اور انھیں کو الٹ پلٹ کر تم نے پھر چھپوا دیا۔

تم نے ہندوستان کی بھوک! ــــ جسمانی، دماغی اور قلبی بھوک کو کتابوں سے دریافت کیا۔ ...... تم نے ہندوستان کے دل کے متصل کھڑے ہو کر کبھی اس کی وحشیانہ اور تیز دھڑکن نہیں سنی! ــــ اگر سنی ہوتی، اگر تم نے غریب زندگی دیکھی ہوتی تو قلم توڑ کر پھینک دیتے! جس طرح عالم نزع کے احساسات قلمبند نہیں کئے جا سکتے۔ اسی طرح ایک خزاں رسیدہ، ایک سسکتی ہوئی، ایک ٹھٹھری ہوئی زندگی کا عکس بھی پیش نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے اس زندگی کی ہلکی سی جھلک دیکھی اور اس دن سے خاموش ہوں! ــــ بالکل خاموش!!"

ڈاکخانہ لاوارث مہری لفافہ: "ارے دیوانے! اس
ح بچار' اس فکر و تردد نے ہی تو تجھے کہیں کا نہ رکھا' تو دق کا مریض
ادم ہوتا ہے' تو نے کبھی آئینہ میں صورت بھی دیکھی؟ ..... بالکل
خانہ خطوطِ لاوارث (DEDD LETTER OFFICE)
مہری لفافہ۔"

آپس میں بے خبری: "یہ دُنیا جہاں ہم دل بہلانے کے
آتے ہیں' ایک سرائے ہے جس میں قطار در قطار بستر لگے ہیں'
ایک کو دوسرے کی خبر نہیں!"

پامال گروہ: "بعض آدمی اور پامالی توام پیدا ہوتے
بعضوں کو زبردستی پامالوں میں درج کر لیا جاتا ہے۔ اور بعض
لی کی تلاش میں سرگرداں پھرتے رہتے ہیں۔"

زندگی اور میں: "آہ! میری زندگی کسی اُڑتے ہوئے
ندے کا سایہ ہے جو سطحِ زمین پہ دوڑ رہا ہے! ــــ نہ معلوم میں
ں کے پیچھے دوڑ رہا ہوں یا وہ میرے ساتھ ساتھ دوڑ رہا ہے۔"

کتابِ زندگی: "یہ زندگی ایک کتاب ہے ــــ میری
لت و بیداری کے حالات کی۔ میرے قول و فعل کے اثرات کی۔
ے عیش و طیش کی کیفیات کی ــــ کہیں کہیں صفحوں کے بیچ میں
لیں رکھی ہیں' یہ میری وہ یادیں ہیں جو ایک فراموش کار کی کتاب
گی میں بے ارادہ محفوظ رہ سکیں! ــــ جب میں اپنی زندگی کی
ب کو دُہراتا ہوں تو صرف یہ ترکوں والے صفحے ہی سامنے
تے ہیں۔"

دوگونہ زندگی: "انسان زندگی کا عجائب خانہ ہے۔ مگر
قی زندگی عقل و اخلاص کا کاشانہ۔"

میں اور بجلی کا تازیانہ: "کیا میں کسی مغلوب الجذبات
ع کا وزن سے گرا ہوا مصرعہ ہوں جو عروض و قافیہ سے بالکل
پہ ولہ ہے! ــــ ہاں' ہاں ..... ایسا مصرعہ جو تڑپنے تڑپانے
بجلی کا تازیانہ اور ایسا تازیانہ جیسے تازیانہ ساز لچک بڑھانے
واز پیدا کرنے کے لئے جگہ جگہ سے توڑ مروڑ کر رکھ دیتا ہے۔ لہٰذا
یانہ اپنی ذات سے شکستہ اور یہی شکستگی اس کا کمال ہے کیونکہ
قدر شکستگی بڑھتی ہے اسی قدر لچک اور آواز میں اضافہ
تا ہے۔ ؎

بُلبُل تری آواز کے ہر بول کے اندر
میں ایک تڑپتا ہوا دل دیکھ رہا ہوں

انسان اور آدمی: "بعض لوگ کہتے ہیں کہ انسان اپنی قسمت آپ بناتا ہے' ــــ آہ! دُنیا میں کوئی انسان ہی نہیں' سب آدمی ہیں۔"

ناموافق گرد و پیش: "غالب نے بھی کیا کیا شاہکار پیش کئے ہیں' ــــ میں بھی اپنا شاہکار پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جب ارادہ کرتا ہوں تو ہونٹ ہلنے لگتے ہیں لیکن آواز نہیں نکلتی بعینہ اسی طرح جیسے کسی بھیانک خواب کے گرفتار کی گھگی بندھ جائے۔"

دماغ: "انسانیت کے سر پہ تاجِ شاہی ہے' نہیں نہیں یہی ساری دُنیا میں آباد ہے یعنی یہی حاکم اور یہی محکوم۔!"

فکر و نظر: "آنکھوں کی خاک نے میں غم کی آندھیوں کے سوا کچھ نہیں۔ مگر دل خون کے آنسوؤں کا لبریز کٹورا ہے! یہ میری قمیص اسی خونِ دل کو جذب کرتی رہتی ہے جو کبھی کبھی کٹورہ سے چھلک جاتا ہے! ــــ کیا میرا خونِ دل فکر و نظر کا افشردہ ہے کہ بجلی کی طرح جسم سے پار ہو کر قمیص کو رنگین کر دیتا ہے؟ ــــ اگر اس قمیص کی رنگینیاں دُنیا کو دکھا دوں تو اسے رنگ آمیزی سمجھے گی!"

شاعر اور مداری: "آہ ہندوستان! ــــ ہندوستان کے بوالہوس شاعر اور مداری میں کیا فرق ہے؟ ..... ان کے حالات کے لئے دفتر کے دفتر نا کافی ہیں ــــ یعنی شاعر ڈھونگ مچا کر سوانگ بناتا ہے۔ سارے انیمی' شرابی' بھنگڑ' چرسیے تعریفوں کے پل باندھتے ہیں' مگر عقلمند آدمی دانتوں میں انگلی رکھتا اور مُنہ پھیر لیتا ہے۔"

معطر خار و خس اور پژمردہ پھول: "اگر خار و خس پر بھی عطر چھڑک دیا جائے تو لوگ دور ہی سے خوشبو سونگھ کر مست ہو جاتے ہیں لیکن بیچ بیچ کے پھول اگر دھوپ سے مرجھائیں یا ہاتھ لگنے سے کمہلائیں تو ان کی طرف کوئی پلٹ کر بھی نہیں دیکھتا۔"

اُردو کی گالیاں: "اُف اُردو میں کس قدر گالیاں ہیں' لوگ کہتے ہیں کہ زبان قوم کے کردار کی آئینہ دار ہوتی ہے۔"

زندگی اور قیامت: "جیون کیا ہے؟ قیامتوں کا سلسلۂ نامتناہی جو ادنیٰ اقسام کی مسرتوں اور بیمار آرزوؤں کی شاہراہ پر کھنچتا اور گھسٹتا چلا جا رہا ہے۔"

ہندوستانی شاعروں کا معشوق: "ہندوستان کے شاعروں نے چاند کو معشوق کے چہرے سے تشبیہ دی ہے لیکن طباق

سے چہرے میں تو کوئی حسن نہیں، ویسے بھی گول چہرے عوام کالانعام اور ایسے لوگوں کے ہوتے ہیں جن کے دماغ نازک خیالی سے معرّا، جن کی نگاہیں نکتہ رسی سے مبرّا اور جن کے دل تصائی کے کُندہ سے کچھ زیادہ باوقعت نہیں ہوتے۔"

آوارہ حُسن: "وہ آوارہ حُسن ہے! غرور کی لہروں پر تیرتی ہوئی کشتی! ـــــ کاش میں اپنے آپ میں ڈوب کر ایک چیخ کھینچا تا جو اس کے کانوں کے پردہ پھاڑ دیتی اور ترک غفلت کا آغاز ہوتا! ـــــ کاش میرے گرما گرم دل کی بھاپ اس سے سرگوشی کرتی۔ اور کہدیتی کہ اری نادان، تن کی سُندرتا، تو ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے! ہاں، اگر حُسن لازوال کی طالب ہے تو اپنے دماغ، من، آتما اور سیرت میں حُسن پیدا کر! ـــــ مگر وہ تو باغ عام ہے، اس کے چھوٹے سے دماغ میں فحش کے مسائل و تجربات کے سوا اور کسی چیز کے سمانے کی گنجائش ہی نہیں، اسی عینک کا رنگ جذباتی ہے۔"

ہندوستان کا فحش اور سماج: "جب ان کے ساغروں میں بال آیا تو وہ ایک جھنکار، ایک شعلہ بداماں شکست سے پسپا ہو کر اس مارکیٹ کی طرف دوڑ گئیں جہاں جوانیوں کی خرید و فروخت ہوتی ہے، جہاں قوموں کی زندگی اپنا مزار تعمیر کرتی ہے۔ جہاں صبح کا ستارا کبھی نہیں نکلتا، ـــــ میں عزت کرتا ہوں میں اُن آوارہ عورتوں کے سامنے احترام کے ساتھ سر جھکاتا ہوں، کہ انھوں نے اپنی خودی کو پالیا ـــــ اس عزم و استوار میں بڑے بڑے رہبروں اور سورماؤں سے بھی بڑھ گئیں۔"

ہندوستانی رہنما: "آہ، ہندوستان پر ایسے بڑے بڑے رہنما مینڈکوں کی طرح برس رہے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی سماج کے خلاف علم بغاوت بلند نہیں کرتا۔"

رونا اور ہنسنا: "سارا انانیت کا نشہ ہرن ہو جاتا ہے جب میں اپنے اوپر ہنستا ہوں، ـــــ اور جب اپنے آپ پر ہنستا ہوں تو رونا آجاتا ہے۔" (اقتباس ـــ خیال آفریں دماغ)

"دیوانے! سارے دُکھ اس لئے ہیں کہ لوگ اس پتھروں سے پٹی ہوئی سڑک پر کھڑاؤں پہنکر "کھٹ کھٹ" کرتے ہوئے چلنا چاہتے ہیں، جو دبے پاؤں گزر جاتے ہیں انھیں کوئی غم نہیں ہوتا۔" (اقتباس ـــ "وقت گزر رہا ہے")

"پاس پرست ناتواں میں ہوتا ہے! عیب جبیں ہوتا ہے! گل جبیں نہیں! ـــــ یہ دُنیا دھوکے کی ٹٹی نہیں! یہ سرائے فانی نہیں، یہ ناٹک نہیں، یہاں فنا کا نام و نشان نہیں، یہاں حُسن ہی حُسن ہے۔"

"ہا! اس جگہ کو کون چھوڑے جہاں مائیں ہوں، غریب ہوں، بچے ہوں، گزشتہ زندگی کا پچھتاوا اور آئندہ زندگی کا اندیشہ ہو۔"

"ارے یہ گنگا جمنی زندگی بسر کرنے والے انسان، بند گلیاں ہیں! بند گلیاں!! ان میں نالیاں بہتی ہیں، کوڑے کے ڈھیر لگے رہتے ہیں، ابابیلیں گھونسلے بناتی ہیں، اور کبوتر "غٹر غوں" کرتے ہیں۔ انھیں ـــــ انھیں چکبری زندگی بسر کرنے والوں کی کیا خبر! انھیں یہ بھی خبر نہیں کہ ان کی بستی میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو زندگی کے سرکش دنوں کو دھکیلتا ہے؟ یہ لڑھکتے ہوئے پتھر سب کچھ جانتے ہیں!" (اقتباس ـــ "وقت گزر رہا ہے")

"کسی کا دل نہیں بھرا ـــ کوئی اپنے بستر میں پڑا ہوا سوچتا ہے کہ یہ پیالے ناکافی تھے ـــ مگر ـــ گمر نوشادی شدہ چاند ناف آسماں میں اس طرح لرز رہا ہے جیسے کسی کے شدّتِ جذبات میں ہونٹ۔"

قاضی عبد الغفار

اٹھارویں صدی کے دورِ ثانی کی صحافت اور اُسکے چند نمونے

گزشتہ سال میں نے اُردو صحافت کے ابتدائی زمانہ کے متعلق حیدرآباد کے ریڈیو اسٹیشن سے تین تقریریں کی تھیں۔ یہ سلسلہ چند روز اور جاری رہنے والا تھا لیکن جنگ یورپ کا ہنگامہ اس قدر زیادہ گرم ہو گیا کہ علمی، ادبی یا فنی گفتگو کا کوئی موقع باقی نہ رہا۔ اور حالات حاضرہ پر میری تقریروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس وقت اُردو صحافت پر میری تقریروں کے سلسلہ کی چند کڑیاں باقی رہ گئی تھیں۔ اُن میں سے ایک آج پھر پیش کرتا ہوں ۱۸۵۰ء تک اُردو صحافت کی داستان بیان کر چکا ہوں لیکن اس دور کے بعض قدیم جرائد کی انشا پردازی کے چند نمونے بہت دلچسپی کے ساتھ سُنے جائیں گے۔ اس لئے اٹھارویں صدی کی اُردو صحافت کے دور آخر کا ذکر کرنے سے پہلے دور ثانی کی صحافت کے چند نمونے آپ کو سُنا دوں۔

مثلاً "دہلی اردو اخبار" اپنی ۲۴ مارچ ۱۸۵۰ء کی اشاعت میں سیاحت اور سفر حج کے متعلق اپنے ناظرین کو اُس زمانہ کا ایک آسان راستہ ان الفاظ میں بتاتا ہے:-

"مشتاقان تفریح دیار و امصار اور سیاحان بحتہ کار کو خردہ ہو کہ بشرط شوق و ہمت اب عرب و عجم اور روس و شام و انگلستان کے جانے کیلئے بہت سہولت و آرام کا راستہ نکلا ہے یعنی فیروزپور یا لاہور سے کشتی پر سوار ہو کر بہ آرام تمام سندھ بمبئی تک آدمی پہنچ سکتا ہے اور کچھ خوف چوری چکاری کا اثنائے راہ متصوّر نہیں ہے۔ اگر لاہور سے سوار ہو تو از راہ دریائے راوی بارہ دن میں ملتان پہنچ سکتا ہے۔" وغیرہ

یا مثلاً "دہلی اردو اخبار" اپنی ۱۹ نومبر ۱۸۵۴ء کی اشاعت میں اُستاد ذوق کے انتقال کی خبر اس طرح درج کرتا ہے:-

"ظہیر درد اختر رحلت ملک الشعرا خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق اُستاد خاص حضور اقدس ظل سُبحانی

افسوس صد افسوس کہ شہنشاہ ملک سخنوری خسرو اقلیم معنی گستری ملک الشعرا خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم خاں ذوق استاد خاص حضور والا نے شب ۲۳ صفر شب آخری چہار شنبہ ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۱ نومبر ۱۸۵۴ء عالم فانی سے بسوئے عالم جاودانی رحلت کی۔ الحق یہ وہ مصیبت عظیم ہے کہ اگر صاحب زبان محاورہ فرس و ریختہ اردو بلکہ تمام اہل سخن ہند لباس ماتمی پہن لیں تو روا ہے۔ حضور والا کو جب اطلاع اس واقعہ جانکاہ کی ہوئی باوجودیکہ دربار عام بتقریب آخری چہار شنبہ مہیّا تھا اور سب ارا کین سلطنت باریابی و مجرے کو حاضر تھے لیکن سب کو برخاست کر دیا اور حکم دیا کہ شاہزادگان والا تبار معہ جمیع اہل دربار استاد مرحوم کی مشایعت جنازہ میں شریک ہوں۔"

یہ گویا تقریباً ایک صدی پہلے کی اردو زبان کا صحافتی انداز تحریر ہے لیکن یہ رنگ رفتہ رفتہ بدلتا گیا اور صحافتی زبان میں بالآخر جو سنجیدگی اور سلاست پیدا ہوئی اُس کے ایک داعی تو مرزا غالب تھے اور ان کے بعد سب سے بڑے داعی سر سید احمد خاں ہوئے جنھوں نے خود اپنے قلم سے مضامین نگاری کا ایک نیا نمونہ ملک کے سامنے پیش کیا چنانچہ تہذیب الاخلاق کے مسلک کی جتنی مخالفت اُس زمانہ میں ہوئی اس سے زیادہ اس کے طرز تحریر کی تقلید بھی شروع ہو گئی۔ اور اس بنیاد پر اُردو صحافت کے ارتقار کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اس زمانہ میں اخبار "پنجابی" نے اپنے شمارہ مورخہ ۱۹ مارچ ۱۸۷۳ء میں سر سید کے اسلوب تحریر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:-

" انگریز اس امر کو اپنے ادب کا کمال سمجھتے ہیں کہ اُس میں آئے دن نت نئے خیالات کا اضافہ ہوتا رہے

ہندوستانیوں کو ہرگز یقین نہ آئیگا اگر اُن سے کہا جائے کہ ان جدتوں میں فصاحت کی کوئی پروا نہیں کی جاتی مگر ہندوستانی تو مسلسل تقلید کے قابل ہیں اور کسی اسلوب بیان کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ہمیں اب یہ چاہئے کہ تقلید ترک کر دیں اور ہم میں سے ہر ایک اپنے خاص اندازِ تحریر کے مطابق لکھے"۔

علی گڑھ اخبار نے تو اُس زمانہ میں قدیم طرزِ تحریر کی مذمت کرتے ہوئے یہاں تک لکھا تھا کہ بعض اوقات ایسے مضامین کا مطالب سمجھنے کے لئے صحاح اور قاموس کی ضرورت ہوتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سے تقریباً ۱۸۶۸ء تک اُردو جرائد کا سیاسی رنگ بھی بہت پھیکا تھا مگر رفتہ رفتہ اُس میں بھی گرمی پیدا ہو گئی اور ان کے صفحات پر سیاسی مباحث جس قدر زیادہ اہمیت حاصل کرتے گئے اُسی قدر اُن کی طرزِ تحریر اور اُس کا اسلوب بیان بھی بدلتا گیا۔ حتیٰ کہ اس دور کے آخری شعرا بھی اپنی نظموں میں یہ قومی رنگ اختیار کرنے لگے اور اُنیسویں صدی کے آخر میں اُردو صحافت اور ادب نے بالکل ہی اپنی کروٹ بدل لی۔

یہیں سے اُردو صحافت کا چوتھا دور شروع ہوتا ہے۔ اس
۴۰ دور کے پہلے سال یعنی ۱۸۸۹ء میں ۹۴ نئے اخبار جاری ہوئے جن میں سے دو حیدر آباد کے تھے۔ ایک "جوہر سخن" جو کوچہ جلال سے شائع ہوتا تھا اور ایک "گلدستہ" جس کے مالک عبد اللہ خان ضیغم داماد نواب شرف الامراء تھے۔ یہ پرچہ مطبع آصفی محاذی پُرانی حویلی میں چھپتا تھا اور اس کے سرپرست حسام الملک نواب خان خانان تھے۔ ۱۸۸۶ء میں ۹۵ نئے اخبار جاری ہوئے جن میں سب سے زیادہ قابل ذکر "زمیندار" ہے۔ جو گوجرانوالہ سے پہلے ماہوار اور پھر ہفتہ وار منشی محبوب عالم نے جاری کیا تھا۔ ۱۸۸۷ء میں حیدر آباد سے پانچ نئے پرچے جاری ہوئے جن میں سے چار "گلدستے" تھے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں حیدر آباد میں شعر و سخن کا بہت چرچا تھا۔ ان چار میں سے ایک "گلزار سخن" تھا جس کے مالک نور الدین تھے اور یہ مطبع نور میں طبع ہوتا تھا اس گلدستہ کے سرورق پر یہ شعر لکھا ہوا تھا۔

مزہ نہیں ہے خموشی کا خوش بیاں کیلئے
زباں سخن کیلئے ہے سخن زباں کے لئے

دوسرے گلدستہ کا نام "گل و بلبل" تھا۔ اس کے مالک الطاف حسین بسمل تھے اس کے سرورق پر یہ شعر نمایاں تھا۔

وہ بہار آئی وہ غنچے ہنس کے شرمانے لگے
گوش گل تک نغمۂ بلبل بھی اب جانے لگے

تیسرا گلدستہ "خیال محبوب" تھا۔ اس کے مالک مولوی عبد السلام عرش تھے اور وہ نظام پریس سے شائع ہوا کرتا تھا۔ چوتھا مزاحیہ گلدستہ "دکن پنچ" تھا جس کا دفتر بازار سدی عنبر گولیگوڑہ میں تھا۔ اس کے مالک کشن راؤ تھے مہتمم عبد الکریم ظریف اور ایڈیٹر غریب الدین۔

پانچواں اخبار جو اس زمانہ میں حیدر آباد سے جاری ہوا "افسر الاخبار" تھا جو قلعہ گولکنڈہ سے شائع ہوتا تھا۔ اس کے مالک مشتاق احمد تھے۔

اس سال کا ایک ممتاز پرچہ جو عورتوں کیلئے جاری کیا گیا تھا دہلی کا "اخبار النساء" تھا جس کے ایڈیٹر مولوی سید احمد صاحب مؤلف فرہنگ آصفیہ تھے۔

اس سال کے آخری حصّہ میں لاہور سے "پیسہ اخبار" جاری ہوا جو آجتک مختلف صورتوں میں جاری ہے۔ اس اخبار کے مالک مولوی محبوب عالم کا نام شمالی ہندوستان بلکہ تمام ہندوستان کی صحافت میں ایک خاص مرتبہ رکھتا ہے۔ وہ شاید سب سے پہلے تعلیم یافتہ پنجابی تھے جنھوں نے صحیح تجارتی اصولوں کو مدّنظر رکھ کر صحافت کا فن اختیار کیا۔ اور وہ اُردو صحافت کے اُن چند خوش قسمت اہل قلم میں تھے جنھوں نے اس پیشہ میں شہرت بھی حاصل کی اور دولت بھی۔

۱۸۸۸ء کے بعد اُردو صحافت کا ایک ایسا دور آیا جس میں نئے پرچوں کی تعداد سال بہ سال کم ہوتی رہی۔ اس سال کے ۲۱ نئے پرچوں میں زیادہ قابل ذکر لکھنؤ کا "وکیل قومی" ہے جس کو اُس زمانہ کے ایک مشہور واعظ مقرر اور صاحب قلم "عبد اللہ حسرتی" نے جاری کیا تھا۔ لیکن یہ پرچہ کچھ زیادہ کامیاب نہ ہو سکا۔

۱۸۸۹ء میں صرف ایک نیا ہفتہ وار "بھارت سدھار" لاہور سے جاری ہوا۔ یہ ہندو انتہا پسندوں کا پرچہ تھا۔ اس کا سیاسی رنگ بہت نمایاں تھا۔

۱۸۹۰ء میں صرف تین پرچے جاری ہوئے۔

۱۸۹۲ء میں صرف چار نئے پرچے جاری ہوئے جن میں پٹیالہ کا "مخبر صادق" کسی قدر مشہور ہوا۔ اس کے ایڈیٹر شیخ

ضیاء الحق تھے جو مختلف ریاستوں کے متعلق پمفلٹ شائع کرنے کے سلسلہ میں اچھی طرح جانے پہچانے گئے تھے۔

سنہ ۱۸۹۴ء میں چار پرچے جاری ہوئے جن میں کوئی بھی قابل ذکر نہیں

سنہ ۱۸۹۵ء میں لاہور سے "انتخاب لاجواب" جاری ہوا جو ابھی تک جاری ہے۔ یہ اپنی قسم کا پہلا پرچہ تھا جس کو انگلستان کے اخبار "ٹٹ بٹس" کے اصول پر جاری کیا گیا تھا۔ منشی محبوب عالم کے بھائی منشی عبدالعزیز اس کے ایڈیٹر تھے۔ یہ پرچہ ایک زمانہ میں بہت کامیاب ہوا۔ اور اب تک جاری ہے۔

سنہ ۹۶ و ۹۷ و ۹۸ء میں کوئی نیا پرچہ جاری نہیں ہوا۔ البتہ سنہ ۱۸۹۹ء میں لاہور سے صرف ایک پرچہ "پیشوا" جاری ہوا جس کو شیخ ضیاء الحق نے جاری کیا تھا۔ یہ پرچہ ایک طرف تو اُس زمانہ کی انتہا پسند سیاست کا ترجمان تھا۔ اور دوسری طرف ہندوستانی ریاستوں کے مسائل پر بہت زیادہ لکھتا تھا۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں بیس[20] نئے پرچے جاری ہوئے مگر اُن میں قابل ذکر ایک تو مرزا حیرت کا "کرزن گزٹ" تھا جس نے مذہبی مباحث میں اور خصوصاً حادثۂ کربلا کی اصلیت سے انکار کر کے بہت شہرت حاصل کی۔ اور دوسرا "شمشیر قلم" لاہور تھا جس کے ایڈیٹر اس زمانہ کے ایک مشہور صحیفہ نگار نثار علی شہرت تھے۔ اس سال مدراس سے مولوی عبداللطیف قادری کا "جریدۂ روزگار" شروع ہوا جو عرصہ تک جاری رہا۔ اور ایک زمانہ میں جنوبی ہند کا ایک ممتاز پرچہ سمجھا جاتا تھا۔

نصف صدی سے زیادہ کی ایک مختصر داستان ہے۔ جو بیان کی گئی۔ سنہ ۱۹۰۰ء کے بعد ہم اب اردو صحافت کے دورِ جدید کے دروازہ پر آگئے ہیں۔ اور یہ وہ منزل ہے جہاں اردو صحافت نے ایک انقلاب انگیز کروٹ لی۔ گزشتہ نصف صدی میں عام طور پر اُردو زبان کے صحیفہ نگاروں کے قلم کی جولانی کا میدان سیاسی مسائل کی سرحد پر ختم ہو جاتا تھا۔ خبروں یا افسانوں یا غیر سیاسی مضامین کے ترجموں کے علاوہ اُس زمانہ تک اردو صحافت کا ایک بدنما پہلو ذاتیات کا وہ رجحان تھا جس نے بہت سے جراید کو استحصال بالجبر۔ تخویف مجرمانہ یا بھیک مانگنے اور بڑے آدمیوں کی قصیدہ خوانی کرنے کا عادی بنا دیا تھا۔ اس زمانہ کے بیسیوں جراید کا سرمایہ تجارت یہی تھا کہ وہ رؤسا اور امرا سے کسی نہ کسی طرح روپیہ وصول کرلیں۔ ایسے اخباروں کی عام اشاعت محض برائے نام ہوتی تھی اور ان کا کوئی تعلق رائے عامہ سے نہ ہوتا تھا لیکن سنہ ۱۹۰۰ء کے بعد سے یہ رنگ بدل گیا اور ایسے صحیفہ نگاروں کی تعداد بہت کم ہوگئی۔ اُن کے بجائے اَب سیاسی ماحول نے ایسے اہل قلم پیدا کرنے شروع کئے جو "شجر ممنوعہ" کی طرف ہاتھ بڑھانے لگے بنگال میں سب سے پہلے یہ حرارت پیدا ہوئی اور اس کے بعد پنجاب میں تقسیم بنگالہ کے ہنگامہ سے کچھ پہلے اور اُس کے بعد اُردو صحافت اپنے قدیم مسلک سے جدا ہوئی اور اُس نے مطالبہ حقوق اور سیاسی تنقید کے ایک ایسے میدان میں قدم رکھا جہاں نئی آوازوں سے اُس کے کان اور نئے الفاظ سے اُس کا قلم آشنا ہوا۔ اُس زمانہ کے بعض پرچے تو اس قدر گرم تھے کہ شاید آج بھی اُن کے الفاظ کو دُہرانا آسان نہیں

۳۱ خاک سے یہ آگ پیدا ہوئی اور آگ سے وہ شعلے بھڑکے جنھوں نے ملک کے لاکھوں آدمیوں کی ذہنی فضا کو بدل دیا۔ اُن اعتدال پسند اور کمزور آباو اجداد کی یہ وہ نئی اور حجرد المزاج نسل ہے جو اس نئے دور میں اپنے بلوغ کی طرف قدم اُٹھاتی جا رہی ہے۔ اور کہتی جا رہی ہے۔ کہ

با من میا دزاے پدر فرزند آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگان خوش نکرد

چند قابلِ دید کتابیں

سیرِ کائنات

یہ کتاب انگلستان کے مشہور سائنسداں جی جینس کی آٹھ تقریروں کا مجموعہ ہے۔ جو موصوف نے رائل انسٹیٹیوٹ آف لندن میں زمین، ہوا، اور چاند ستاروں پر کی تھیں۔ قیمت مجلّد عہ/ ۴ر

سلطنتِ خداداد

میسور کی نامور سلطنت کے بانی حیدر علی اور اُس کے جانشین ٹیپو سلطان کی مکمل تاریخ۔ قیمت للعہ ر

تاریخ جنوبی ہند ۴۲

جنوبی ہند کی مکمل تاریخ بڑی چھان بین کی گئی ہے اور داخلی و خارجی ہر ممکن سند پیش کی گئی ہے۔ قیمت تین روپیہ (سے ر)

معلّم کی زندگی

یہ مؤلف کی محض آپ بیتی ہی نہیں بلکہ جامعہ کی دلچسپ اور مکمل تاریخ۔ نیز اکیس سالہ تعلیمی تجربوں کا نچوڑ ہے۔ قیمت ہر دو حصص پانچ روپیہ (صہ ر)

محشرِ خیال

سجاد علی انصاری مرحوم کے مجموعۂ مضامین کا دوسرا ایڈیشن۔ اس مرتبہ مرحوم کا ہنگامہ خیز ڈرامہ "روز جزا" بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ قیمت مجلّد تین روپیہ ۸ر (عہ/ ۸ر) غیر مجلّد عہ ر

مبادی سیاسیات

مصنّفہ پروفیسر ہارون خاں صاحب شیروانی۔ اس میں تفصیل سے علم سیاست کی ابتدائی معلومات اور عہد حاضر کی سیاسی تحریکوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ۴۰۰ صفحات قیمت مجلّد صہ ر

جگ بیتی

پنڈت جواہر لال نہرو کی کتاب Glimpses of World History کا اُردو ترجمہ۔ قیمت جلد اوّل تین روپیہ (سے ر)

روحِ اقبال

یہ کتاب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کے تین مقالوں اقبال اور آرٹ، اقبال کا فلسفۂ تمدّن، اقبال کے مذہبی اور مابعد الطبیعی تصوّرات پر مشتمل ہے۔ قیمت غیر مجلّد ۴ر

ذکرِ حسین

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب پرنسپل جامعہ ملّیہ اسلامیہ کی "ذکر حسینی" پر معرکۃ الآراء تقریر جسے پبلک کے مطالبہ پر کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ قیمت تین آنہ (۳ر)

مکتبہ جامعہ دہلی

نئی دہلی ۔ لکھنؤ ۔ بمبئی ۳

نیا راگ

نیا راگ

اس نمبر کی نظموں میں کافی دوام و ثبات ہے۔ "رباب شکستہ" عندلیب شادانی کی گاتی ہوئی غزل ہے۔ عندلیب لطیف نفسیاتِ محبت اور باریک محاکات نگاری میں مشاق ہے، رومان میں ڈوبی ہوئی سنجیدہ شوخی اس کی فطرت ہے۔ "آدمی" جوش کی تازہ فکر ہے زندگی کے تقادوں کا آئینہ، سماجی اور قدرتی جبر و اختیار پر ایک ماہرانہ طنز، شاید اُردو زبان کے تمام شاعروں میں جوش ہی سب سے پہلا شاعر ہے جس نے طنزیات نگاری کو رومان کی آمیزش سے ایک خاص رنگ دیا، یہ رنگ اکبر کے رنگ کے مقابلے میں زیادہ گہرا اور ذی ثبات ہے۔ "قلوبطرہ کا جلوس" شکسپیر کے مشہور ڈرامے "کلیوپیٹرا اور انطونی" کے ایک حصّہ کا منظوم ترجمہ ہے۔ اور اس میں اوریجنل نظم کی سی روانی و تکمیل پائی جاتی ہے۔ اُردو ادب میں حقی کی یہ کامیاب کوشش اس کے امیر ہونے کی دلیل ہے۔

شاہد کا 'ایک حسین منظر'، عندلیب کا 'ترانۂ تخریب'، خورشید الاسلام کی 'شکست'، تینوں نظمیں اپنی ایک سطح رکھتی ہیں۔ شاہد اجتماعی طور پر فکر کرنے کا عادی ہے۔ اس کی نظم کی ترتیب، روایت قدیم سے ذرا الگ ہے، مگر حسین منظر میں گم ہو گیا۔ عندلیب کی 'تخریب'، اک نغمۂ تعمیر ہے۔ اک گرج سی ترانہ کی جان ہے۔ 'شکست' میں نادر استعارے ہیں، اشیا کی تعبیر عام انداز کی نہیں، مگر نظم کے اختتام پر خورشید کا جذبہ ناتمامی کی نذر ہو گیا ہے۔

مخدوم محی الدین کے "ستارے" اور اختر الایمان کے "مجلکے" دونوں قنوطیت کے دھوئیں میں اٹے ہوئے اس ہجوم میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ اختر الایمان کا تصور ایک پیچ در پیچ قنوطی رومان میں پرواز کرنے کا عادی ہے۔ جس طرح مجبور اور مقید شباب کی خودرو اور خود زائیدہ تمنائیں، مگر جو کچھ ہے فطری ہے، اور ہمارے ماحول کا پرتو ہے، مخدوم کی نظم میں بھی یہی کیفیت ہے، مگر اختر کے مقابلے میں ایک دوسری قسم کی شگفت مخدوم کی خصوصیت ہے۔ اک دلنواز و جوان یاس انگیز مگر شوخ ترنّم ان دونوں کی جان ہے۔

حسرت ترمذی اور جمیل الدین اپنے نرالے الگ گا رہے ہیں۔ راگ قدیم سہی، مگر اک رنگا رنگی کا ہجوم ہے، ترمذی کی غزل کی سطح کافی بلند ہے، عمومیت سے معرّا اور جذباتی شوخی سے محفوظ۔ جمیل الدین، ترمذی کے مقابلے میں واضح طور پر زیادہ پُرشباب ہے۔ حسرت موہانی اپنی تازہ نوائی میں اک نئی تاریخ بنا رہے ہیں۔ غزل میں تلمیح نگاری بذاتِ خود ایک شعبہ تھا مگر حسرت نے اپنی ان ارتقائی غزلوں میں واقعیت نگاری سے نئی روح پھونک دی ہے۔ اور اپنے موضوع کو جو آج تک غیر مرئی نظر آتا تھا 'مرئی' کر دیا ہے۔

نظم کا یہ تمام حصّہ محض کسی رسالے کا رسمی حصّہ نہیں معلوم ہوتا، بلکہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ 'درو صفِ امینہ خانم' اور 'قلوبطرہ کا جلوس' اس نمبر کو تاریخی مرتبہ بخش رہے ہیں۔

ساغر

عندلیب شادانی

ربابِ شکستہ

رشک ہے تجھ کو ہمنشیں، کچھ بھی اگر نہ تھا تو پھر
میری ہی سمت دیکھ کر، کیوں کوئی مسکرا دیا

ترکِ وفا کے ساتھ ساتھ عذرِ جفا نہ کیجئے
بھولے ہوؤں کی یاد کیا، بھول گئے بھلا دیا

یاد کرو وہ دن کہ تم بُت بھی نہ تھے خدا تو کیا
میری پرستشوں نے آج تم کو خدا بنا دیا

تجھ کو خدا کا واسطہ، یوں مرا امتحاں نہ لے
مجھ کو نہ اس گماں میں ڈال، تو نے مجھے بھلا دیا

وقف ہیں کیوں مرے لئے آج یہ نامرادیاں
پہلے ہی نوشِ لب کے ساتھ زہر نہ کیوں ملا دیا

ہاں وہیں جا رہا ہے چاند، مجھ کو بلا رہا ہے چاند
ہائے اسے خبر نہیں اُس نے مجھے بھلا دیا

مجھ کو بھی کچھ ملال تھا اُن کو بھی انفعال تھا
لب تو خموش ہی رہے دل نے حجاب اٹھا دیا

ایشیا۔ اگست ۱۹۴۲ء

جوش ملیح آبادی

آدمی

خوشیاں منانے پر بھی ہے مجبور آدمی
آنسو بہانے پر بھی ہے مجبور آدمی
اور مسکرانے پر بھی ہے مجبور آدمی
دُنیا میں آنے پر بھی ہے مجبور آدمی
دُنیا سے جانے پر بھی ہے مجبور آدمی

کیا آدمی کی بات کہوں تجھ سے ہمنشیں
اس ناتواں کے قبضۂ قدرت میں کچھ نہیں
رہتا ہے قصرِ حرمت و اعزاز میں مکیں ٣٦
اور زندگی اُلٹتی ہے جس وقت آستیں
عزت گنوانے پر بھی ہے مجبور آدمی

انسان کو ہوس ہے جئے صورتِ خضر
ایسا کوئی جتن ہو کہ بن جائے بس امر
تا روزِ حشر موت نہ پھٹکے اِدھر اُدھر
حالات جب بدلتے ہیں کروٹ کراہ کر
تو سر کٹانے پر بھی ہے مجبور آدمی

انسان بہر صدق ہے سرچشمۂ صفا
انسان حق پرست ہے، حق جو، حق آشنا
انسان راست باز ہے مانند انبیا
پر اس کو آنے لگتا ہے جب جھوٹ میں مزا
زٹیئیں اُڑانے پر بھی ہے مجبور آدمی

انساں معاملت میں بھی رہتا ہے حق پناہ
ہر عذرِ لنگ اس کی شریعت میں ہے گناہ
رکھتا ہے خوش معاملگی ہی سے رسم و راہ
لیکن جب آ کے آنکھ دکھاتا ہے قرضخواہ
حیلے بہانے پر بھی ہے مجبور آدمی

انساں ہے جود و بذل و غنا کی کائنات
لالچ کو اور ہوس کو سمجھتا ہے واہیات
قارون کے خزانے پہ بھی مارتا ہے لات
لیکن جب اسکے ساتھ بگڑتی ہے اسکی بات
جوتے چرانے پر بھی ہے مجبور آدمی

دل کو بہت ہے ہنسنے ہنسانے کی آرزو
ہر صبح شام جشن منانے کی آرزو
گانے کی اور ڈھول بجانے کی آرزو
پینے کی آرزو ہے پلانے کی آرزو
اور زہر کھانے پہ بھی ہے مجبور آدمی

ہر دل میں ہے نشاط و محبت کی تشنگی
دیکھو جسے وہ چیخ رہا ہے خوشی خوشی
اس کارگاہِ دہر میں لیکن کبھی کبھی
فرزندِ نوجوان و عروسِ جمیل کی
میّت اُٹھانے پر بھی ہے مجبور آدمی

رفعت پسند ہے بہت انسان کا مزاج
پرچم اُڑا کے شان سے رکھتا ہے سر پہ تاج
گردوں پہ مہر و ماہ سے لیتا ہے گو خراج
لیکن ہر اک گلی میں بہ فرمانِ احتیاج
بندر نچانے پر بھی ہے مجبور آدمی

ہر دل کا حکم ہے کہ رفاقت کا دم بھرو
احباب کو ہنساؤ میاں آپ بھی ہنسو
چھوٹے نہ دوستوں کا تعلق جو ہو سو ہو
لیکن ذرا سی بات میں یارانِ خاص کو
ٹھوکر لگانے پر بھی ہے مجبور آدمی

دل ہاتھ سے نکلتا ہے جس بُت کی چال سے
دم ہی نکلنے لگتا ہے جس کے ملال سے
موجیں لہو میں اُٹھتی ہیں جس کے خیال سے
یارو کبھی کبھی اسی رنگیں جمال سے
آنکھیں چُرانے پر بھی ہے مجبور آدمی

غصّہ سے ہلنے لگتا ہے مردانگی کا سر
مکھی بھی بیٹھ جائے کبھی ناک پر اگر
عزّت پہ حرف آئے تو دیتا ہے بڑھ کے سر
ہر شب کو تازہ مرد کے آغوش میں مگر
جورو سُلانے پر بھی ہے مجبور آدمی

جب کوئی دیکھتا ہے کسی خوش خرام کو
جپتا ہے صبح و شام اُسی بُت کے نام کو
جی چاہتا ہے جائیے ہر شب سلام کو
آن بن جو ہو گئی تو اُسی لالہ فام کو
ٹھینگا دکھانے پر بھی ہے مجبور آدمی

رہتا ہے عطر و عود میں کیا کیا بسا ہوا
پھرتا ہے رنگِ نرگس و نسریں سے کھیلتا
رکھتا ہے بوئے زلفِ دوتا سے معاملہ
ہر مفلسی دہائی ہے جب آن کر گلہ
کوڑا اٹھانے پر بھی ہے مجبور آدمی

خود دار و خود شناس و خود آگاہ ہے بشر
سنجیدہ و متین و خوش آداب و حق نگر
پر دل میں احتیاج کا بجتا ہے جب گجر
تو سر ہلا ہلا کے طوائف کی پُشت پر
طبلہ بجانے پر بھی ہے مجبور آدمی

اختر الایمان

محلکے

تصوّرات کی شمعیں جلا کے دیکھ تو لوں
سیاہ خانۂ ہستی سجا کے دیکھ تو لوں
غمِ حیات پہ آنسو بہا کے دیکھ تو لوں — تری نظر سے ذرا دور جا کے دیکھ تو لوں

ابھی تو پی ہے مئے غم سنبھل نہیں سکتا
ابھی تو ہوش ہیں دو گام چل نہیں سکتا
ابھی تو زیست کا عنواں بدل نہیں سکتا — محبّتوں کو فسانہ بنا کے دیکھ تو لوں

یہ گھر بنا کے گرا دوں گا اپنے ہاتھوں سے
دئے جلا کے بجھا دوں گا اپنے ہاتھوں سے
یہ ساری بزم اُٹھا دوں گا اپنے ہاتھوں سے — خیال و خواب کی دُنیا بسا کے دیکھ تو لوں

سیاہ و سُرخ محلکوں[1] سے اس طرف کوئی
گھنی دبی ہوئی پلکوں سے اس طرف کوئی
پُکارتا ہے دُھندلکوں سے اس طرف کوئی — یہ دو قدم ہیں انہیں بھی اُٹھا کے دیکھ تو لوں

غبارِ رہ کے اشارے سنبھال لیتے ہیں
اُفق کے دھندلے کنارے سنبھال لیتے ہیں
سُنا ہے ٹوٹتے تارے سنبھال لیتے ہیں — بس ایک بار سہی ڈگمگا کے دیکھ تو لوں

38

[1] محل کا اسم تصغیر محلکہ ۔ جمع محلکے ۔

ایشیا ۔ اگست ۱۹۴۲ء

م۔ش۔ حقی دہلوی

قلوبطرہ کا جلوس

ذیل کے اشعار شیکسپیئر کے ڈرامے "انطنی و قلوبطرہ" کا ایک منظوم اقتباس ہیں۔ انطنی کا مصاحب اِنوبار بس اپنے رومی دوستوں کے سامنے قلوبطرہ کی شان و شوکت کا مرقع کھینچتا ہے۔ ڈرامے کا یہ ٹکڑا شیکسپیئر کی بہت مشہور اور دلآویز نگارش میں سے ہے۔

اِنوبار بس:۔

کیا پوچھتے ہو اُسکے سفینے کی تم بہار
رکھا تھا دوشِ موج پہ اک تختِ زرنگار

کیا اُسکی آب و تاب کا عالم کہے کوئی
دریا میں ایک آگ تھی گویا لگی ہوئی

کشتی نہیں سریرِ مطلّا تھا سربسر
اک شعلہ وسطِ آب بھڑکتا تھا سربسر

فردوسِ آرزو تھا عروسِ نظارہ تھا
آغوشِ رودِ نیل میں اک مہ پارہ تھا

وہ عطر میں بسے ہوئے خوش رنگ بادباں
رنگت پہ جن کی قوسِ قزح کا سا تھا گماں

اُن کی مہک پہ صدقے ہوئی جاتی تھی ہوا
ایک ایک بل پہ سینکڑوں بل کھاتی تھی ہوا

دُنبالہ تک ڈھلے ہوئے سونے کا تھا تمام
کرتی شعاعِ مہر بھی جھک جھک کے تھی سلام

چپو سڈول، نقرئی، زرکار و آبدار
گویا حسین آنکھوں پہ پلکوں کی تھی قطار

ہر دم غضب کی خوبی سے پڑتا تھا اُن کا ہاتھ
شہنائی کی سُریلی صداؤں کے ساتھ ساتھ

کچھ اس ادا سے کرتے تھے دریا کے دل پہ وار
اس ناز سے جھٹکتے تھے موجوں کو بار بار

ہوتی تھی تیز پانی کی رفتار اور بھی
اور دوڑتا تھا پیچھے کہ اک بار اور بھی!

لیکن بیان محال ہے خود اُسکے حُسن کا
نطق اُس کے سامنے نظر آتا ہے بینوا

اک سر پہ شامیانہ تھا زرکار، مخملی
اور اُس میں وہ بہارِ تماشا دراز تھی

وینس[1] کا وہ مرقع، تخیل کا شاہکار
صنعت سے جس کی ہوتی ہے فطرت بھی شرمسار

دیکھو تو یہ کہو وہ مرقع بھی کچھ نہیں
کچھ اس ادا سے جلوہ نما تھی وہ مہ جبیں

دو طفل خوبرو تھے دو طرفہ چنور لئے
تھے ٹھوڑیوں میں جن کی غضب کے بھنور پڑے

یوں دونوں مسکراتے تھے کیوپڈ کی شان سے
اُترے ہیں جیسے آکے ابھی آسمان سے!

طرفہ تھا کچھ چنور کے ہلانے کا طور بھی
دہکا رہے تھے شعلۂ عارض کو اور بھی

اگرپیا:۔ واہ رے انطنی تری قسمت!

انوبار بس:۔

اب سُنئے آپ اُسکی خواصوں کی آن بان
جل پریاں تھیں کہ اُس پہ فدا کر رہی تھیں جان

[1] یہ اشارہ ایک قدیم یونانی مصور کے مشہور شاہکار کی طرف ہے۔ وینس حسن کی دیوی کا یونانی نام ہے۔

یوں چل رہی تھیں اُسکے اشاروں پہ ناز سے　　سو سو ادا نکلتی تھی اک اک نیاز سے
پتوار پر کھڑی تھی کوئی چل پری سی نار　　تھی کوئی بنتِ بحر طنابوں کی نگہدار
وہ ہلکے ہلکے ہاتھ وہ نازک کلائیاں　　انگڑائیاں سی لیتے تھے مستی میں بادباں!
کشتی میں تھی عجیب و غریب ایسی کچھ مہک　　لپٹیں سی اُٹھ کے آتی تھیں دریا کے پار تک
اُس وقت انطنی کا بھلا کس کو ہوش تھا　　دربارِ عام شہر میں سوتا ہی رہ گیا
خلقت تمام ٹوٹ پڑی اس نظارے پر　　سیٹی بجا رہے تھے ہوا میں خیال اُدھر
جاتی ہوا بھی سیر کو اُس دم عجب ہے کیا　　فطرت میں یہ کہو کہ خلا ہی محال تھا

اگریپا :- کیا کہنا ملکۂ مصر کا!

اِنو باربس :- اُتری ہے جب کنارے تو یہ عرض کی گئی　　کھانے پہ یاد شام کو کرتے ہیں انطنی
بولی کہ جا کے دو مری جانب سے یہ پیام　　بہتر ہے آپ ہی مرے مہماں ہوں آج شام
اب کس طرح بھلا کریں انکار انطنی　　عورت نے اُن سے "نا" تو سُنا ہی نہیں کبھی
جکڑے گئے خیال وہیں قصّہ مختصر　　دعوت میں پہنچے ملکۂ عالم کے محل پر
اور نقدِ دل بدل میں ضیافت کے دیدیا　　جس کا فقط نگاہ نے اُن کی مزا لیا

اگریپا :- واہ رے میری ملکہ جان! [1]

اِنو باربس　اک روز سیر کرنے جو بازار میں گئی　　اٹھلا کے تھوڑی دور عجب ناز سے چلی
دم اس خرامِ شوخ سے کچھ پھول سا گیا　　بولی تو جیسے بات کوئی بھول سا گیا!
بے حال ہونے میں بھی عجب حال اُس کا تھا　　ناطاقتی میں اور سوا زور آ گیا!

میکناس :- پر اب تو چھوڑ دیں گے اُسے شاید انطنی؟

اِنو باربس :- جی اُن کی کیا مجال جو چھوڑیں اُسے کبھی!
کمھلائے اُس کو گردشِ دوراں محال ہے　　برگشتہ اُس سے ہو دلِ انساں محال ہے
جادو نہ جس پہ گردشِ دوراں کا چل سکے　　افسوں سے اُسکے کیا کوئی انساں نکل سکے
ہر آن میں نئی سے نئی ہر حال میں عجیب　　یہ طرفگی و تازگی ہوگی کسے نصیب
وہ عورتیں جو جی سے اُتر جائیں اور ہیں　　تسکین میں بھی یاں تو طلب ہی کے طور ہیں
کیا سیر اُس کے وصل سے ہوگا کسی کا جی　　ظالم بجھا بجھا کے لگاتی ہے اور بھی!
بدمستیاں بھی اُس کی ہیں اس درجہ دلنشیں　　کرتے ہیں زاہدانِ مقدّس تک آفریں!

---

[1] Royal Command ' اس جملے کے لئے ان سے زیادہ مناسب الفاظ نہیں ملے! (مترجم)

شاہد صدیقی اکبر آبادی

اک حسین منظر

فضائے دشت پہ شادابیاں سی چھائی ہوئی   درخت دھوئے ہوئے پتّیاں نہائی ہوئی
لطیف وسرد ہوا، وادیوں میں گرمِ خرام   شبابِ عشق کی آبادیوں میں گرم خرام
ہوائے سرد میں شامل طیور کی آواز   کہ جیسے خواب میں آتی ہو دور کی آواز
فرازِ کوہ سے شفاف آبشار رواں   سوئے نشیب، تماشائی بہار رواں
افق پہ ابر کے ٹکڑے ہیں جھاڑیوں پہ دھواں   زمیں پہ سبزۂ تازہ، پہاڑیوں پہ دھواں
ہر ایک بوند سے پیدا ہے اک ترنّم سا   کہ جیسے رقص میں آتی ہے گھنگروؤں کی صدا
کہیں نشیب میں شاداب کھیت دھانوں کے   ہرے لباس میں کچھ حوصلے کسانوں کے
کہیں سکوت، کہیں طائروں کی آوازیں   خموش وصاحبِ دل شاعروں کی آوازیں
کسان مست ہیں، پھولے نہیں سماتے ہیں   بڑے غرور سے کھیتوں کی سمت جاتے ہیں
کسی نے پھینکے ہیں قطرے کچھ اس قرینے سے   کہیں گلوں پہ چمکتے ہوئے نگینے سے
لچک رہی ہے زمیں، گنگنا رہی ہے بہار   عروسِ وقت کو جھولا جھُلا رہی ہے بہار
ہوا میں ایک مہک سی ہے جس کا نام نہیں   یہی مہک تو کہیں حاصلِ مشام نہیں؟
بہارِ سادہ، طبیعت کو گمُرہی کا پیام   دلِ خراب کو، ہر چیز بیخودی کا پیام
مری نگاہ سے فطرت کو اجتناب سا ہے   کہ ان حسین مناظر پہ اک حجاب سا ہے
تاثرات کی حد سے گزر رہا ہوں میں   یہ بات ہے کہ تجھے یاد کر رہا ہوں میں

فضائے گل میں بھٹکتا ہوں کھو نہ جاؤں کہیں
میں اس بہار میں تحلیل ہو نہ جاؤں کہیں

حسن یحییٰ عندلیب ایم۔اے

تخریب کا ترانہ

ہر شے پہ جہاں کی طاری ہے اک خوف سا صبح و شام مرا
دیکھو گے جسے پاؤ گے اسیرِ خطرۂ زیرِ دام مرا
اک تہلکہ سا اک زلزلہ سا ہوتا ہے ہر ہر گام مرا
مشرق میں قدم پہنچا تا ہے یہ مغرب تک پیغام مرا

بیدردی و خوں ریزی و تخریبِ جہاں ہے کام مرا
آہٹ سے مری مچ جاتی ہے، ہلچل محلوں، ایوانوں میں
شعلوں کے سمندر بہتے ہیں، صحراؤں میں، کاشانوں میں
شورش میری وحشت افزا حیوانوں میں، انسانوں میں
جو زور ہے میرا زور کہاں، وہ آندھی میں طوفانوں میں

مست و بیخود ہو جاتے ہیں، جو پی لیتے ہیں جام مرا
آبادیوں میں، ویرانوں میں، دریا کی طرح میں بہتی ہوں
ملکوں کی سیاحت کرتی ہوں، قوموں کو مٹاتی رہتی ہوں
میں طعن و ملامت، ظلم و ستم، دنیا میں سبھی کچھ سہتی ہوں
خوابیدۂ غفلت قوموں سے، ہر بات کھری میں کہتی ہوں

قوموں کو جگانے آتی ہوں، ہے گرچہ تباہی نام مرا
صدیوں کے خمار آلودہ بھی، ٹھوکر سے مری اٹھ جاتے ہیں
ہر چند مچلتے، روتے ہیں، گھبراتے ہیں چلاتے ہیں
مسدود مگر راہیں سب، جب اپنے لئے وہ پاتے ہیں
میدانِ وغا میں تیغ بکف ناچار چلے ہی آتے ہیں

بازاروں میں گلیوں میں برپا ہر جا ہے کہرام مرا
مہمل ہیں سب حال و ماضی، رہتی ہے نظر مستقبل پہ
رکھتا ہے سفینہ کب میرا کاشانۂ موج ساحل پہ؟
سب جور و جفا سہہ جاتی ہیں، جو کچھ بھی گذرتی ہے دل پہ
ڈھاتی میں شکستہ تعمیروں کو، جا لگتی ہوں منزل پہ

پیغام نظامِ نو کا ہے تخریب کا یہ ابرام مرا
تاریک اندھیری راتوں کو، تنویرِ سحر میں دیتی ہوں
ہاں تشنہ لبِ اسکندر کو بھی، آبِ خضر میں دیتی ہوں
عصفور کے نازک سینے کو، شاہین کا جگر میں دیتی ہوں
یخ پاروں کو بادل کی گرج، بجلی کا اثر میں دیتی ہوں

آغاز مرا تخریب سہی، تعمیر ہے ترا انجام
صیاد کے رخشاں خنجر سے اب، مرغِ بسمل پھڑکے کیوں؟
لو شمعِ بزمِ عشرت کی اب، خوفِ سحر سے بھڑکے کیوں؟
گلزارِ جہاں میں موجِ صبا سے، پتہ کوئی کھڑکے کیوں؟
پیکانِ شعاعِ مہر سے آخر سینۂ شبنم دھڑکے کیوں؟

سایہ افگن سب پہ یکساں ہوتا ہے لطفِ عام
دیوانۂ راحت ڈرتا ہے، کلفت کے فسانے باقی ہیں
پنہاں ہے نظر سے آبِ بقا، ظلمت کے فسانے باقی ہیں
پر ہے یہ حقیقت میرے سبب، بہجت کے فسانے باقی ہیں
عشرت کے ترانے قائم ہیں، جرأت کے فسانے باقی ہیں

مخمورِ طرب کر دیتا ہے اک جامِ مئے آلام
ہر قطرۂ اشکِ رنگیں میں، اک موجِ تبسم لرزاں ہے
ہر کرب و بلا کے دامن میں، اک روحِ مسرت خنداں ہے
ہر ضرب میں طبلِ جنگ کی مضمر نغمۂ سازِ شبستاں ہے
ہر سلسلۂ تخریب میں بس، تعمیر کا شعلہ رقصاں ہے

ہاں جوئے شیر بھی لاتا ہے، یہ تیشۂ خوں آشام
تسکینِ قلوبِ مضطر ہوں، خونناب مری تصویر سہی
ہوں موجِ سحر، پروردۂ صد اظلام مری تنویر سہی
پیغامِ حیاتِ نو ہوں میں، آلودۂ خوں شمشیر سہی
چاؤش ہوں میں آزادی کی، آوردۂ صد زنجیر سہی

تحریرِ مسرت ہے نقشِ پائے فرخ فرجام
مایوسیوں کو، محرومیوں کو امید سے ٹکر لینے دو
ضحاکِ فرومایہ کو بھی جمشید سے ٹکر لینے دو
مریخ اجل پیغام کو بھی ناہید سے ٹکر لینے دو
اب عہد ہے میرا ذرہ کو خورشید سے ٹکر لینے دو
اک سیلِ کرم ہو جائے گا، غم پرور یہ ادغام

سرت موہانی

در وصفِ امینہ خانم

(مولانا حسرت موہانی کی جدید غزلیں)

(ایشیا پر مولانا حسرت کا یہ کرم ان کی شاعری کی طرح یادگار و جاوداں ہیگا۔ ساغر)

(جہاز رحمانی مورخہ ۳۰ رجنوری ۱۹۴۱ء)

(جملہ حقوق محفوظ)

ہے نازاں کہ تری صورتِ زیبا دیکھی — آنکھ حیراں کہ اک حُسن کی دُنیا دیکھی
نکھیں ہوئیں گرویدہ پہلے آنکھوں کیطرح — چاہنے دل بھی لگا، آپ کو دیکھا دیکھی
ں مجھ سے بھی کیوں غیر کے مانند ہوئے — مجھ کو دیکھا نہ مرے دل کی تمنّا دیکھی
تِ حسن ہے بیباک مگر ہم نے یہاں — تیری شوخی میں بھی اک شانِ محابا دیکھی

زلفِ شب رنگ پہ گلنار لباسی کی بہار
آج حسرت نے رُخِ یار میں کیا کیا دیکھی

(۲)

(یکم فروری ۱۹۴۱ء جہاز رحمانی)

ن دولتے است بہ گنجش امینہ — ورناز خاتمے است، بہ زیبش نگینہ
ابسے بہ عیش بسر بُردی وہنوز — مخمور آں خمارِ لطیف و شبینہ

حسرت بہ عرضِ شوق زکو شد کہ فی المثل
شایانِ سنگ ہرزہ نہ آبگینہ

(۳)

(۲ رفروری ۱۹۴۱ء جہاز رحمانی)

ب ہم کو آیا نظر ایک آج — طرحدار معشوقِ عاشق مزاج
اس کا محبت کے غم سے قریں — نظر اس کی سوزِ دروں کی امیں
کا لے جو تغافل سے کام — کرم جس کی بے اعتنائی کا نام
س سے کیونکر دلِ عاشقاں — جسے خود ہو سودائے حُسنِ بُتاں
سرت نہ کیوں دل نوازی کرے — جو چھپ چھپ کے خود عشق بازی کرے

نہیں یاد ہے کسی کی — چھپتی نہیں بات عاشقی کی
شاہدِ حُسن کا طرفدار — آنکھیں غمِ آرزو سے خوں بار
اس کا بری خود التجا سے — بیگانہ ہے عرضِ مدعا سے

کردار ہیں سب اسکے مستور — معشوقی و عاشقی کے دستور

حسرت ایسوں کی پائے بوسی
کچھ عیب نہیں قسم خدا کی

(۴ رفروری ۱۹۴۱ء جہاز رحمانی)

کس درجہ دلپذیر ہے پُرنقش یہ خواب کی — آئینہ دار آپ کے حسن و شباب کی
کرتی ہے دل کو اور بھی آمادہ ہوس — تیری یہ بے رُخی، یہ ادا اجتناب کی
اہلِ نظر سے آپ کو لازم نہیں حذر — ہوتی ہے اہلِ فسق سے حاجت حجاب کی
کچھ ان کو قدرِ شوق نہیں، ورنہ آرزو — امیدوار تھی کرمِ بے حساب کی

حسرت وہ بے نیاز محبت ہیں کچھ انہیں
ابتک خبر نہیں ترے حالِ خراب کی

(۴ رفروری ۱۹۴۱ء جہاز رحمانی)

پھر کہاں دل رہے کہاں نہ رہے — جب تمہیں اس پہ مہرباں نہ رہے
خود غرض عشق، رعبِ حُسن کو بھی — چاہتا ہے کہ درمیاں نہ رہے
دل شکن کیوں بنو، ہمارے لئے — تم یہ مانا کہ دلستاں نہ رہے
یاس بہتر ہے، دیکھا دبے مہر — آرزو کوئی ہم جاں نہ رہے

ہم بھی کہدینگے پیر حسرت کو
عشقِ حسرت اگر جواں نہ رہے

(۵ رفروری ۱۹۴۱ء جہاز رحمانی)

ہمنے ہر ہر بات اپنے حق میں جانی آپکی — مہربانی ہو کہ نا مہربانی آپ کی
ہے نرالی سبز کی بھی رنگ روشن پر بہار — اوڑھنی بہتر تھی لیکن ارغوانی آپ کی
خود غرض ہم کو بھی ٹھہرایا جو غیروں کی طرح — دیکھئے اچھی نہیں یہ بدگمانی آپ کی
آپ کے معشوق ہو کر عاشقی کی داستاں — کاش ہم بھی ایکدن سُنتے زبانی آپ کی

اس گلِ رعنا کا حسرت یوں ہی کیا عالم تھا جما
ہو گئی ہے طرّہ جس پر خوش بیانی آپ کی

۶ر فروری ۱۹۴۱ء

نہ پوچھو خاطرِ بسمل میں کیا ہے
یہ خود سوچو تمہارے دل میں کیا ہے

پناہِ جہدِ پیہم ہو تو خطرہ
فریبِ دوریِ منزل میں کیا ہے

سزا دو گے ہمیں کب تک کہاں تک
خدا جانے تمہارے دل میں کیا ہے

نظر مجرم ہے، پر لوثِ ہوس کے
تمہارے دعویٔ باطل میں کیا ہے

دعا کر وہ ملیں خود، ورنہ حسرت
تری اس سعیٔ بے حاصل میں کیا ہے

۹ر فروری ۱۹۴۱ء جہازِ رحمانی

ہر سمت مری چشمِ تمنا نگراں ہے
معلوم نہیں جلوۂ جانانہ کہاں ہے

شاید یہ وہی ہے جو مرے شوقِ نظر کے
باطن میں تو موجود ہے ظاہر میں نہاں ہے

۴۴ عاشق جسے کہتا ہے محبت کا فریضہ
بدعت کا اُسی چیز یہ زاہد کو گماں ہے

کونین کی راحت سے بھی زنہار جو بدلے
دل دردِ محبت کا ترے مرتبہ داں ہے

حسرت کا دل آئینہ ہے اک صورتِ حق کا
گو اس کی نظر شیفتۂ حسنِ بتاں ہے

۱۹ر ستمبر ۱۹۴۱ء (کانپور)

جب سوا میرے نہ تھا، کوئی نشانہ تیرا
یاد ہے مجھ کو ابھی تک وہ زمانہ تیرا

پا کے وہ گرم نظر مجھ کو سرِ عرشِ جہاز
کبھی چھپنا تو کبھی پھر نظر آنا تیرا

میرے اصرار پہ وہ ہاتھ چھڑا کر آخر
دستخط آپ سے اُردو میں بنانا

کجِ ادائی کے لئے شوق کو ٹھہرانہ ہوس
مجھ سے کچھ خوب نہیں ہے یہ بہانہ

رامِ اخلاص نہو، جن کی مروّت حسرت
کیا قیامت ہے دل ایسوں سے لگانا تیرا

۲۲ر نومبر ۱۹۴۱ء (کانپور)

قیمت مے کہ یہ پیمانۂ جاں ہے ساقی
کون کہتا ہے کہ یہ نرخ گراں ہے سا

للہ الحمد، کہ رندوں میں علی الرّغمِ حسود
سکّۂ فیضِ ترا اب بھی رواں ہے سا

تشنہ کامانِ مئے ناب ہیں، جاں برلبِ شوق
کرم اب بھی نہیں دشوار، کہاں ہے س

تو نے رکھ دی تھی، جہاں جبین کے ہم سے بوتل
روحِ مستی اُسی جانب نگراں ہے س

دل ہے کس مے کا طلبگار خدا ہی جانے
کیا ہمیں سے ہے کہ بے نام و نشاں ہے س

محتسب کی دُشنی ہے نہ سُنے گا حسرت
کہ وہ میخوار ترا مرتبہ داں ہے، ساقی

(جہازِ رحمانی) Upper deck ۵۱

ساغر نظامی

انعکاسات

غرقابیِ تقدیر ہے جب، پھر دل کو ہراساں کون کرے
کشتی کشتی کون پکارے، طوفاں طوفاں کون کرے

وحشت میں اک وقفے کے اسرارِ نمایاں کون کرے
داماں ٹکڑے ٹکڑے کر کے، داماں داماں کون کرے

کون جگائے کلیوں کو پھولوں کو پریشاں کون کرے
صبح سویرے گلشن میں توہینِ بہاراں کون کرے

الفت کی مجبوری کو اس درجہ ارزاں کون کرے
لے دے کر اک مشکل ہے اب اسکو آساں کون کرے

مشکل مشکل سب کہتے ہیں، جیسے اُن کی مشکل ہو
دیکھیں ان تن آسانوں میں مشکل آساں کون کرے

۴۵

طوفان ہے اور اُس کا تکبّر دریا ہے اور اس کا غرور
سب کچھ بے اندازہ ہے، اندازۂ طوفاں کون کرے

چارہ گرو کپڑے کی خاطر، سرِ وحشت کیوں کھولیں
چاک ہوا، سو چاک ہوا، اب ذکرِ گریباں کون کرے

پہلے زباں کہتی ہے اُن سے دل کی بپتا نظریں
دیکھیں اُن کی محفل میں یہ کارِ نمایاں کون کرے

جان سی پڑ جائیگی ابھی ان مردہ مردہ پھولوں میں
صبح سویرے نکہتِ گل پران کو خراماں کون کرے

لے گیا کوئی چھین کے وہ شے، جس سے تن من گاتے تھے
تو ہی بتا اے تلخیِ غم، ساغرؔ کو غزلخواں کون کرے

(اٹارسی سے حیدرآباد تک ریل میں۔ ۸؍جون ۱۹۴۲ء)

ایشیا۔ اگست ۱۹۴۲ء

دو غزلیں

آخری آنسو

تم جو جاتے ہو تو حسرت کو مٹاتے جاؤ
خاک میں عہدِ تمنّا کو ملاتے جاؤ

روشنی یہ بھی رہے کیوں مرے غم خانے میں؟
شمعِ امید جو باقی ہے بجھاتے جاؤ

بھول جاؤ کہ کوئی عہد کیا تھا تم نے
اب مروّت کی ہر اک رسم اٹھاتے جاؤ

ہم بھی خود حال نہ اب دیکھ سکیں گے دل کا
جا رہے ہو تو ذرا شمع بجھاتے جاؤ

ہوش بھی ساتھ لئے جاؤ جو تم جاتے ہو
آج اک جام مجھے اور پلاتے جاؤ

تم نے جس نغمہ سے بیدار کیا تھا غم کو
پھر وہی نغمۂ غم آج سناتے جاؤ

دل تڑپنے کا تو ساماں کئے جاتے ہو
دل کی تسکین کی صورت بھی بتاتے جاؤ

یہ بھی اک داغ رہے گا دلِ ویراں کیلئے
میری حالت پہ نہ تم اشک بہاتے جاؤ

جاؤ جاؤ کہ یہی تھا صلۂ عہدِ وفا
جاؤ جاؤ مجھے رو رو کے رلاتے جاؤ

جا کے آنے کا یہ وعدہ جو کیا ہے تم نے
جانِ حسرت کی قسم آج بھی کھاتے جاؤ

حسرت ترمذی - بی - اے - ایل ایل بی

فکرِ عالی

عطا جب اس نے مجھے دردِ ہجر فرمایا
الم نے رقص کیا عشق وجد میں آیا

ترے فراق میں ایسا بھی ایک وقت آیا
کہ دل نے بارِ مصائب پہ ناز فرمایا

ترا بذاتِ خود آنا تو اور ہی شے ہے
ترا خیال بھی آیا تو کیف بار آیا

ہمیں نے راہِ محبّت کو طے کیا ورنہ
قدم قدم پہ تمہارے کرم نے بہکایا

جہاں نہ قدرِ محبت نہ احترامِ وفا
وفورِ شوق مجھے کس جہاں میں لے آیا

الٰہی خیر وہ ہے التفات پر مائل
نشیب آئے تو آئے فراز بھی آیا

بُرا کیا کہ سنی آپ نے نہ عرضِ عدو
کہاں کہاں سے تو الفاظ ڈھونڈ کر لایا

وہ تیرے غم کو بھلا کیسے جان لیں عالیؔ
ابھی تک ان کو کوئی سانحہ بھی پیش آیا

جمیل الدین احمد عالی

مخدوم محی الدین حیدرآبادی

ستارے

جاؤ جاؤ چھپ جاؤ ستارو
جاؤ جاؤ تم چھپ جاؤ
رات رات بھر جاگ جاگ کر کس کو گیت سناتے ہو
چپ چپ رہ کر جھل مل جھل مل کس بھاشا میں گاتے ہو
جاؤ جاؤ ——

رات اندھیری کالی کالی، کس سج دھج سے آئی ہے
میرا کیا ہے، میں سودائی، تاروں کی رسوائی ہے
جاؤ جاؤ ——

ہم جس نگری میں رہتے ہیں، وہ نگری کیا دیکھو گے
ہم جس بستی میں بستے ہیں، وہ بستی کیا دیکھو گے
جاؤ جاؤ ——

آپ تن آسان راج دلارے، میں وحشی طوفان بدوش
میری دنیا، میلِ مسلسل، آپ کی دنیا سیلِ خموش
جاؤ جاؤ۔ چھپ جاؤ ستارو
جاؤ جاؤ تم چھپ جاؤ

ایشیا۔ اگست ۱۹۴۲ء

خورشید الاسلام بی۔ اے (علیگ)

شکست

شگوفے کھل رہے تھے، وقت بھی دم لیکے چلتا تھا
سپیدہ آسماں کی مُہرِ پستاں سے اُبلتا تھا

ستارے سے رواں تھے، طائروں کی نغمہ کاری میں
چھپی بیٹھی تھی خوشبو لالۂ و گل کی عماری میں

فلک پہ کچھ لجائی سی کہیں، ابرک کی نیّا تھی
کنول کے پھول میں بہتی ہوئی بزمِ ثریّا تھی

خیالوں میں مجھے یاقوت کی مینا نظر آئی
بہت کرنیں لئے تصویرِ آئینہ نظر آئی

شعاعِ اوّلیں نے بڑھ کے چوما عشقِ پیچاں کو
شراب رنگ لے کر بہ گئی تختِ سلیماں کو

مری تخئیل کی اک جست نے پرویں کو شرمایا
فضا نے بادۂ انگور ہو کر، کیف برسایا

عجب آئینہ خانہ تھا عجب جلوہ گری دیکھی
غبارِ گردشِ فانوس میں بھی ساحری دیکھی

جبیں میں ذوقِ سجدہ اس طرح جھوما بہار آئی
اُدھر اک زمزمہ اُٹّھا، ادھر صوتِ ہزار آئی

معاً، بلقیس کے رُخ سے نقابِ یاسمن اُٹھا
لئے فردوس پلکوں پہ، ہر اک نقشِ چمن اُٹھا

یہ جی چاہا کہ میں بھی حُسن کے قدموں پہ جھک جاؤں
فلک کی آسیا بھی رُک گئی ہے میں بھی رُک جاؤں

ندا آئی کہ اے حُسنِ مجازی کے تمنّائی
نہ تجھ میں اُوس کی ٹھنڈک، نہ تجھ میں گُل کی رعنائی

تجھے ہے نقص کا احساس، یاں ہر نقش آبی ہے
نہیں قربِ جمال اچھا کہ یہ عالم سرابی ہے

پشیماں ہوں میں اپنے شوق کی پرواز سے اب بھی
لرز جاتا ہے دل گو حُسن کی آواز سے اب بھی

نئی کہانی

نئی کہانی

جذباتی کیڑے — سڑک — شام — بیگم

انسانی زندگی نفسیاتی الجھنوں کی ایک نہ بوجھی جانے والی پہیلی نہیں تو کیا ہے۔ !؟ ورنہ فطرت کہیں تو محدود ہوتی! ؟ کیسی نیرنگیوں، اسرار اور تضادوں سے معمور ہے یہ ہماری دنیا، اور اس دنیا کے بسنے والے اور ان بسنے والوں کے گوشت و پوست کے اندر چھپا ہوا اک لامتناہی جہان!! اس اسرار اور طلسم پر قابو پانے کیلئے انسانی عقل و خرد نے سر توڑ کوشش کی مگر اس کے معمولی سے بھید کو بھی نہ پا سکے۔

پرانے داستان گو اپنی اپنی کہہ کر فسانہ ہو گئے، اب "نئی کہانی" کہنے والوں کی باری ہے، یہ کہانی سنانا چاہتے ہیں گزرے ہوؤں سے آزاد ہو کر، ان کے الفاظ میں تکلفات نہیں، شکوہ نہیں، طنطنہ نہیں، مگر سادگی ہے، صداقت ہے اور جستجو کی چنگاری ہے، بیباک چنگاری جو سننے والوں سے ٹکراتی اور روشنی بکھیرنے میں کوئی تکلف نہیں کرتی۔

یہ زندگی کی اوڑھنی میں جواہر ٹانک کر اس کو وزنی اور تیرہ و تار نہیں کرتے بلکہ کھلی فضا اور نسیمی ماحول میں لا کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندگی کا بھید پا جانا چاہتے ہیں۔

سچ ہے، قدیم اطالوی بت تراشوں کی طرح، ان نئے حسن کاروں کا مقصد بھی اک آزاد مشاہدہ ہے، یہ کائنات بھر کو پس منظر بنا کر آدمی کے ہارنے اور عریاں ہونے کا منظر پیش کرنا چاہتے ہیں، مگر پانڈو کی طرح یہ بے حیا بیت نہیں لکھتے۔ آزاد اور متجسس فضا میں یہ زندگی کو اس کے حقیقی خد و خال میں دیکھنا اور دکھانا چاہتے ہیں۔

کیسے نظر باز ہیں، یہ نئے لوگ۔ ان نئی کہانی کہنے والوں میں سب ہی نئے ہیں، مدھوسودن، پرتھوی ناتھ شرما اور رام پرتاپ۔

ہر کہانی کہنے والا زندگی سے بہت قریب ہے، اتنا قریب کہ وہ اس کے چہرہ پر آتے جاتے ہوئے مختلف رنگ بھی دیکھ سکتا ہے اور اس کے دل کی دھڑکن بھی سن سکتا ہے، مدھوسودن کی کہانی کا پلاٹ پریوں کی ان دیکھی ذہن سے لیا ہوا نہیں بلکہ ہمارے ہی روزمرہ کے اعمال کا ایک پہلو ہے، اس کے کردار وہی چلتے پھرتے سائے ہیں جو صبح و شام ہمارے گرد گھومتے رہتے ہیں اور اس کا اسلوب بیان سادہ اور لوچدار ہے۔

مدھوسودن کی کہانیوں کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا نفسیاتی تجزیہ ہے، وہ نفسیات میں اتنا گہرا جاتا ہے کہ اس کے بعد اس کی آنکھیں دھوکا نہیں کھاتیں اور جو محسوس کرتا ہے اس پر مسکراتا ہوا ایک ہلکے سے طنز کے پردہ میں لپیٹ کر اپنے خیـ دنیا سے باہر پھینک دیتا ہے، کچھ دیکھنے والے اس پر کڑھتے ہیں، کچھ دانت ہیں اور کچھ محض دل مسوس کر رہ جاتے ہیں، ہمارے گرد اس سماج کے گند میں اکثر جذباتی کیڑے کلبلاتے رہتے ہیں، پرتھوی ناتھ شرما کی بول چال طرح شگفتہ، خوشبو کی طرح فرحت زا اور شاخوں کی طرح لچکیلی ہے، "سڑک" پر کی اتنی بڑی حقیقت بیان کرنے میں بیباک ہیں، جنسی بھوک مطلق بھوک سے زندگی کی تکان کو حسن و محبت کی لوری بھی نہیں اتار سکتی، ترغیبات دل پیدا ہوتے اور رہتے ہیں مگر ہمارا سفر برابر جاری رہتا ہے۔

رام پرتاپ کی شام انوکھی ہوتی ہے، ان کی عادت ہے، ریت میں سے چاندی اور مٹی ہیرا نکالنے کی، زندگی کے عمومی مناظر میں سماجی و سیاسی مسائل اور مخصوص نفسی نتا تخم ریزی کرتے ہیں، نفسیات کی رفتار اور تاثرات کی پیہم دھڑکنوں میں ان کی کہانی عروج شروع ہوتا ہے اور ہمیں سمجھ داری کی دنیا میں تنہا چھوڑ کر دھندلا پڑ جاتا ہے، طنز کے گہرے چھینٹے رنگ اور بھی گہرا کر دیتے ہیں۔ ان کی شکنتلا جینتی کے آگے ہیچ شرما کی چھائی ہوئی تصوریت جینتی کی خالق ہے، وہ بلا خوف ایک جہاں سوز سرائے جیسی عام جگہ بھیج دیتے ہیں، جینتی کا مصنف شکنتلا کے مصنف کے مقا زیادہ شاعر ہے، اور عجیب بات یہ ہے کہ زیادہ اخلاقی بھی ہے، اس کے مسافر چٹان سے ٹکرا کر بھی شیشہ ہی رہتا ہے، لیکن اس کی زبان اور زبان کی ہوئی کامل افسانویت مشکل ہی سے ان باتوں کی طرف توجہ کرنے دیتی۔

رام پرتاپ زندگی کی جزئیات میں اس قدر گم ہوتا ہے کہ وہ ہماری محسوس دیکھی ہوئی چیزوں کا (جن میں ہمارے لئے کوئی روحانیت نہیں، مثلاً گاندھی، جواہر لال، کانگریس وغیرہ) ذکر ضرور کرتا ہے، اس کی کہانی میں ایک سوچنے والا دماغ اور بہنے والا دل دھڑکتا ہے، رہی زبان، سو مجبوری ہے، کے افسانہ نگار اردو کی بندش، ترتیب اور الفاظ کے جانے بوجھے محلات کو لکھتے ہی لکھتے لکھیں گے۔

جینتی اور شکنتلا کے ساتھ "بیگم" بھی کچھ کم نہیں، یہ چیخوف ایک مختصر کہانی ہے، جسے مسعود زاہدی نے ترجمہ کیا ہے۔

ساغر

وسودن

جذباتی کیڑے

صبح جب وہ اٹھا تو دن چڑھ آیا تھا۔ اور دھوپ کی زرد کرنیں
ں کے شیشوں سے آکر اُس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ پیپل کی نوزائیدہ
ڑکی پر جھکی ہوئی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے ہل رہی ہے اور شکنتلا
کی ہوئی اُس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اچانک اُس نے مُنہ پھیر لیا اور
نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ سردی آج پھر زیادہ تھی۔ برابر کے مکان
ہنے والے پنڈت جی۔ جو پنڈت بھی تھے اور کلرک بھی اپنی پوجا ختم
، تھے اور اب وہ گھنٹی بجا بجا کر آرتی کر رہے تھے۔ اور اُن کا بڑا لڑکا
ی خانے میں "پیا ملن کو جانا" گا رہا تھا۔ اس کے اونچے اونچے بے ہنگم
ڈت جی کی گھنٹی کی آواز کو مغلوب کئے جانے تھے۔ اسے گانا بھی
ں آتا۔ نریندر نے سوچا، لیکن یہ پنڈت جی پیا ملن کو جانا کیوں نہیں
کیا پنڈت جی —— لیکن وہ آگے نہ سوچ سکا۔ پنڈت جی کی
ختم ہو چکی تھی۔ اور اب وہ اپنے بیٹے پر برس رہے تھے ——
ش، آوارہ، پیا ملن کو جانے کا بچّہ، بے شرم، شرم نہیں آتی تجھے، ماں
بہن، سب کے سامنے الاپنے لگتا ہے، بیہودہ، بدتمیز.....

پنڈت جی بہت دیر تک کچھ کچھ کہتے رہے اور نریندر کی سمجھ میں آگیا
ت جی پیا ملن کو جانا کیوں نہیں گاتے۔ اس نے سوچا کہ شاید پنڈت
گنا نا نہیں چاہتے اور پیا ملن کو جانا اونچی آواز میں نہیں گایا جا سکتا
محبوب سے ملنے تو چھپ کر جایا جاتا ہے جیسے چوری کرتے ہوں اور
کے ارادہ کا اعلان اتنے زور سے تھوڑا ہی کیا جاتا ہے، اُس نے
کہ پنڈت جی اپنے لڑکے کو ٹھیک ہی ڈانٹ رہے ہیں ورنہ خواہ مخواہ
ں دن کسی پیا کے ساتھ پکڑا جائیگا اور پیا کے بھائی، رشتہ دار اور
الے جوتے مار مار کر اس کا بھوم نکال دیں گے۔ لیکن پیا ملن کو جانا
—— اور اُسے پھر شکنتلا کا خیال آگیا۔

شکنتلا کو کل اُس نے اُس چوک کے اوپر کھڑکی میں دیکھا تھا یہ چوک
بہت بڑے مکان کا عقبی صحن تھا جس کی کھڑکیاں ادھر کھلتی تھیں۔
ڑے سے پیپل کے درخت نے اس صحن پر سایہ کر رکھا تھا اور اُس کی
شاخ کل اس کھڑکی پر جھکی ہوئی تھی۔ شکنتلا کل اسی کھڑکی میں اُسے
تھی۔ یوں تو وہ شکنتلا کو مدتوں سے دیکھتا چلا آیا تھا لیکن کل وہ
اپنے چند ہم عمر دوستوں کے ساتھ جو اسی محلّہ کے باشندے تھے صحن میں
کھڑا ہوا بچّوں کو کھیلتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اسی دوران میں جب اس نے
اپنے ایک ساتھی کو کئی بار چھُپی چھُپی نظروں سے اوپر دیکھتے ہوئے دیکھا
تو اس کی نظر آپ ہی آپ اوپر چلی گئی —— پیپل کی نوزائیدہ شاخ
کھڑکی پر جھکی ہوئی تھی۔ اب وہ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے ہل رہی
تھی۔ کھڑکی میں سے جھکی ہوئی چند لڑکیاں نیچے جھانک رہی تھیں۔ اور اُن
کے درمیان اُس نے شکنتلا کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا تھا۔

نریندر کو اُوپر دیکھتا ہوا دیکھ کر شکنتلا نے مُنہ پھیر لیا تھا لیکن اتنی
سی بات نے کہ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی، اس کے جذبات میں ایک
شدیدہ حرکت پیدا کر دی، خوشی، تجسّس، اور ایک بے نام سے جذبہ کی
عجیب سی لہر اور ایک اجنبی سا احساس برتری، غیر شعوری، غیر محسوس۔

51 جنسی فاقہ پرستی کرتے کرتے اُس کی حِس اب بہت نازک ہو گئی
تھی۔ ذرا ذرا سی بات اس کے جذبات کو بھڑکا دیتی تھی۔ کوئی عورت یونہی
سرسری نظر سے بھی دیکھ لیتی تو اُسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ خصوصاً اس سے
متوجہ ہے۔ وہ محبت کرنا چاہتا تھا لیکن اُسے کسی ایسی لڑکی سے محبت نہ
ہوتی تھی جو التفات نہ کرے۔ اس کا تخیل بار بار اُسے فریب دیتا تھا کسی
بھی لڑکی کے ایک بار غور سے دیکھ لینے پر وہ سوچتا تھا کہ یہ مجھے پسند کرتی
ہے اور صرف یہ احساس ہی اُس کے دل میں اس لڑکی کے لئے محبت پیدا
کر دیتا۔ شدید جذباتی محبت، لیکن لمحاتی۔ کیونکہ اس کے تخیل کا فریب
زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہتا تھا۔ اور اُسے جلدی ہی اپنی غلطی کا احساس
ہو جاتا۔ اور وہ سوچتا کہ کیا لڑکیاں محبت کرنا نہیں چاہتیں۔

شکنتلا اس وقت اس کی طرف دیکھ رہی تھی اس نے غیر شعوری
طور پر اپنے ہاتھ پتلون کی جیب سے نکال کر اپنے سینہ سے باندھ لیے
اور واضح حرکتوں کے ساتھ بلند آواز میں اپنے دوستوں سے باتیں کرنے لگا
اسے بات بات میں ہنسی آنے لگی اور اُس نے اپنے دوستوں کو چھیڑنا شروع
کر دیا۔ اُس نے اُن پر بلند آواز میں فقرے بھی کسے تھے۔ شاید شکنتلا نے
انھیں سُنا ہو۔ ان سب باتوں کے دوران میں اُسے صرف یہی احساس
رہا کہ وہ میری باتوں کو سُن رہی ہے، مجھے دیکھ رہی ہے۔ کئی بار اُسے

خواہش ہوئی کہ اوپر دیکھے، لیکن ہر بار اُس نے اس خواہش کو اپنے سینہ میں دبا دیا تھا ایسا نہ ہو کہ اُسے اوپر دیکھتا ہوا دیکھ کر وہ پھر منہ نہ پھیر لے اس سے اچھا تو یہی ہے کہ وہ ہی اُسے دیکھتی رہے۔

اور رات وہ بہت دیر تک سوچتا رہا تھا کہ آخر وہ اُسے کیوں دیکھ رہی تھی اور پھر اس کے اوپر دیکھ لینے پر اُس نے مُنہ کیوں پھیر لیا کئی بار اُسے خیال آیا بھی کہ شاید وہ مجھے نہ دیکھ رہی ہو لیکن اس کا دل یہ ماننے کو تیار نہ ہوتا تھا۔ اور وہ سوچتا کہ وہ ضرور مجھے دیکھ رہی تھی ورنہ ..

...... ورنہ وہ مُنہ کیوں پھیر لیتی۔ ضرور وہ میرے اچانک اوپر دیکھ لینے پر گھبرا گئی ہوگی، بچاری شکنتلا! اور اُس کی آنکھوں میں شکنتلا کا چہرہ پھر گیا اور اُسے یاد آیا کہ اُس کی آنکھیں نیلی ہیں، جن میں آسمان کی لامحدود نیلاہٹوں کی وسعت ہے اور سمندر کے وسیع پانیوں کی سی گہرائی شکنتلا اگر پھنس گئی تو؟ آخر وہ اس کی طرف کیوں دیکھ رہی تھی۔ ضرور پھنس جائیگی اور اُس نے سوچا کہ کس طرح وہ سکول جاتے وقت اُس سے بات کرے گا لیکن اگر کسی نے دیکھ لیا تو؟ اُس کے بھائی نے یا کسی اور محلّہ والے نے...... لیکن پھر اُسے خیال آیا کہ اُس نے سکول جانا چھوڑ دیا ہے اور شاید وہ اب کے میٹرک کا پرائیویٹ امتحان دے رہی ہے۔ اچھا تو وہ اُس سے اُس اندھیارے چھتے میں ہی بات کر لیگا۔ اگر اس کا سکول جانا چھڑا دیا گیا ہے تو کیا گھر سے باہر نکلنا بھی بند کر دیا گیا ہوگا۔ لیکن بات کوئی ایک سیکنڈ میں تو ہو ہی نہیں جاتی، اس نے سوچا اور زیادہ دیر تک بات کرنے میں کیا پتہ کوئی دیکھ لے! اچھا تو وہ اُسے ایک محبت بھرا خط لکھ دیگا اور وہ خط وہ خود ہی اُسے دیگا۔ کیونکہ کسی دوسری طرح پہنچانے میں کیا معلوم کوئی پڑھ لے اور یہ بھید کھل جائے

...... یہ بھید! ...... وہ بہت دیر تک یوں ہی سوچتا رہا تھا اور آنے والے عشق کی تفصیلات میں ڈوبا رہا تھا۔ نیند آتی ہی نہ تھی شکنتلا، شکنتلا، شکنتلا! وہ مختلف شکلوں میں اُس کی آنکھوں کے سامنے آجاتی تھی، بند آنکھوں کے آگے تیرتے ہوئے سُرخ، نیلے، پیلے دھارے بار بار شکنتلا کی شکل اختیار کر لیتے تھے۔ اور شکنتلا کی مبہم سی تصویروں میں اُس کی آنکھیں ہی واضح ہوتیں، نیلی آنکھیں

...... اور یہی سوچتے سوچتے خواب اور بیداری کی حدوں کے درمیان لیٹے ہوئے اُس نے محسوس کیا تھا کہ وہ شکنتلا سے محبت کرتا ہے!

وہ شکنتلا سے محبت کرنے لگا تھا کیونکہ شکنتلا کل اُسے دیکھ رہی تھی! لیکن آج کھڑکی سُنسان تھی۔ ہوا بند تھی اور پیپل کے پتے خاموش کھڑکی کو سُنسان دیکھ کر نریندر کو ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کا دل

اچانک دھڑکتے دھڑکتے رُک گیا ہے اور آہستہ آہستہ ڈوبتا جا رہا ہے۔ لیکن اُس کی یہ اُمید کہ شکنتلا ہر وقت کھڑکی میں بیٹھی رہے محض ایک آرزوئے خام تھی۔ کیونکہ آخر وہ ایک شریف خاندان کی لڑکی تھی۔ اسے گھر کے بہتیرے کام تھے، کبھی کبھی کھانا بنانا، اپنے چھوٹے بھائی کا سوئٹر بُننا، شاید اپنے جہیز کے لئے کچھ سینا پرونا، کاڑھنا یوں ایک فضول سی بات کے لئے وہ آخر کب تک کھڑکی میں بیٹھی رہتی۔ بیاہتی بھی جب بھی یہ ناممکن تھا۔ لیکن نریندر بچارا کیا کرتا، وہ ان تمام باتوں کو کیسے سوچتا، وہ تو مجبور تھا۔ بچارہ۔ خدا خدا کر کے تو ایک لڑکی نے نگاہ کرم کی تھی، وہ بھی دوسرے ہی دن سے یوں بے پروائی برتنے لگے تو اس کے دل کو کیسے دھکّا نہ لگتا۔ اور اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا دل آہستہ آہستہ ڈوبتا جا رہا ہے۔ وہ اشانتی جو کل تک اُس نے محسوس نہ کی تھی آج اس کھڑکی کو سنسان دیکھ کر اس کی رُوح میں پھیل گئی تھی۔

بہت دیر تک وہ وہاں ٹہلتا رہا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ وہاں سے ہٹ جائے۔ شاید وہ ذرا ٹھہر کر آجائے۔ وہ پانچ منٹ گزر گئے پھر دس منٹ اور اب اس طرح یہاں اکیلے ٹہلتا رہنا بظاہر بے معنی تھا اور اُس کے دل کے کسی نامعلوم گوشہ میں بیٹھا ہوا کوئی چور بار بار اُس سے کہتا تھا کہ اس طرح یہاں دیکھ کر ہر شخص یہی سوچیگا کہ تم آخر اس کھڑکی کے نیچے اکیلے کیوں ٹہل رہے ہو۔ اور کیا پتہ اسے اس بات کا شبہ ہو جائے۔ وہ یہ نہ چاہتا تھا کہ اگر کسی کو معلوم ہو گیا بھی تو اس کے متعلق شک بھی ہو۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر کسی کو معلوم ہو گیا تو بنی بنائی بات بگڑ جائے گی۔ کیا معلوم کوئی اس کی ہی شکایت کر دے یا اور اگر شکنتلا کے گھر کسی کو معلوم ہو گیا تو کیا جانے اُسے سخت سُست کہنے کے بعد اس کھڑکی کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند کر دئے جائیں امید کی یہ جھلملاتی ہوئی کرن پھر اسے تاریکی میں کھو جائے!۔

اُسے بات بات میں اس راز کے فاش ہو جانے کا ڈر تھا۔ وہ اس کے نتیجہ سے خوفزدہ تھا۔ جس ماحول میں وہ رہتا تھا وہاں محبت کو ہمیشہ ایک عیب خیال کیا جاتا تھا۔ وہاں پنڈت جی اپنے لڑکے کو پیا ملن کی خواہش کے غیر شعوری اظہار پر بدمعاش اور آوارہ کہا کرتے تھے۔ یہ ایک کلرکوں کا محلّہ تھا۔ یوں تو اس میں دو کاندار بھی شامل تھے اور اسی قسم کے دوسرے لوگ بھی اور شکنتلا کے والد بزرگوار تو ایک وکیل تھے لیکن کلرکوں اور دوکانداروں وغیرہ کی روح کچھ ایک سی ہوتی ہے، یہ سب اپنی عورتوں کو ترسانے ...

سفر کراتے ہیں اور اپنی لڑکیوں کا تیرہ سال کی ہونے پر سکول جانا چھڑا دیتے ہیں۔ خود شکنتلا بھی اب میٹرک کا پرائیویٹ امتحان دے رہی تھی اور اُسے کھڑکی میں سے اپنی طرف دیکھتے دیکھ کر نریندر کو اُس سے محبت ہوگئی تھی۔ اس تمام ڈر کے باوجود کہ کوئی اس محبت کے بارے میں جان نہ لے وہ شکنتلا سے محبت کرنے سے باز نہ رہ سکا بلکہ اس ڈر کی وجہ سے اُسکی محبت شدید ہوتی گئی۔ وہ کچھ کہہ نہ سکتا تھا اور وہ محبت اُسکے دل میں اُس زہریلے دھوئیں کی طرح پھیلتی جا رہی تھی جسے باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔ اس زہر نے اُس کی خوشی کو تحلیل کر دیا لیکن اس محبت نے اُسے مضمحل کر دیا۔ ایک بوجھ سا ہر وقت اُسکے دل پر موجود رہتا اور اس بار کے زیر اثر اُس کا اونچی آواز میں بولنے کو بھی جی نہ چاہتا اُسکے دل میں ہر وقت ایک سنسنی سی رہتی جیسے اُسکی تمام رگیں ایک اداس اور بوجھل نغمے سے جھنجھنا رہی ہوں۔ لیکن جب وہ شکنتلا کو دیکھتا تو وہ نغمہ رک سا جاتا اور جب شکنتلا کے چہرے پر ایک مبہم سی مسکراہٹ آتی اور وہ اپنا سر جھکا لیتی یا پیپل کے پتوں میں شور مچاتی ہوئی چڑیوں کو دیکھنے لگتی تو اُسے محسوس ہوتا کہ کھڑکی کی سلاخیں غائب ہوگئی ہیں اور شکنتلا اُسکے بہت قریب ہے اور وہ اُسے چھونے کیلئے بیتاب ہو جاتا لیکن یہ محض اُس کا وہم ہوتا۔ سلاخیں کھڑکی میں اُسی طرح جڑی ہوتیں اور اب شکنتلا ایک ٹک اُسکی طرف دیکھتی ہوتی۔ اُسکی آنکھوں میں ایک حسین سی چمک ہوتی جیسے نیلی جھیل پر صبح کاذب کا عکس۔

اور وہ سوچتا کہ ایسا کیوں ہے کہ شکنتلا کی جوان روح کو زنگ آلود سلاخوں میں بند کر دیا گیا ہے اور ایسا کیوں ہے کہ وہ اُس سے بات بھی نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی زندگی میں ایک ایسا نسوانی پیکر چاہتا تھا جس میں ایک عورت کی روح ہو۔ جو اُسکے دل کی بے چین خلش کو مٹا دے اور اُسے سکون، شانتی اور مسکراتی زندگی بخش دے۔ شکنتلا میں اُسے امید کی ایک شعاع نظر آتی تھی جیسے تاریکی میں بھٹکے ہوئے مسافر کو ایک جھلملاتا ہوا چراغ۔ وہ اس چراغ کی طرف جا رہا تھا، چاہتا تھا کہ وہ چراغ اُس کی نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ وہ اُس کھڑکی کے قریب رہنے کے بہانے ڈھونڈتا، شکنتلا بازار جاتی تو وہ اُسکے انتظار میں دو نوں راستوں کے سنگم پر کھڑا رہتا تاکہ وہ اُسے قریب سے صرف دیکھ ہی سکے۔ وہ شکنتلا سے بات تو نہ کر سکتا تھا۔ اُس سے کچھ کہہ بھی نہ سکتا تھا لیکن وہ ہر اُس جگہ موجود ہونے کی کوشش کرتا جہاں وہ شکنتلا کو اور شکنتلا اُسے دیکھ سکے۔ وہ ایک بیکار آدمی کی طرح ہر وقت شکنتلا ہی کو دیکھنا چاہتا تھا، لیکن یہ نا ممکن تھا، شکنتلا اپنے 'قید خانے' سے باہر بھی جاتی تو وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکتا تھا کہ راستے پر اُس کا انتظار کرتا رہے کیونکہ دوسری حالت میں لوگ سوچتے کہ آخر اس طرح ساتھ ساتھ گھومنے کا مطلب کیا ہے؟ آخر بات کیا ہے؟ اگر شکنتلا مندر جاتی مندر جاتی تب تو وہ وہاں جا سکتا تھا، کیونکہ مندر پرماتما کا گھر ہے۔ وہاں ہری جنوں کے علاوہ ہر شخص جا سکتا ہے، چاہے شکنتلا کو دیکھنے ہی کیوں نہ جائے لیکن شکنتلا مندر نہ جاتی تھی بلکہ وہ اپنی ماں کے ساتھ اور اُسکی ماں چند اور عورتوں کے ساتھ کبھی کبھی ایک مہاتما کی کٹیا میں جاتی تھی کیونکہ پرماتما سے زیادہ مہاتماؤں کی عزت کی جاتی ہے۔ یہ بے اولادوں کو اولاد اور سٹے بازوں کو کامیاب 'ہندسے' دیتے ہیں۔

اُس روز مہاتما کی کٹیا میں کوئی خاص جشن تھا، اور نریندر کو معلوم تھا کہ آج وہ لوگ آئینگے اور وہ پہلے سے وہاں موجود تھا۔

شام سے آسمان پر مٹیالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ستارے غائب تھے اور غلیظ بادلوں نے آسمان کو ڈھک رکھا تھا۔ وہ لوگ ابھی آئے نہ تھے۔ اب تو مہاتما کے چیلوں نے گھنٹے بھی بجانا شروع کر دئے تھے۔ شاید آرتی کر رہے تھے اور باغ کے وسیع سناٹے میں گھنٹوں اور سنکھوں کی آواز فصیل کی رنگین دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر لوٹ رہی تھی۔ آج کٹیا میں زیادہ آدمی موجود تھے۔ آج مہاتما کے گھر ایک خاص جشن تھا لیکن وہ لوگ ابھی تک نہ آئے تھے۔ نریندر راستے کی طرف دیکھ رہا تھا مٹیالے بادل باغ کی جھاڑیوں والی دیوار سے پرے بورڈنگ ہاؤس پر جھکے ہوئے تھے اور بورڈنگ ہاؤس اندھیرے میں ایک پُر اسرار محل کی طرح نظر آ رہا تھا، سنسان، تاریک۔ جھاڑیوں کی دیوار کے درمیان سے سڑک کی اکا دُکا مدھم بتیاں نظر آ جاتی تھیں، اداس، خاموش کہرے میں پھنسی ہوئی۔ ٹہلتا ٹہلتا وہ کٹیا سے دور نکل آیا۔ سنکھوں کی آواز اب مدھم ہو گئی تھی۔ دور سے آ رہی تھی اور دور سے آتی ہوئی ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے وہ خود کوئی آواز نہ ہو، الگ گونج ہو۔ جو ختم ہونے میں نہ آتی ہو۔

وہ دیر تک گھاس پر ٹہلتا رہا۔ مہاتما کی کٹیا سے شکنتلا کے آنے کے راستے کی طرف ہوا میں گھاس اور نمی کی بو تھی۔ بورڈنگ ہاؤس کے طور پر ایک جگہ سے بادلوں کے کنارے روپہلی ہوگئے تھے، شاید چاند نکلنے کے قریب تھا۔ ایک ہلکی سی مبہم سفیدی باغ کے اندھیرے پر پھیل گئی تھی اور پیپل اور کھجور کے درخت واضح نظر آنے لگے تھے۔ اچانک اُس نے جھاڑیوں والی دیوار کے پیچھے عورتوں کے باتیں کرنے کی آواز سُنی، یہ شکنتلا ہی تھی، اور اُسکے دل کی حرکت جو

دیر سے مدھم ہو چکی تھی اچانک بڑھ گئی اور غیر محسوس خوشی کی ایک مضطرب لہر اُس کے دل میں اُتر کر سارے جسم میں پھیل گئی۔ جھاڑیوں کے پار بورڈنگ ہاؤس کے اوپر چاند آہستہ آہستہ نکل رہا تھا اور باغ کے اندھیرے پر روشنی پھیلتی جا رہی تھی۔ پھر وہ لوگ جھاڑیوں کے درمیان بنے ہوئے راستہ پر نمودار ہوئے اور جب وہ اُس کے قریب سے گزرے تو چاند پورا نکل آیا تھا۔ اور شکنتلا کا چہرہ چاند کی کرنوں میں روشن ہو اٹھا تھا لیکن وہ قریب سے باتیں کرتی ہوئی گزر گئی۔ شاید اُس نے نریندر کو دیکھا نہیں یا شاید پہچان نہ سکی۔ اور شکنتلا کو آگے جاتا ہوا دیکھتے ہوئے اُس نے سوچا کہ اُس کا یہاں آنا بالکل بیکار رہا، فضول، بے سود، اور اُس نے محسوس کیا کہ چاندنی پھیکی پڑ گئی ہے اور پیپل اور کھجور کے درخت تھک کر سو گئے ہیں۔ گھنٹوں اور سنکھوں کی آوازیں بند ہو چکی تھیں، آرتی ختم ہو گئی تھی۔ دیر تک کُٹیا سے مبہم آوازیں آتی رہیں۔ جیسے سُنسان کھنڈروں میں بھوت بولتے ہوں۔ اور یہ احساس کہ شکنتلا وہاں موجود ہے اُسے کُٹیا کے قریب لے گیا۔ گیس کی روشنی میں جٹا دھاری سادھو اپنے جسموں پر راکھ ملے بیٹھے تھے۔ اور ان میں سے ایک جس کی جٹائیں زیادہ گھنی تھیں کچھ کہہ رہا تھا۔ روشنی میں شکنتلا اُسے ایک دور دراز شے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ وہ لوگ سب کے بعد آئے تھے اور سب سے پیچھے بیٹھے تھے۔ شکنتلا باہر دیکھ رہی تھی جیسے اُسے مہاتما کے وعظ سے دلچسپی نہ ہو۔ باہر ایک موہوم سی سفیدی پھیلی ہوئی تھی اور درختوں کے سائے گہرے گہرے سیاہ دھبے معلوم ہوتے تھے سردی بڑھ گئی تھی لیکن نریندر نے اسے محسوس نہیں کیا۔ وہ کُٹیا کے قریب نمدار گھاس پر ٹہلتا رہا۔ پھر اُس نے شکنتلا کو گیس کی روشنی میں جمائی لیتے دیکھا جیسے وہ بیٹھے بیٹھے اُکتا گئی ہو۔ پھر وہ اُٹھی، نریندر کا دل دھڑکا اور وہ باہر آ گئی۔ باہر وہی اندھیرا تھا، فصیل کے قریب، جھاڑیوں کے پار چماروں کی جھونپڑیاں تھیں لیکن ان میں جلتے ہوئے چراغ اندھیرے کو دور نہ کر سکے تھے۔ سرِ شام ہی سے سب جگہ اندھیرا چھا گیا تھا۔ چماروں کی جھونپڑیوں کے قریب کہیں کتے بھونکے، پیپل کے درخت پر کوئی پرند پھڑ پھڑایا اور خاموشی چھا گئی۔ صرف اندر سے جٹا دھاری سادھو کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ اور وہ پھر اندر چلی گئی۔

بہت دیر بعد مہاتما کا وعظ ختم ہوا اور لوگ اُٹھنے لگے۔ لوگوں کو اُٹھتا ہوا دیکھ کر نریندر چل پڑا۔ وہ یہ نہ چاہتا تھا کہ شکنتلا کے ساتھ والے لوگ اُسے باغ میں دیکھیں۔ وہ اُن سے پہلے ہی بازار میں آ جانا چاہتا تھا بازار میں تو ہزاروں آدمی چلتے ہیں، وہاں اگر وہ اُنھیں مل گیا تو کوئی بات نہ ہو گی۔ کسی کو شک بھی نہ ہو گا کہ یہ ہماری وجہ سے یہاں پھر رہا ہے۔

تھوڑی دیر تک وہ بازار کے نکڑ پر کھڑا رہا۔ پان والے کی دوکان میں لگے ہوئے آئینہ میں اُسے اپنا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ اور وہ یہ دیکھ کر شرمندہ بھی ہوا اور متعجب بھی کہ اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں جیسے وہ ابھی ابھی کچھ چُرا کر بھاگا ہو یا چوری کرنا چاہتا ہو کچھ دیر بعد سامنے کی پگڈنڈی پر اُسے کچھ لوگ نظر آئے شکنتلا سب سے آگے تھی۔ اس کے ساتھ اس کی کوئی سہیلی بھی تھی جسے وہ پہلی بار دیکھ نہ سکا تھا۔ شاید انھوں نے اب بھی اُسے نہیں دیکھا اور وہ جلدی جلدی چل کر چند گز آگے آ گیا اور دو آنے والے سنیما کے پاس پہنچ کر اُس پٹڑی پر ہو گیا جس پر وہ لوگ تھے۔ اور آہستہ آہستہ جیسے اُسے کچھ پتہ ہی نہیں، اُس طرف چلنے لگا جدھر سے وہ لوگ آ رہے تھے دُور سے اُس نے دیکھا کہ شکنتلا نے اُسے دیکھ لیا ہے۔ اُس نے اپنی سہیلی سے کچھ کہا اور پھر وہ دونوں ہنس پڑیں۔ اب وہ قریب آ گئی تھیں نریندر رُک گیا اور اُس نے سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے رومال والے سے پوچھا — کیا سب رومال تین تین آنے کے ہیں؟ شکنتلا قریب سے گزری، اُس کے ہاتھ اُٹھے اور ایک شانے کے پیچھے میان میں رکتے ہوئے سر پر چلے گئے جیسے وہ بالوں کو ٹھیک کر رہی ہو نریندر کو ایسا معلوم ہوا جیسے شکنتلا نے اُسے نمستے کی ہے!

اور وہ نمستے اُس کے دل میں ایک ہنگامہ بپا کر گئی جیسے آہستہ آہستہ بہتی ہوئی ندی میں تیز آندھی سے پُرشور روانی پیدا ہو جائے جوں جوں وہ اُسے سوچتا رہا وہ نمستے اُس کے ذہن میں تیزی سے گردش کرنے لگی۔ یہ گردش تیز ہوتی گئی اور آہستہ آہستہ اس نمستے نے اس کے ذہن میں آواز اختیار کر لی —— نمستے، نمستے، نمستے!۔

اور رات بستر پر لیٹتے ہوئے وہ جس طرف کروٹ لیتا وہ اُٹھتے ہوئے ہاتھ اس کے سامنے آ جاتے۔ نمستے نمستے .... کروٹ بدلتا اور وہ نستے پھر سامنے آ جاتی ہے۔ اس نے شکنتلا کیلئے ایک خط لکھا وہ خط جو اُس نے پہلے ہی دن جب شکنتلا اس کی طرف دیکھ رہی تھی تو اُس کے نام لکھنے کو تھا۔ ایک خط ہی شکنتلا سے کچھ کہنے کا اکلوتا ذریعہ تھا! خط لکھنے کے بعد وہ بار بار اُسے دینے کا ارادہ کرتا، لیکن ہمّت نہ ہوتی تھی۔ اور اپنی اس کمزوری کے لئے وہ اپنے دل میں تاویلیں گھڑتا۔ کبھی خط دینے کا موقعہ کھو دینے کے بعد وہ سوچتا کہ اچھا ہی ہوا جو میں نے اس وقت کوشش نہ کی۔

دل کے سمجھانے کو وہ تین دن تک ایسی ہی باتیں سوچتا رہا۔ آخر

تیسرے دن اُس نے وہ خط دے دیا۔ شاید وہ اُس وقت بھی نہ دے سکتا لیکن رات وہ بہت دیر تک یہی سوچتا رہا تھا۔ اُس نے بستر پر بار بار کروٹیں بدلتے ہوئے کئی بار خود کو ملامت کی تھی۔ اور اُس وقت گلی سُنسان تھی۔ سناٹا سکوت۔ بچّے سکول گئے ہوئے تھے اور عورتیں چھتوں پر دھوپ لے رہی تھیں۔ گلی میں سے گزر کر وہ اپنے گھر جا رہی تھی جب وہ چھتّے میں پہنچی جہاں دن کے وقت بھی سرِ شام کا سا اندھیرا تھا تو نریندر نے جذبات اور گھبراہٹ سے بھاری آواز میں آہستہ سے پکارا ——— شکنتلا! شکنتلا نے گھوم کر دیکھا، اب وہ اُس کے قریب تھی، سناٹا گہرا ہو گیا تھا، اُس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، شکنتلا سہم گئی تھی، ایک لمحہ خاموش رہی، نریندر کچھ کہہ نہ سکا، اُس کی آواز حالات کی اجنبیت اور گھبراہٹ سے مغلوب ہو گئی۔ اُس نے وہ خط آگے بڑھا دیا۔ سہمی ہوئی آواز میں شکنتلا نے پوچھا ——— کس کا ہے؟ نریندر جواب نہ دے سکا، الفاظ اس کے دل میں گھوم کر رہ گئے۔ اُس کے سر پر کبوتر نے اپنے گھونسلے میں پر پھڑپھڑائے۔ اور اندھیرے چھتّے سے باہر نکل کر پھر سے اُڑ گیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ ایک طویل عرصہ کے بعد اُس نے ایک بھدّا سا جواب دیا ——— پڑھ لینا! اور گھبراہٹ میں وہ باہر نکل آیا۔

جب دل کی دھڑکن اصلی حالت پر آئی تو اُس نے محسوس کیا کہ اس کے اوپر سے ایک بھاری بوجھ اُتر گیا ہے لیکن یہ احساس صرف ایک لمحہ کیلئے تھا۔ دوسرے لمحہ اُس نے محسوس کیا کہ دل پر ایک فکر سا چھا گیا ہے ——— سہمی ہوئی آوازیں...... سناٹا...... دل کی تیز دھڑکن...... کس کا ہے...... کس کا ہے...... پڑھ لینا ——— اُس نے سوچا کہ پڑھنے کے بعد وہ کیا کرے گی اور اُس کے دل کی بے چینی بڑھ گئی، شاید وہ جواب دے، شاید وہ......

دن بھر اُسے بخار سا چڑھا رہا، رات نیند نہ آئی۔ زندگی میں پہلی بار اُس نے اتنی جسارت کی تھی اور اب وہ بے چین تھا، دل آہستہ آہستہ گھبراتا تھا، وہ تصویریں، وہ الفاظ اُس کے احساس کے گرد گھومتے جا رہے تھے، گھومتے جا رہے تھے ——— شکنتلا...... سہمی ہوئی آنکھیں..... سہمی ہوئی آواز...... کس کا ہے...... کس کا ہے..... کس کا ہے...... پڑھ لینا!......

ایک دن گزر گیا۔

دو دن

تین دن۔

تین دن تک شکنتلا کھڑکی میں نہ آئی۔ نریندر حیران تھا، حیران اور پریشان ——— چوتھے دن شکنتلا موجود تھی، لیکن نریندر کو دیکھ کر وہ اُٹھ کر چلی گئی۔ کھڑکی پر جھکی ہوئی پیپل کی نوزائیدہ شاخ اب وہاں موجود نہ تھی۔ شاید تیز ہواؤں کے جھکّڑ سے ٹوٹ گئی تھی۔ کھڑکی کی منڈیر پر ایک کبوتر پر پھیلائے ہوئے دھوپ لے رہا تھا۔ شکنتلا اُٹھ کر چلی گئی تھی اور آنے والے دنوں میں نریندر نے محسوس کیا کہ شکنتلا کا رویّہ بدل گیا ہے، اب وہ کھڑکی میں کم آتی تھی، ہوتی بھی تو نریندر کو دیکھ کر واپس چلی جاتی یا نیچے صحن میں دیکھنے کی بجائے مُنہ پھیر کر اندر کی طرف دیکھنے لگتی اور نریندر بیچارا سوچتا کہ آخر وہ کون سی بات ہے جس نے شکنتلا کو ناراض کر دیا ہے جس کی وجہ سے وہ اُس کے سامنے آنے سے بھی کتراتی ہے۔ اور جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تو اسے جاننے کی خواہش اُس کے دل میں اور بڑھ جاتی۔ اور آخر ایک دن اُس نے اپنی نامکمل محبت کی داستان اپنے ایک دوست کو سُنا ڈالی۔ اور سُن کر اس کی آواز چمک اٹھی جیسے اس کی امیدوں پر بھی سے ملمع کر دیا گیا ہو، اُس نے کہا۔

"پہلے شکنتلا مجھ سے محبت کرتی تھی، پرکاش سے محبت کرتی تھی راجندر سے محبت کرتی تھی اور آجکل وہ پنڈت جی سے محبت کرتی ہے، تم نے بتایا نہیں کہ تم بھی اس حلقہ میں آ چکے ہو۔ اب تم باتیں چھپانے بہت لگے ہو۔ اس طرح تو نئی شادی شدہ لڑکیاں اپنے حمل کو بھی نہیں چھُپاتیں۔"

"لیکن اب تو میں نے تمہیں بتا دیا، خدا کے لئے بتاؤ تو سہی تمہارے ساتھ کیا ہُوا؟"

"ہوا کیا، کچھ بھی نہیں ہوا، دراصل کچھ ہونے سے پہلے ہی سب کچھ ہو گیا۔ تمہیں پچھلی ہولی کے دن یاد ہیں، ضرور ہوں گے، تم کہہ رہے تھے کہ پچھلی ہولی کو تم نے رجنی کے رخساروں کو ہاتھ لگایا تھا اور اس نے کچھ نہیں کہا تھا، ایسی باتیں تم بھول سکتے ہو بھلا، خیر تو اچھی طرح بھیگنے کے بعد میں اوپر دھوپ میں کپڑے سُکھا رہا تھا۔ نیچے صحن میں بہت شور و غل تھا، اوپر سورج بہت تنگ کر رہا تھا۔ بار بار چہرے کے سامنے آ جاتا تھا، جیسے میرے چہرہ کا نشانہ باندھ رہا ہو۔ بہت دیر بعد میری سمجھ میں آیا کہ یہ چمک سورج کی نہ تھی بلکہ شکنتلا اپنی چھت پر شیشے کو اس طرح چمکا رہی تھی کہ اس کا عکس بار بار میرے چہرے پر پڑتا تھا۔ وہ اکیلی نہ تھی۔ بلکہ سرو جیتی بھی اس کے ساتھ تھی۔ اور جب میں نے اُن کی طرف دیکھا تو وہ مُنہ پھیر کر ہنسنے لگیں۔ سمجھے میاں، میں تمہارے جیسا بدھو نہیں تھا کہ شکنتلا

۵۵

کی شرارت کو نہ سمجھتا۔ اور پھر اُس کے بعد تو مجھے اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ شکنتلا ما بدولت پر عاشق ہو گئی ہے۔ اور کیا عاشق ہو گئی ہی سمجھو۔ میں اوم کے گھر جا کر آواز دیتا تو شکنتلا کھڑکی میں آجاتی اور جتنی دیر میں اوم کے کمرے میں بیٹھا رہتا وہ کھڑکی کے کواڑ کی آڑ میں کھڑی رہتی یا کھڑکی میں بیٹھ کر باتصویر رسالے پڑھتی، خود میں نے کئی بار اسے رسالے بھجوائے۔ اور جب وہ واپس آتے تو ان پر کئی کئی جگہ شکنتلا کا نام لکھا ہوتا۔ سمجھتے ہو میاں، کسی دوسرے کی کتاب پر اپنا نام لکھنا کیا معنے رکھتا ہے۔ خیر تو مطلب یہ کہ شکنتلا، شکنتلا ہو گئی تھی اور آخر ایک دن جیسا کہ تم نے کہا وہ گلی میں جا رہی تھی۔ تم تو بیوقوف ہو، میں نے تمہاری طرح عقب سے آواز نہیں دی، میرے تو وہ سامنے تھی، میں نے کہا شکنتلا —— بس میں اتنا ہی کہہ سکا۔ نہ جانے کہاں سے وکیل صاحب نکل آئے تھے انھیں دیکھ کر میں نے کہا —— شکنتلا سُنا ہے تمہارا تاریخ کا پرچہ آؤٹ ہو گیا ہے، کیا تمہیں معلوم ہے؟" شکنتلا نے جواب نہیں دیا۔ وہ تو بالکل سہم گئی تھی، وکیل صاحب بولے، اسے کیا معلوم ہو گا، تم سے کس نے کہا ہے، اور آجکل تو امتحان بھی نہیں ہو رہے۔ واقعی مجھے خیال نہیں رہا تھا کہ آجکل امتحان نہیں ہو رہے لیکن شکنتلا اس وقت تک آگے جا چکی تھی اور اس کے بعد میں نے دن میں بیس بیس مرتبہ اوم کو جا کر آواز دی لیکن شکنتلا کھڑکی میں نہ آئی۔ بیس دن میں دس دس گھنٹہ اوم کے کمرہ میں بیٹھا رہا۔ شکنتلا اوّل تو آتی ہی نہ تھی اور اگر آتی بھی تو مجھے دیکھ کر واپس چلی جاتی تھی، جیسے غلطی سے ادھر آگئی ہو آخر میں نے صبر کر لیا اور سوچ لیا کہ لنگوٹی باندھوں گا، کھجوریں کھاؤں گا، بکری کا دودھ پیئوں گا اور تکلی پھرایا کروں گا۔

ایسا ہی پرکاش کے ساتھ بھی ہوا، اُس بچارے نے بھی تمہاری طرح خط دیا تھا۔ یاد رکھو کبھی کسی کو اس طرح خط نہ دیا کرو، زبانی بات ہونی چاہیئے، یہی زیادہ محفوظ ہے لیکن تم سب سے زیادہ ڈرپوک راجندر تھا بہت دن تک بچاری شکنتلا نیلی آنکھوں سے چھُپی چھُپی نظروں سے اُسے دیکھتی رہی لیکن اس بیوقوف کا سر ہی نہ اُٹھا، وہ ہمیشہ عورتوں کی طرح شرماتا ہی رہا۔ پھر تم آگئے اور آجکل شکنتلا پنڈت جی سے محبت کرتی ہے۔"

"پنڈت جی کون، روپ چند؟"

"ہاں وہی سُفید چوہا، تم نے آجکل دیکھا ہو گا کہ پنڈت جی صحن میں بہت نظر آتے ہیں، اس کے علاوہ دوپہر کو کالج سے آنے کے بعد جب پنڈت جی اپنی بیٹھک میں بیٹھے ہوتے ہیں تو چھتے کے دروازہ میں آکر شکنتلا اپنی چھوٹی بہن کو آواز دیتی ہے —— کُسم! کُسم!! اور کُسم بیٹھک میں سے نکل آتی ہے، یعنی پنڈت جی اپنی بیٹھک کے دروازہ پر آکر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر شکنتلا کھڑی رہتی ہے پھر جب کسی کے آنے کی آہٹ ہوتی ہے تو واپس چلی جاتی ہے۔۔۔۔"

تھوڑی دیر ٹھہر کر وہ کہنے لگا —— "عجیب عادت ہے یہ اس کی کہ پہلے تو شروعات کرتی ہے اور پھر جب بات کچھ بننے لگتی ہے تو الگ ہو جاتی ہے، کیا چاہتی ہے آخر یہ، عجیب عادت ہے —— شاید ——"

لیکن اس نے بات پوری نہ کی اور بہت دیر خاموش رہا۔ پارک کی فضا پر سناٹا چھا گیا تھا، چاند گورنمنٹ کلرکوں کے کوارٹروں کے پیچھے ڈوب رہا تھا اور سڑک کے ایک طرف کی بتیاں بُجھ گئی تھیں نریندر بہت دیر تک پچھلی باتوں کو سوچتا رہا اور اس کی آنکھوں میں شکنتلا کا سلاخوں میں بند چہرہ   پھرنے لگا، نیلی آنکھیں، سڈول بازو، حسین سینہ، شباب جاگا ہوا، سرکش۔

اچانک سناٹے میں حرکت پیدا ہو گئی۔ چارکول کی سخت اور سیاہ سڑک پر ایک تانگہ خاموشی پر ہتھوڑے مارتا ہوا گزر گیا، پھر نچلے طبقہ کے دو نوجوان "مچلی پہ نجریا جائے" گاتے ہوئے گزر گئے اور ایک تلخ لہجے میں وہ کہنے لگا —— وہ خود کو محبّت کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی، وہ محبّت کرنا چاہتی ہے مگر کر نہیں سکتی، اس میں ہمّت نہیں، وہ ڈرتی ہے کہ بات بڑھ جانے پر کسی کو معلوم نہ ہو جائے ہم نہ محبّت کر سکتے ہیں نہ عیّاشی اور وہ محبّت کرنا چاہتی ہے، سُنتے ہو، وہ محبّت کرنا چاہتی ہے اور کر نہیں سکتی ——"

لیکن نریندر نے شاید سُنا نہیں، کہنے لگا "لیکن کبھی کبھی کھڑکی کو بند دیکھ کر مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں اب بھی اُس سے محبّت کرتا ہوں۔"

پرتھوی ناتھ شرما

سڑک

تھکا پیاسا۔ سوکھے ہونٹ، مرجھایا چہرہ۔ وہ چلتے چلتے ہار سا گیا۔ اُس کی دونوں پنڈلیاں درد کے مارے اکڑی جا رہی تھیں، وہ شیشم کے سایہ میں تھوڑی دیر کیلئے رُکا۔ زمین سے اُٹھی ہوئی جڑ پر بیٹھ گیا۔ ستھنے کو گھٹنوں تک سرکایا اور دونوں ہاتھ سے پنڈلیوں کو دابنے لگا۔ ملا۔ سراہا لیکن درد ہر لمحہ، ہر ساعت فزوں ہونے لگا۔ آٹھ دس میل صرف آج وہ اتنا ہی فاصلہ طے کر پایا اور اس کی پنڈلیاں جواب دیتی معلوم ہوتی تھیں جب پنڈلیوں کو دبانے، مسلنے اور ملنے سے کچھ درد کی شدت میں کمی نہ ہوئی تو اُسے بہت غصہ آیا، وہ مٹھی بنا کر بے تحاشہ اُن تھکی ہوئی پنڈلیوں پر مارنے لگا۔ ایک، دو، تین نہ معلوم کتنی، لیکن پھر بھی پنڈلیاں تھکاوٹ کا احساس سنبھالے معلوم ہوتی تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف کچی پٹڑی تھی۔ پیلی پیلی ریت، اور کہیں کہیں کالی کالی مٹی کے ٹینس کے گیند کے برابر ڈھیلے، ہوا چلتی اور باریک ریت اُڑنے لگتی، بار بار مسافر نے اُن ریت کے باریک ذرات کو حملہ آور دیکھ کر اپنی آنکھ کو ڈھانپ ڈھانپ لیا، اور وہ ذرات اُس کی نیلی دھاری والی قمیض سے چپٹ چپٹ کر رہ جاتے یا کھلی ہوئی پنڈلیوں سے۔ پنڈلیوں کا درد، سڑک کی ویرانی اور تھکن سے مجبور ہو کر اُس نے اپنی مختصر سی پوٹلی کو کھولا، اور گاڑھے کی چادر بچھا کر لیٹ رہا۔ اُسے امید تھی کہ شاید نیند کی آغوش میں تھکن اور پنڈلیوں کا درد کافور ہو جائیں گے۔ نیند، اُس نے کئی دفعہ سونے کی کوشش کی ہے مگر نہ سو سکا سڑک کے کنارے شیشم کے سایوں میں لطیف ہوا چلتی ہے، امن اور آشتی کی سلطنت ہے، بار بار سونے کا ارادہ کر کے لیٹتا تھا مگر نہ سو سکا، اور آج پھر وہ اُسی تجربہ کو دُہرا رہا تھا۔ آنکھ جھپکی۔ بند ہوئی۔ لطافت، پاکیزگی، خواب اور میٹھے میٹھے خیالات، تمنائیں، آشائیں، اور زندگی کا غیر مرئی احساس بالکل لطیف احساس اور اُسے اُمید ہوئی کہ وہ ضرور سو سکیگا۔ آنکھ بند کئے لیٹا رہا۔ اُس نے کچھ قدموں کی چاپ سُنی، لیکن وہ ایک دم سُنائی دینی بند ہوگئی، بالکل ناممکن بات۔ راہگیر اتنی جلدی سڑک سے غائب تو نہ ہو جائیں گے۔ سونے کیلئے لیٹا تھا، پھر آنکھ کھلتا اُٹھ کھڑا ہوا، سایہ میں دو آدمی بیٹھے سستا رہے تھے۔

”کہاں جا رہے ہو۔ جی“

”کہیں نہیں۔ ذرا سستانے کیلئے بیٹھ گئے۔ تم سوتے سوتے کیوں اُٹھ بیٹھے۔ نیند نہیں آتی؟“

”یوں ہی۔ مجھے دن میں بالکل نیند نہیں آتی۔ کوشش البتہ ضرور کر لیتا ہوں۔ آس پاس میں کوئی سرائے ہو تو بتاؤ۔ دس بارہ میل کا سفر اور طے کرنا تھا۔ . . . . . . آٹھ دس میل پرے لاری مجھے چھوڑ گئی تھی۔ اس سڑک پر لاریاں نہیں چلتی اس لئے سوچا چلو پیدل ہی چلا چلوں۔ بیس میل کا سفر۔“

”اِکّا یا بیل گاڑی ہی کرایہ پر لے لیتے؟“

”لے تو لیتا۔ مگر میں آج پیدل سفر کرنے کے ارادہ سے چلا تھا بیس میل طے کرنے میں مشکل سے پانچ گھنٹہ لگتے ہیں لیکن اب پاؤں جواب دیتے معلوم ہوتے ہیں۔ بچپن میں تو خیر نہیں لیکن سکول کے زمانہ میں اپنے گاؤں سے روز چھ میل پرے پڑھنے جایا کرتا تھا اور واپس آتا تھا۔ پندرہ بیس میل کا سفر معمولی بات تھی۔۔۔“

نو واردوں نے تھوڑی دیر مسافر کی طرف دیکھا۔ ایک نے سر کھجایا دوسرے نے لُٹیا ڈور کی طرف دیکھا پھر اُن میں سے ایک بولا۔

”اس سڑک کے کنارے کنارے چلے جاؤ۔ ڈیڑھ کوس نہیں ایک کوس پرے ایک ٹوٹی پھوٹی سرائے ہے۔ بہت پُرانی سرائے ہے۔ اُس میں چلے جاؤ بھیا۔“

”اچھا“ مسافر کپڑے جھاڑتا ہوا اُٹھا۔ اپنی پوٹلی کو سنبھالا۔ اور چلنا شروع کر دیا۔ اُس کی پنڈلیاں شاید بغاوت کرتے کرتے تنگ آ چکی تھیں۔ لہذا مسافر اپنے آپ کو بہت ہلکا سا سمجھنے لگا۔ بالکل ہلکا۔ وہ تھکن سب کافور ہو چلی تھی۔ سرائے میں قیام کرنے کے بعد رہی سہی تھکن بھی اُتر جائیگی۔ سرائے والا لیگا ہی کیا۔ ایک دو دقت کھانے کی اور ایک اکنّی چار پائی کا کرایہ۔ اور ساری رات آرام سے کٹ جائے گی اور صبح وہ پھر اپنے سفر کی تیاری میں مشغول ہو جائیگا۔ اس کے سامنے سڑک، پختہ سڑک کا ایک کوس لمبا فاصلہ تھا۔ اُسے اُمید تھی کہ وہ پنڈلیاں اتنے سفر کو طے کر سکیں گی۔ دن ڈھلنا شروع ہو گیا تھا۔ سڑک کے

دونوں طرف جوار باجرے کے کھیت تھے۔ جن کے اندر پکی ہوئی مٹھیاں تھیں۔ باجرے کی چھ چھ انچ لمبی پکی ہوئی بالیاں اور پودے، دن ڈھلتے وقت چلنے والی مخمور ہوا میں جھکولے کھا رہے تھے۔ اور ذرا شدّت کے جھونکے کے چلنے سے لچک سے جاتے تھے۔ بالکل کسی نازک بدن دوشیزہ کی لاغر کمر کی طرح۔ سائے بتدریج لمبے ہوتے جا رہے تھے اور دور زمین پر چھایا ہوا نیلا آسمان رنگ تبدیل کر رہا تھا۔ کچھ ہلکا سُرخ یا پھر ارغوانی یا پھر ایسا رنگ جو پیازی اور نیلے رنگ کی آمیزش سے بن جایا کرتا ہے۔ اُس کی خواہش ہوئی وہ آنے والی شفق کے سایہ میں پناہ لے کم از کم وہاں یہ سڑک، یہ پیلی ریت، اور ریاضت، زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے مشقت کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ اور اسی ریاضت کے پیچھے اُس کو یہ بیس میل سفر طے کرنا تھا۔ اُسے سڑک کے بیچوں بیچ چلنے میں ایک گونہ مسرت محسوس ہوئی، کیونکہ سڑک کے بیچ میں سے وہ آنے والی شفق کی دُلہن کے استقبال کی تیاریاں بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ پٹری پر درختوں کی آگے جُھکی ہوئی ٹہنیاں اس کی حدِّ نظر کو کاٹتی معلوم پڑتی تھیں۔ لہٰذا وہ سڑک کے سہارے سہارے جھومتے ہوئے کھیتوں، شام کو بسیرا کرنے کے لئے اپنے اپنے گھونسلوں کو واپس ہونے والے پرندوں کی موسیقی اور شفق کے انتظار میں گم ہو کر جھومتا سا مخمور قدم رکھنے لگا

کتنے آسان قدم، وہ زندگی بھر اس طرح سڑک کے بیچوں بیچ چلے جائے گا۔ بے خوف و خطر کتنی سیدھی صاف شفاف تھی وہ سڑک۔ اور مسافر کو نہایت پسند تھی۔ آہستہ آہستہ ایک ٹوٹی پھوٹی عمارت کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ ہو نہ ہو یہ وہی سرائے ہے۔ جہاں وہ آرام کرنے کیلئے ٹھیرے گا۔ اور اس کے قدموں میں ایک دم تیزی آگئی۔ وہ اُس شکستہ عمارت کے سامنے رُکا۔ سوچنے لگا کیا واقعی وہ سرائے کے سامنے کھڑا ہے۔ اجنبی کی جان کو سینکڑوں جوکھیں۔

"باجرے کے کھیتوں میں سے یکایک دو تین لڑکیاں ایک دیہاتی گیت گاتی ہوئی نکلیں۔ اُن کے ہاتھوں میں باجرے کی بالیاں تھیں اور وہ اُن کو بار بار نچا رہی تھیں۔ کبھی کبھی وہ اُن باجرے کی بالیوں کو ایک دوسرے کے گلابی رخساروں سے مس کر دیتیں۔ ایک چوٹ کھائی ہوئی لڑکی بلبلا اُٹھی۔

"اونہہ۔ بڑی آئی ہے بن کے۔ پرماتما کرے تجھے کسی موٹے کالے آدمی کے ساتھ باندھ دیا جائے۔ وہ تجھے بالکل ٹھیک کر دیگا۔"

"تو ایسی کونسی خوبصورت ہے۔ کیا چہرہ ہے۔ نخرے۔ چل اُتّی دن بھر تو کھیت میں مرتی ہے اور اب حور اور پری بنی جائے ہے......

......" دانت نکالتے مُنہ مسکاتے دوسری لڑکی بولی۔

"رہنے دو بہنا۔ لڑتی کیوں ہو۔ اپنے اپنے بھاگ......" تیسری ذرا سنجیدہ معلوم ہوتی تھی۔

مسافر نے اُن کی پُرلطف گفتگو کو سُنا۔ آگے بڑھا۔

"دیکھنا"

"کیا کہتے ہو مسافر"

"سرائے دیکھ رہا ہوں"

"تو کھڑا کہاں ہے۔ یہ دس پک پرے سرائے ہے۔ اور کیا ہے"

پہلی نے دوسری کی طرف دیکھا، دوسری نے تیسری کی طرف اور پھر تینوں ہنسنے لگیں۔ اور مُنہ میں اپنی اپنی اوڑھنی کے آنچل کو دبا کر انہوں نے ہنسی کو بہت ضبط کیا مگر نہ کر سکیں۔ اور ایک نے دوسری اور دوسری نے تیسری کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر بھاگنا شروع کر دیا۔ بے تحاشا، بے معنی

مسافر نے تعجب کی نگاہ سے دیکھا، اور پھر مُسکرا اُٹھا لیکن لڑکیاں بہت دور پہونچ چکی تھیں۔ جو اس مسکراہٹ کا جواب دیتیں۔

آگے بڑھا۔ ٹوٹی پھوٹی مگر پکی عمارت کے دروازہ کو کھٹ کھٹایا اور پھر اُس عمارت کا معائنہ کرنے لگا۔ انیسوی صدی کی بنی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

دروازہ کُھلا۔ ایک سولہ سالہ لڑکی نے باہر جھانکا۔

مسافر سکتہ میں رہ گیا۔ معاملہ کیا ہے۔ وہ گھبرا کیوں رہا ہے اُن لڑکیوں نے اس ہی عمارت کو تو سرائے بتایا تھا لیکن .....۔

"کہاں چلے مسافر"

"کہیں نہیں۔ سرائے ڈھونڈ رہا ہوں۔ کدھر ہے؟"

"یہی تو ہے۔ آؤ۔"

"اچھا" اس وقت اس کی پنڈلیاں پھر دوبارہ درد کرنے لگی تھیں۔ وگرنہ وہ چاندنی رات میں ہی اپنے سفر کو جاری رکھتا۔ اُس نے آگے بڑھنے کی کوشش بھی کی۔ مگر لڑکی برابر دروازہ پر ڈٹی رہی!

"آرہے ہو مسافر۔ یہ ہی سرائے ہے۔"

"اچھا آیا۔" ایک ایک قدم بھاری ہو رہا تھا۔ وہ چل نہیں رہا تھا۔ بلکہ ایک قدم کے بعد دوسرے کو گھسیٹ رہا تھا۔ ان وزنی قدموں کو کس طرح سنبھالے۔ خیر جوں توں کر کے دس بارہ قدم پورے کئے۔

"چلو مسافر"

"اس سرائے کی تم ہی مالک ہو؟" مسافر نے ہمّت کر کے پوچھا۔

"اونہہ ہوں۔ میرا باپ اس سرائے کا مالک ہے۔ وہ اندر صحن میں بیٹھا ہے۔ تم تھک گئے ہو مُسافر"

"ہاں جب ہی تو میں سرائے میں آیا۔ نہیں تو اپنا سفر جاری رکھتا۔"

وہ اُس پُرشباب شوخ و شنگ لڑکی کے ساتھ اندر گُھستا چلا گیا' کتنی خوبصورت' تمتماتے ہوئے رخسار' ٹیڑھی چتون، مسافر کو رہ رہ کر تعجب ہو رہا تھا کہ جنگل تو خیر نہیں مگر ویرانے میں بھی ایسا حُسن پھوٹتا ہے' پرورش پاتا ہے' اور کُھلی ہوئی فضا میں ہوا اور مینہ کے طوفان' زندگی کی کش مکش کے باوجود اُس کی تر و تازگی قائم رہتی ہے۔ وہ اُس حُسن سے کُچھ مسحور ہو چلا تھا اور کھویا سا جا رہا تھا۔

"ابّا مسافر کو کونسی کوٹھری میں ٹھیراؤں"؟

بوڑھے نے ناریل کے حُقّے کو گڑگڑاتے ہوئے جواب دیا۔

"ادھر آؤ مسافر۔ تم تھک گئے ہو۔ بیٹھ جاؤ۔ سرائے میں کمروں کی کمی نہیں۔ جُنّی جا وہ سامنے والی کوٹھری ٹھیک کر دے"۔

"تمہاری سرائے میں مُسافر کبھی کبھی آتے ہیں نا۔ آج کوئی اور مُسافر نہیں ٹھیرا"۔

"بہت کم۔ پُرانی سرائے ہے۔ آجکل زمانہ میں لوگ سرائے میں کم ہی ٹھیرتے ہیں۔ مہینوں میں کبھی کوئی بھولا بھٹکا آجاتا ہے بزرگوں کی نشانی ہے۔ ویسے کھیتی باڑی کا کام کرتا ہوں"۔

"جنّی! جنی!"

"ابّا۔ ابھی آئی"

لڑکی اپنے باپ کے پاس آئی۔

"ابّا کوٹھری ٹھیک کر دی"

"میں لیٹنا چاہتا ہوں۔ بہت تھک گیا ہوں"۔ اور بڑھتے ہوئے اندھیرے میں مسافر سرائے کے بوڑھے مالک کے دُھندلے نقوش دیکھ رہا تھا، اور یا ناریل کے حقّہ کی گڑگڑاہٹ کو سُن رہا تھا۔

"کھانا کب کھاؤ گے"

"یہ ہی دو گھنٹہ کے بعد"

"اچھا"

لڑکی نے بیچ بچی ہتھیلی میں سرسوں کے تیل کا دیا سنبھالا۔ اور کوٹھری کی طرف بڑھی۔ تھکا ماندہ مسافر پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ لڑکی نے کوٹھری کے آلے میں دیا رکھ دیا۔ مدھم روشنی پھیل گئی۔ مُسافر نے دیکھا کہ کوٹھری کی دیواریں پختہ ضرور ہیں مگر جگہ جگہ سے چونے نے کھسکنا شروع کر دیا ہے۔ کڑیوں میں مکڑیوں کے لا انتہا جالے اور ایک سوندھا سوندھا سا تعفن۔ معلوم ہوتا تھا کہ مدت سے کوٹھری کو کھولا نہیں گیا۔

جنّی دیے کے سایے میں بیٹھ رہی۔

"تم کہاں جاؤ گے مسافر"

"بارہ میل پرے، وہاں مجھے جا کر کچھ کام کرنا ہے۔ دو تین مہینہ کے بعد پھر اپنے وطن کو واپس چلا جاؤں گا"۔

مسافر کھاٹ پر لیٹ گیا۔ جنّی اُس دیے کے سایہ میں بیٹھی رہی دیے کی ہلکی پیلی روشنی میں جنّی کے رخسار سیب ایسی رنگت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ دُنبالہ دار آنکھیں، اور نازک کونپل ایسے ہونٹ۔ وہ اپنی پلکیں برابر جھپکے جا رہی تھی۔ مُسافر دزدیدہ نگاہوں سے اُس کا مطالعہ کر رہا تھا۔ گدرایا ہوا حُسن، سادہ مگر پُر رُعب جو ہر انسان پر اپنا تسلّط جما دے' خاموش بالکل خاموش جنّی بیٹھی بیٹھی تنکے سے کوٹھری کے فرش کو کریدنے لگی۔ اور اُس کی مرمریں کلائیاں' مُسافر کے دل میں کھبی جا رہی تھیں۔ مسافر کا دل نیچے اوپر ہونے لگا' کیوں نہ وہ زندگی بھر اس سرائے میں قیام کرے۔ جہاں جنّی ایسا زندگی کا اعلیٰ ترین نہیں خوبصورت ترین نمونہ پرورش پا رہا ہو۔ جنی برابر نگاہ جُھکائے تنکے سے کوٹھری کے فرش کو کرید رہی تھی۔ اور اُس کی چوڑیاں' پاس والے گاؤں کے منہیار کے ہاں تیار کی ہوئی کانچ کی چوڑیاں آپس میں ٹکرا کر ایک نہایت لطیف مگر سُریلی موسیقی پیدا کر رہی تھیں۔ جنّی کی نگاہیں بتہ دیتی تھیں کہ وہ مسافر سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔ مگر شاید اُس نے مُسافر کا تھکا ہوا چہرہ دیکھ کر صرف ایک ہی سوال پر اکتفا کیا۔

"جنّی وہاں بیٹھی کیا کر رہی ہے۔ مسافر کو آرام کر لینے دو۔ مسافر کو بھوکا مارنے کا ارادہ ہے کیا"؟

مُسافر کے پاس پوٹلی میں کھانا بندھا ہوا تھا۔ مگر وہ سوچنے لگا کہ پھر کبھی کام آئے گا۔ کم از کم اس بہانے جنّی پھر اُس کی کوٹھری میں آئیگی، جنّی کو دیکھنے کی تمنّا۔ معلوم کیوں اُس کے دماغ پر غلبہ پائے جا رہی تھی، اور شاید وہ اسی اُمید میں اُس کوٹھری میں لیٹا بھی رہا تھا۔ کیا مجال کوئی انسان وہاں ایک منٹ ٹھیر سکے۔ عجیب خوشبو سی کوٹھری کی فضا میں پھیلتی نظر آتی تھی۔ کُچھ ابخرات جیسے اُٹھتے معلوم ہوتے تھے۔ لیکن اس گھٹے گھٹے ماحول میں اُس نے سونا پسند کیا۔ اگر وہ چاہتا تو صحن میں اپنی کھاٹ بچھوا کر سو رہتا۔ مگر کس طرح وہ اور جُنّی سرائے کے مالک کی نگاہ سے بچ سکیں گے۔

گھنٹہ، دو گھنٹہ، نہ معلوم کتنے عرصہ تک مسافر سوتا رہا۔ کسی نے اُسے بُری طرح جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔ وہ آنکھ ملتا ہوا اُٹھا۔ جُنّی کھانا لئے کھڑی تھی۔

"اے! میں بہت تھک گیا تھا۔ اس لئے پڑ کر سو رہا۔ کھانا لائی ہو، رکھ دو"۔

مُسافر نے کھانا کھانا شروع کیا۔ جنّی دیے کے سایے میں بیٹھ رہی

دو گھنٹہ پہلے شگفتہ کلی اب کھلتی جا رہی تھی۔ چینی کی جاذبیت لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ اور دیے کی روشنی میں چینی کے چہرے پر اندھیرے اور اُجالے کے تاثرات ایک عجیب حُسن کی تشکیل کرتے معلوم دیتے تھے، قدیم یونان کی کسی خوبصورت دیوی کے نقوش وہ اُس وقت قطعی ایک پری بن گئی تھی۔ ایک تالاب میں کھلا ہوا کنول جس کو جتنی دیر دیکھا جائے اتنی اُسکی خوبصورتی میں اضافہ ہوتا جائے۔ ایک خوبصورت چیز کی تعریف ہی یہ ہے کہ اس کو جتنا پرکھا جائے اتنی ہی اس کی آب و تاب بڑھے۔ مسافر نے سرائے کے دروازہ پر چینی کو محض ایک لڑکی کے طور دیکھا۔ لیکن دروازہ والی وہ چینی اب حسین سے حسین تر ہوتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ دیے کے سایہ میں سُکڑی سُکڑائی، سمٹی سمٹائی، کچھ لجائی سی چینی مُسافر کے دل کے تاروں کو مضطرب کر رہی تھی۔ اور اُس کی نگاہ بار بار اُس حُسن ملیح کے جالے میں اُلجھ کر رہ جاتی۔

"مسافر اور کچھ چاہئے"

"چاہئے کیا۔ سب کچھ موجود ہے یہاں چینی۔ مجھے بہت آرام ہے یہاں۔ اور بھلا کس چیز کی ضرورت"

"ضرورت تو ہے۔ مگر......"

"مگر کیا ؟"

"کچھ نہیں، مجھے سونے دو۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔ یہ دیا بُجھاتی جانا۔" مسافر نے کھاٹ پر پڑے پڑے اپنے آپ کو اینٹھا دیتے ہوئے کہا۔ اُسے چینی کو دیکھتے دیکھتے نزاکت کا احساس ہونے لگا تھا، نازک چیز کو دیکھ کر نازک بننا ہی پڑتا ہے۔

چینی چلی گئی۔ "ضرورت تو ہے"۔ مسافر سوچنے لگا۔ اُسے اور کس بات کی ضرورت ہے۔ کھاٹ ہے سونے کے لئے، مکان کا سایہ ہے۔ کھانا وہ کھا ہی چکا ہے۔ اور نیند وہ جلدی یا دیر میں اُس پر غلبہ پا جائیگی اُسے اطمینان ہے، اور وہ فراغت کے خواب میں جلد ڈوب جائیگا۔ لیکن اُس نے دیکھا کہ دیا متواتر جلے جا رہا ہے، اور چھوٹے چھوٹے پتنگے اُس پر بے شمار تعداد میں قربان ہو رہے ہیں۔ ایک چھوٹے سے دیے کے اتنے عاشق اور چینی وہ بھی ایک دیا ہے۔ اور اس کے پروانے۔ جانے دو۔ بے مطلب باتوں کے چکر میں پڑنا فضول ہے۔ رات خاموش سے خاموش تر ہو چلی۔ صحن میں بیٹھے ہوئے سرائے کے مالک نے حقہ گڑگڑانا بند کر دیا۔ صرف کبھی کبھی بہت دور شاید اُن جوار اور باجرے کے کھیتوں سے پرے مجیروں کی مدھم مگر مست کن موسیقی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر سنائی دے جاتی تھی، مسافر کو دیے کے سایہ میں چینی کی شبیہ بنکر پھر ڈھلتی نظر آتی تھی۔ چینی کے نقوش مسافر کی آنکھوں میں اس قدر معکوس ہو چلے تھے کہ دیے کے سایہ میں اُس بیٹھی ہوئی چینی اور اس کے دلکش چہرے کا احساس رہ رہ کر جاگ رہا تھا۔ اعضا درد کے مارے تڑپ رہے تھے۔ پنڈلیوں نے پھر درد کرنا شروع کر دیا۔ اور نیند، وہ جلد ہی مسافر کو اپنے مسکن کا باشندہ بنانا چاہتی تھی مُسافر سویا، اور نہایت فراخدلی کے ساتھ، صبح جب بیدار ہوا تو مہرِ عالمتاب کافی نیصلہ طے کر چکا تھا، مسافر کی معصوم نگاہیں صاف بتا رہی تھیں کہ وہ بالکل اس بات سے بے خبر ہے کہ چینی رات کو دوبارہ مسافر کی کوٹھری میں آئی تھی اور چلی گئی تھی۔ شاید چینی کے لئے مسافر میں کوئی کشش تھی۔

مسافر چارپائی کو چھوڑ اُٹھ کھڑا ہوا۔ کوٹھری کے دروازے پر چینی نمودار ہوئی۔

"سوچکے مسافر۔ اب کیا ارادہ ہے؟"

"سفر جاری رکھنا چاہتا ہوں۔ ذرا پہر ڈھلے سے پہلے منزل پر پہنچ جاؤں گا۔"

"مسافر ایک دن تو اور ٹھہرتے۔ یہاں دیکھنے کیلئے بہت اچھی اچھی چیزیں ہیں۔" چینی کی نس نس مسافر سے درخواست کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

مسافر نے سوچا۔ اُسے جاتے ہی کام تھوڑے مل جائیگا۔ وہ تو وقت مقررہ سے دو تین دن پہلے سے چلا یا تھا تاکہ مالک خوش ہو جائے سرائے کے آس پاس، سرائے کے اندر قابل دید چیزیں بہت زیادہ تعداد میں تھیں اس میں شبہ ہی کیا ہے۔ سب سے زیادہ قابل دید چیز تو اُس کے سامنے ہی کھڑی تھی۔ مُسافر نے تھوڑی دیر سوچا۔ اور پھر۔

"اچھا کل چلے جائیں گے"

"تم بہت اچھے ہو مسافر" چینی نے اپنے چکیلے ہونٹوں کو نزاکت سے حرکت دیتے ہوئے کہا۔

سڑک کی اُس سمت، سرائے کے گرد و نواح میں دن ٹھیٹھا ہوا۔ مسافر سرائے کے مالک سے باتیں کرنے لگا۔ چینی بار بار لم ادھر سے اُدھر پھرتی پھراتی مسافر کی نگاہ کے سامنے آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سرائے کا بوڑھا مالک بڑا باتونی واقع ہوا تھا۔ وہ معنی بے معنی گفتگو کئے جا رہا تھا۔ اور سامنے رکھے ہوئے ناریل کے حقہ میں کبھی کبھی کش بھی لگا لیتا وہ کہتا کہ میری بیوی ایسی خوبصورت تھی۔ آس پاس کے دیہات میں اُس جیسی عورت چراغ لیکر ڈھونڈھنے سے بھی نہ مل سکتی تھی لیکن اُسے مرے ہوئے بارہ سال ہو گئے۔ اور چینی جب چار سال کا بچہ تھی مُسافر اِن باتوں

نہایت دلچسپی سے اور کان لگا کر سُن رہا تھا لیکن بوڑھا آدمی کسی کام کے لئے سرائے سے باہر نکلا اور گفتگو خاتمہ پر آئی۔

مسافر سرائے سے باہر نکلا۔ اور جوار باجرے کے کھیتوں کے سہارے سہارے چہل قدمی کرتے لگا۔ چنّی ایک باجرے کے کھیت میں سے نمودار ہوئی۔ اُس کے ہاتھ میں باجرے کی پکّی ہوئی دو بالیاں تھیں۔

"مسافر۔ یہ ہمارا ہی کھیت ہے۔ آگے چلو۔"

کچّی منڈیر تھی۔ اور آس پاس باجرے اور جوار کے کھیت، پانچ پانچ چھ چھ فٹ قد آدم پودوں نے اُس منڈیر کو کھیتوں کے سہارے سہارے چلنے والے راہگیروں کی نگاہوں سے چنّی اور مسافر کو اوجھل کر دیا۔ چنّی نے باجرے کی بالیوں کو اِدھر اُدھر پھینکنا شروع کیا۔ اور پھر وہ اُس کچّی منڈیر پر بیٹھ رہی۔

"بیٹھ جاؤ مُسافر"

"اچھا"

"مسافر" چنّی نے ایک بالی سے دوسری بالی کو ٹکرایا۔ اور سر کا پلّہ نیچے آ رہا۔ چنّی نے سر ڈھانپنے کی کوشش بھی نہ کی۔

"مُسافر تم بہت اچھے ہو۔ دل چاہتا ہے کہ تم اسی سرائے میں ٹھہر جاؤ۔"

"کیوں؟"

"کیوں؟ مُسافر تم کچھ نہیں سمجھتے۔ اتنے بڑے ہو چلے .....

اس ہوا کے چلنے سے میرے سر میں درد ہو جاتا ہے مُسافر"

ہوا میں برابر ہرے ہرے نازک پودے لہرا رہے تھے۔ اور مُسافر کے دیکھتے دیکھتے چنّی نے اپنے سر کو مسافر کے منڈیر کی ڈھلوان کے ساتھ ساتھ جُھکی ہوئی ٹانگوں پر رکھ دیا۔

"کیا بات ہے چنّی"

"سر میں درد ہے۔ اُف۔" چنّی نے سر کو اوپر اٹھا لیا۔ اُس نے مسافر کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈالدیں۔ مسافر کی آنکھوں میں حیرت کی جھلک نمایاں طور سے نظر آ رہی تھی۔

سرائے کے بوڑھے مالک نے پکارا "چنّی او چنّی۔ کدھر گئی"

"آئی ابا۔ مُسافر تم آگے بڑھ کر اور کھیتوں کی سیر کر آؤ۔"

مسافر اُس منڈیر کے سہارے سہارے کھیتوں کی وسعت کو چیرنے لگا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر چنّی اُس سے کیا کہنا چاہتی تھی۔ خیر اس الجھن میں پڑنے سے کیا حاصل۔ اب کی بار وہ اُس سے ٹھیک طور سے دریافت کر لیگا۔ آخر وہ چاہتی کیا ہے۔

دوپہر کے وقت چنّی مسافر کی کوٹھری میں کھانا لائی۔ اور مُسافر کے سامنے رکھ کر بیٹھ رہی۔ اُسی رات والے آلہ کے عین نیچے۔

خواہ مخواہ اس مرتبہ بھی چنّی کا پلّہ سر سے نیچے آ رہا۔ اور مسافر نے دیکھا کہ اس کی باریک کرتی کے پیچھے چُنّی کا سینہ نیچے سے اوپر ہو رہا ہے۔ چنّی پھر زمین پر تنکے سے بے معنی لکیریں کھینچنے میں مشغول ہو گئی۔

مُسافر تھوڑا تھوڑا سمجھنے لگا۔ سرائے کی کوٹھری اُسے کاٹ کھانے کو دوڑنے لگی۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ چنّی اس قدر آگے بڑھ جائیگی۔

کھانا کھانے سے فراغت پا کر مُسافر سرائے کے مالک کے پاس گیا پیسے چُکائے اور کوٹھری میں آ کر اپنا سامان درست کرنے لگا۔

چنّی پھر کسی بہانے کوٹھری میں نمودار ہوئی۔ اُس کے رخسار تمتما رہے تھے۔ کرتی کے بٹن ڈھیلے پڑ چلے تھے۔ دھوتی کا پلّہ کوٹھری کے دروازے کے اندر گھستے ہی سر سے آ رہا تھا۔ وہ مسافر کے عین نزدیک جا کر کھڑی ہو گئی مسافر کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ چنّی کے دل کی حرکت کی صدا تک کو سُن رہا ہے۔ اور خاموش بت کی طرح کھڑی ہوئی چنّی اُس سے پھر کچھ التجا کرنی چاہتی ہے۔

"مسافر" چنّی نے پوٹلی کو ہاتھ سے چھینتے ہوئے کہا۔ "آج کی رات اور ٹھیرو مُسافر" پوٹلی ہاتھ سے گر پڑی۔

اور مسافر نے دیکھا۔ کہ عین اُس کی نگاہ سے دو فٹ کی دُوری پہ چنّی کا سینہ دھڑک رہا ہے۔ اور اُس کی گوری گوری کلائیاں مایوسی اور نا اُمیدی کی ایک کشمکش میں ہیں۔

"چلدئے مسافر۔ پھر کبھی اس سرائے میں آؤ گے"

"کیا پتا۔ اس دُنیا کا حال کسی کو معلوم نہیں۔ آج کیا ہونے والا ہے، کل کیا ہوگا۔ اور مجھے تو اکثر یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ کل کیا ہوا تھا اچھا اَب ہم چلدے۔"

"مسافر تم جیسا بھولا آدمی اب تک اس سرائے میں نہیں آیا" چنّی نے کچھ غصہ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

مسافر کے سامنے اب وہی پکّی سڑک تھی۔ بارہ میل کا سفر طے کرنا تھا جتنے قدم آگے پڑتے تھے اتنے ہی قدم پیچھے سرائے بھاگی جا رہی تھی اور مسافر اُسے پیچھے چھوڑنا بھی چاہتا تھا۔ کبھی پٹری پر مٹی کے ڈھیلوں کو فٹ بال کے مانند لڑھکاتا، درختوں کی نیچے جُھکی ہوئی ٹہنیوں کو توڑتا کچّے۔ پتّوں کو خواہ مخواہ چباتا اور تھوکتا وہ آگے بڑھا چلا گیا۔ چھ میل کا سفر طے کرنے کے بعد پھر اُسے تھکن کا احساس دم بدم کم ہمتی کی طرف

راغب کرتے لگا۔ وہ سوچنے لگا آیا وہ سستائے یا سفر کو جاری رکھے۔ ہرج ہی کیا ہے شیشم کے سایوں کی سڑک پر کمی نہیں۔ اور اپنی پوٹلی سے چادر نکالی۔ اور زمین پر بچھا کر پھر لیٹ رہا۔

ایک آدمی کے سر پر صافہ، پاؤں میں دھوڑی اسنر کا جوتا اور دوسرا ننگے سر، ننگے پیر اُسی شیشم کے سائے میں آکر بیٹھ گئے۔

"کدھر جا رہے ہو جی؟"

"چھ میل پرے قصبہ میں جانا ہے، رات کو سرائے میں ٹھہر گیا تھا مگر سفر کی تھکن اب بھی نہیں اُتری۔"

سرائے کا نام سُنتے ہی نو واردوں کے چہروں کی رنگت بدلی۔

"اُسی سرائے میں جہاں ایک بوڑھا آدمی رہتا ہے اور اُس کی خوبصورت لڑکی؟"

"ہاں ہاں!" مسافر اُن دونوں آدمیوں کی طرف زیادہ متوجہ ہو گیا۔

"لڑکی تو بہت خوبصورت ہے صاحب۔ مگر۔۔۔۔"

"مگر کیا؟" مسافر نے حیرت سے پوچھا۔

"اجی اگلے سال وہ ایک مسافر کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ بوڑھے کو پتہ لگا۔ اور اپنے واقف نمبردار کا گھوڑا لے وہ اپنی لڑکی کی تلاش میں نکلا۔ پاس والے گاؤں میں کھلبلی مچ گئی۔ دن نکلنے میں دو گھنٹہ کی دیر ہو گی۔" پھر متکلم اپنے دوسرے ساتھی کی طرف دیکھنے لگا۔ "اور پھر وہ چنی کو پکڑ کر لے آیا۔"

"اور مسافر کا کیا ہوا؟"

"اجی اُس کا کیا قصور۔ وہ کہنے لگا کہ چنی اپنی مرضی سے اُس کے ساتھ آئی ہے۔ بوڑھے نے مسافر کو دو چار بات سُنا کر جانے دیا۔ بھیا جب اپنا پیسہ کھوٹا ہو تو پرکھنے والے کا کیا قصور۔۔۔۔۔ چنی سرائے کے سامنے ڈرتی سی آکر کھڑی ہو گئی۔ سرائے کے بوڑھے مالک نے سڑک پر شیشم کے درخت میں سے ایک بہت پتلی اور ہری ہری ڈنڈی کو توڑا۔ اور چنی کو اُس سُتی سُتائی ٹہنی سے پیٹنا شروع کیا۔ سارا گاؤں کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔"

"سرائے کے مالک نے اس کی شادی کیوں نہ کر دی؟"

مسافر کے اس سوال پر متکلم ہنسا۔

"بھیا شادی تو اس کی ہو چکی تھی مگر قسمت میں شادی کا سُکھ بھوگنا بھی ہو۔۔۔۔۔ بوڑھے سے لوگوں نے کہا دوسری شادی کر دے مگر وہ گردن ہلا کر کہہ دیتا ہے ہمارے خاندان میں بیوہ کی شادی کبھی نہیں ہوئی۔"

"اچھا ہم چلے۔ قصبہ چھ میل پرے ہے نا؟"

"ہاں۔ اتنی ہی دور ہو گا۔"

چنی مسافر کے ساتھ بھی تو بھاگنا چاہتی تھی نہیں اُس نے کم نہیں کہا کہ وہ اُسے اپنے ساتھ لے چلے مسافر کی خالی ہاتھ کی مٹھی غیرا[illegible] طور سے بھنچی سی جاتی تھی۔ اُسے سرائے کے بوڑھے مالک پر غصہ آرہا تھا اُسے چنی کی شادی کر دینی چاہیئے ورنہ پھر کسی دوسرے مسافر کے سا[تھ] بھاگنے کی کوشش کریگی۔ وہ مجبور تھا۔ اپنے گاؤں میں بیوی بچوں چھوڑ کر چلا تھا۔ جب وہ کمائی کر کے اپنے گھر واپس لوٹے گا تو بچے کو دیکھ کر پھولے نہ سمائیں گے، اور اُس کی بیوی اُس کی طرف دیکھے تو وہ اُس سے کہدے گا کہ اُس نے اپنی بیوی کی امانت کو کسی [کے] حوالہ نہیں کیا۔ اگر کر دیتا تو اچھا تھا۔ خیر شام بھی سر پر آرہی ہے سڑ[ک] بتدریج سایوں کے لپیٹ میں آکر اپنی چمک کو کھوئے دے رہی وہ شفق کے نظارے کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ شاید اس شوق نظا[رہ] وہ پھر کبھی کسی سرائے میں گم نہ ہو جائے۔ وہ سوچنے لگا کہ سڑک اتنی خاموش رہتی ہے۔ یہ سڑک بھی عجیب ہے۔ اُس نے زندگ[ی] ایسی سڑک نہیں دیکھی۔ چوبیس گھنٹہ متواتر مسلسل سوتی رہنے [والی] سرائے گیا۔ ۵ میل پرے رہ گئی، مسافر کو شام کے دھند[لکے] میں قصبہ کی پکی عمارتوں کے کالے کالے مٹے مٹے نقوش دکھائی لگے۔ چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اُسے مطلوبہ جگہ کا پتہ لگانے میں کچھ دیر لگے گی۔

پچیس منٹ کے بعد وہ سڑک کے خاتمہ پر پہنچ گیا دیہاتی نوجوان اپنی بیوی کے ساتھ قصبہ سے باہر نکلا۔ عورت نے ڈ[یڑھ ہاتھ] کا گھونگٹ نکال رکھا تھا۔ مسافر نے عورت کے سخت گورے ہاتھ [کی] طرف دیکھا جن میں سُرخ موٹی بھدی چوڑیاں کھنک رہی تھیں کہیں وہ نوجوان اُس عورت کو بھگا کر تو نہیں لیجا رہا؟

مسافر نے عجیب انداز سے گردن کو ہلایا، نہیں ایسا نہیں اور پھر سڑک کے عین خاتمہ پر پہونچکر مسافر نے بہت مدھم آواز [میں] اپنے آپ سے کہا۔

"کیا ہی اچھا ہو کہ چنی کسی مسافر کے ساتھ بھاگنے میں کامیاب [ہو جائے]" لیکن سڑک کے خاتمہ کے بعد قصبہ کی رتیلی اور پیروں تلے [آنے] والی سڑک پر قدم رکھتے ہی، مسافر کے دماغ سے سرائے، چنی کے سائے اور شفق کے نظارے کا خیال محو ہوتا چلا گیا۔

م پرتاپ بہادر ایم، اے

شام

چھٹی کا دن مجھے کچھ یوں بھی پسند نہیں، اور پھر آج تو صبح ہی
جی کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ دوپہر کو جب پچھم سے ہَوا دھول
ی ہوئی چلنے لگی تو میں ایسا محسوس کرنے لگا جیسے اُس کے ساتھ میرا
بھی اُڑ جائیگا۔ میں اس بات پر غور کرنے لگا کہ بسنت کے موسم میں جب
ھ ایسے میں شاعروں نے الفاظ کے پُل باندھ دئے ہیں ایسی تیز ہوا
ں بہتی ہے جو دل اور قلب دونوں کو ایک ساتھ چیر جاتی ہے۔ تیز
کے جھونکے میرے کمرے کی آمنے سامنے کی کھڑکیوں اور دروازوں
ٹوں میں سے سرسراتے ہوئے اور تیزی سے بجنے لگے، اور اس حالت
بیٹھا بیٹھا میں ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے بے رحم ہوا کے ساتھ میری
ل جیسے دل کی پنکھڑیاں منتشر ہو کر ایک ایک کرکے اُڑ جائیں گی۔
پہر کے بعد جیسے جیسے سورج پچھم کی جانب ڈھلنے لگا میرا دل بھی اس
ساتھ ساتھ ڈوبنے لگا۔ شام ہوتے ہوتے میں اتنا بے چین ہو گیا کہ اپنے
ر موسم کو دونوں کو کوس کر بھی تسکین نہ پا سکا۔ فضا پر شام کی ہلکی ہلکی
ب دیکھ کر آتی ہوئی رات کا خیال آیا، اور پھر اس خیال سے کہ رات
بے چین گھڑیاں کیسے کٹیں گی، میں بیقرار ہو گیا۔

کمرے سے باہر نکل کر کچھ دیر کھُلی چھت پر خالی الذہن ٹہلتا رہا
جب وہاں بھی قلب کو سکون نہ ملا تو کمرے میں داخل ہوا اور ریڈیو
ر اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ دھیرے دھیرے خبریں آنے لگیں
ں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس خیال کے آتے ہی کہ دُنیا میں بھی کچھ
ں ہو رہا ہے، اور ہر جگہ ایسی ہی کیفیت ہے شام اپنے سیاہ پنکھوں
نیچے میرا دل دبانے لگی۔ جب میری بے چینی قوتِ برداشت سے بڑھ
تو یوں ہی غیر ارادی طور پر میں مکان سے باہر نکل پڑا۔

باہر فٹ پاتھ پر مکان کے سامنے ٹہلتے ہوئے میں نے دیکھا کہ
ب کے دوسری طرف چوراہے کے پاس ایک آٹھ نو سال کا لڑکا ننگے
ں زمین پر بیٹھا تھا۔ اُس نے مجھے دیکھتے ہی کہا: "بابوجی پیسہ" بھیک
نے والے لڑکے کے ہنس مکھ چہرہ سے جیسے میرے شعور کو دھچکا سا لگا۔
فوراً یہ خیال پیدا ہوا کہ آیا یہ لڑکا مجھے پہلے سے جانتا ہے۔ لیکن میں نے
اُسے کبھی اس سے پہلے نہیں دیکھا۔ پیٹ پھلائے اپنی پتلی پتلی ٹانگیں
سڑک کے کنارے کی دھول میں گاڑے ہوئے وہ خاک کی ڈھیر کے پاس
بےخبر بیٹھا تھا۔ سامنے کچھ پھٹے پُرانے کپڑے اور چیتھڑے بھی پڑے تھے انھیں
چیتھڑوں پر کچھ مونگ پھلیاں بھی پڑی تھیں۔ ناک اور مُنہ سے بہتے ہوئے
نیٹے اور رال کو اُنھیں انگلیوں سے پونچھتا جاتا تھا جن سے مونگ پھلیاں
چھیل رہا تھا۔ لگ بھگ اُسی کی عمر کے کئی لڑکے اُسے گھیرے کھڑے تھے
جو اُسے چھیڑتے اور تنگ کرتے رہتے تھے۔

ٹہلتے ٹہلتے ایک بار پھر میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس نے
۷۳ اُسی طرح ہنستے ہوئے پیسہ مانگا۔ میں پریشان ہو کر سوچنے لگا: آخر اس
بچے میں کیا خرابی ہو سکتی ہے جو اس طرح سڑک پر پڑا بھیک مانگ رہا ہے
اُس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی تیز چمک تھی۔ بدن گورا تھا۔ لیکن
پھر بھی اُس گندگی کے ڈھیر پر بیٹھا بھیک مانگ رہا تھا۔ میں پھر یہ سمجھنے
کی کوشش کرنے لگا کہ آخر یہ لڑکا کیوں بھیک مانگ رہا ہے۔ اتنے میں
ایک شریر لڑکے نے اُس بیچارے کے سر پر ایک ٹیپ لگائی۔ بھیک
مانگنے والا لڑکا رونے لگا۔ میری نظر اُس کی طرف گئی۔ اُس کی تیز چمکتی
ہوئی آنکھیں آنسوؤں کی جھڑی کے پیچھے سے مجھے دیکھتے ہی مسکرائیں
اور اُس نے ایک گندے چیتھڑے سے آنکھیں پونچھتے ہوئے اُسی برجستگی
سے کہا: "بابوجی پیسہ"! کیا غضب کی شوخی اور شرارت تھی اُن آنکھوں
میں! اُس کی طرف سے مُنہ پھیرتے ہوئے میں سوچنے لگا۔ کیا اسے ابھی
بھیک مانگنا نہیں آتا؟ لیکن ایسا ہونہار لڑکا بھیک ہی کیوں مانگے؟
جیسے مجھے کسی نے چپت مار کر بتایا۔ لیکن کیا بھیک مانگنے کے لئے بھی کسی
خاص خارجی علامت کی ضرورت ہے! جب میں ان گتھیوں کو سُلجھا نہ سکا
اور وہاں ٹہلتے ہوئے اُس کی طرف بار بار دیکھنا بھی ناقابل برداشت
ہو گیا، تو "فٹ پاتھ" چھوڑ کر میں سڑک پر چلنے لگا۔ جاتے جاتے ایک بار
پھر میں نے اُس کی طرف مُڑ کر دیکھا۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے اُسی شوخ

اندازمیں تیز آواز سے پیسہ مانگا۔ اب میں اپنے قدموں کو روک نہ سکا اور اس سے جان بچا کر تیزی سے سڑک پر بھاگا جا رہا تھا۔ لیکن اب کی بار میں نے جو خاص بات اُس بچّہ میں دیکھی وہ اُس کے بدن کے نیچے کے حصہ میں ایک غیر معمولی قسم کی حرکت تھی۔ کمر سے نیچے کا حصّہ اس تیزی اور مقررہ طریقہ سے حرکت کر رہا تھا کہ مجھے شبہ ہوا کہ اُسے اندر ہی اندر جیسے کوئی خطرناک بیماری لاحق ہو گئی ہے۔

جب میں اپنے دوست کے مکان پر پہنچا تو وہ بھی کہیں جانے کے لئے تیار تھے، اُس کا نوکر تانگا لایا اور پھر ہم دونوں ساتھ ہی روانہ ہوئے معلوم نہیں ہم دونوں کہاں جا رہے تھے۔ میرے دوست نے تانگہ والے سے صرف یہی کہا کہ سیدھی سڑک سے چلو۔ رات ہو چلی تھی، لیکن اس شب کی تاریکی میں بھی اُس لڑکے کی مُسکراتی ہوئی چمکدار آنکھیں اور چہرہ ایک منٹ کے لئے میری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتا تھا۔ ہر طرف محلّوں میں سے ڈنکے کی آواز آ رہی تھی اور میں تانگہ پر چپ چاپ بیٹھا سوچ رہا تھا۔ محرّم ہے۔ اگر ڈنکے اور تاشے اتنے زور سے نہ پیٹے جائیں تو کیسے معلوم ہو کہ محرم کیا چیز ہے۔ بیچ شہر میں سے ہو کر میرا تانگہ گزر رہا تھا۔ بجلی کی روشنی ہوتے ہوئے بھی ہر طرف دھندلکا چھایا ہوا تھا۔ آسمان کا سارا
۴۴ دھنواں اور دھول ہوا نہ چلنے کی وجہ سے نیچے اُتر آیا تھا۔ آنکھوں میں دھنواں بُری طرح بھرا جا رہا تھا۔ بار بار یہی خیال آتا کہ اس گھنی بستی میں رہنے والے کس طرح جیتے ہیں۔ کیا اس ہوا میں وہ خطرناک کیڑے نہیں موجود ہوں گے جو جیسا کہ ڈاکٹروں کا کہنا ہے 'صحت' کے واسطے مضر ثابت ہوتے ہیں؟ تو پھر اس گندی ہوا میں ملا ہوا دھواں اور دھول پھانک کر ان سڑکوں کے کنارے بسنے والے کس طرح جیتے ہیں!

یک بیک تانگہ چوراہے پر رُک گیا۔ تانگہ والے نے کہا "بابوجی تانگا آگے نہیں جا سکتا۔ اس طرف سے جلوس آنے والا ہے۔ بتائیے کہاں جانا ہے؟" میرے دوست نے جواب دیا "مفتی گنج" اس نے وہیں سے تانگہ بائیں طرف کو موڑ لیا اور پھر اُسی تیز رفتار سے گھوڑا دوڑنے لگا۔ گھوڑے کے ساتھ میرے خیالات بھی دوڑنے لگے ——
کیا جلوس کے واسطے سڑک بند کر دینا ضروری ہے۔ رات کے وقت شہر کے بیچ سے جلوس نکالنے کی کیا ضرورت! ڈنکوں کی آواز سے کان پھٹے جا رہے تھے۔ اُنھیں مکانوں میں شاید کہیں کوئی بیمار ہوگا، کسی کے سر میں درد ہو رہا ہوگا، کوئی تپ دق میں مبتلا خون تھوکتا ہوگا اور کوئی اس دُنیا سے مُنہ موڑنے سے پہلے اپنی زندگی کا آخری پیغام ان ڈنکوں کی وجہ سے نہیں دے پا رہا ہوگا۔ زندگی اور موت کے درمیان یہ ڈنکے!

میرا تانگہ دوسرے چوراہے پر پہنچ چکا تھا۔ تانگہ والے نے گھوڑے کی راس کھینچتے ہوئے کہا۔ بابوجی ادھر سے بھی تانگہ نکالنا مشکل ہے۔ مفتی گنج میں کس طرف جانا ہے؟" میرے دوست نے جو تانگہ والے کی بغل ہی میں بیٹھے تھے کچھ کہا جو میں دھم دھڑا دھم کے شور و غل میں نہیں سُن سکا۔ میں اُس جلوس کو دیکھنے لگا تھا جو اس طرف سے گزر رہا تھا ایک کاغذ کے بنے ہوئے گھوڑے کو کالے رنگ کے کچھ مزدور اپنے کاندھوں پر لئے جا رہے تھے۔ اُس کے پیچھے سینکڑوں مختلف قسم کے عَلَم اور جھنڈے چل رہے تھے۔ سب سے پیچھے بہت سے جوان اور لونڈے ہاتھوں میں ڈنڈے اور لاٹھیاں لئے ایک دوسرے سے ٹھک ٹھک لڑاتے چل رہے تھے۔ میں یہ منظر دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ ہندو مسلمان دنگوں کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے آگئی۔ تانگے والے نے کہا "یہ لٹھیا سالا رہیں، دُلدُل کے ساتھ نکلے ہیں۔" میں سوچنے لگا —— "دُلدُل" —— حضرت علی کا نامی گھوڑا۔ اُس کی آج ایک کاغذی تصویر بنا کر اس دھوم دھام سے لئے جا رہے ہیں۔ تانگہ والے نے اپنے گھوڑے کو دو چابک مارے۔ گھوڑا تیز دوڑنے لگا۔ مجھے اپنے تانگہ کا گھوڑا زیادہ اصلی معلوم ہوا!

لامحدود اُمیدوں اور بڑے بڑے منصوبوں کی فضا میں میں پلا ہوں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مجھے دُنیا کی ہر چیز پسند آتی ہے۔ اس کے برخلاف مجھے ہر چیز میں کوئی نہ کوئی کمی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ میں فطرتاً رجائیت پسند رہا ہوں اس لئے دُنیا کی خرابیوں اور نا امیدیوں کے درمیان میری زندگی کا راستہ بند نہیں ہو جاتا۔ میں ہمیشہ اپنی دماغی دُنیا میں ہر چیز کی کمی کو دور کرتا رہتا ہوں۔ اور رکاوٹوں اور بندشوں کو توڑتا ہوا آگے بڑھنے کا طریقِ عمل ڈھونڈتا رہتا ہوں۔ جس کسی چیز میں مجھے کمی نظر آتی ہے اُسے فوراً دماغی طور پر توڑ مروڑ کر مستقبل میں اُس کی جو شکل ہوگی اُس کی بنا پر اُس کا نیا خاکہ بنا لیتا ہوں۔ لیکن اُس 'دلدل' 'علم' ڈنڈوں اور لاٹھیوں کو دیکھ کر اور اُن بے شمار ڈنکوں پر چوبوں کی چوٹیں سُن کر میری عقل کو جیسے لقوہ مار گیا۔ میرے سامنے یہ سوال کہ آیا ان سے بھی رہائی ہو سکتی ہے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان بن کر کھڑا ہو گیا۔ کیا اپنے بدن کے کسی بیمار حصّہ کی طرح اسے بھی ہم آسانی سے بذریعہ آپریشن اپنے نظام سے الگ کر سکتے ہیں؟ لیکن کچھ سوچ نہ سکا۔ ڈنکے سوچنے نہیں دیتے تھے۔ صرف دُلدُل اُٹھانے والے وہ کالے کالے آدمی آنکھوں کے سامنے پھر رہے تھے۔ بقیہ سب اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ شہر کے اُس حصہ میں سڑک کے کنارے روشنی بھی نہیں تھی دوڑتا ہوا گھوڑا اچانک رُک گیا لیکن رُکتے رُکتے بھی گھوڑے

کے سامنے کے دونوں پیر سڑک پر پڑے ہوئے بانس سے ٹکرا ہی گئے۔ تانگے والا تانگہ روک کر بولا ''بابو جی اس سے آگے تانگہ نہیں جا سکتا۔ آگے سڑک کی مرمت ہو رہی ہے۔'' مجبور ہو کر ہم لوگوں کو تانگہ پر سے اُترنا پڑا۔ میں یہ سوچ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ زندگی کے ہر موڑ پر آج رُکاوٹ کیوں ہے۔ ہم دونوں تانگہ چھوڑ کر کچھ ہی دور آگے بڑھے تھے کہ میرے سامنے دو عورتیں برقعہ پہنے آ گئیں۔ ایک لمحہ کے لئے ہم لوگوں کے راستہ ایک دوسرے سے رُک گئے۔ پھر لمبی عورت میری بغل سے راستہ بنا کر آگے بڑھی۔ اس کے ساتھ کی جوان لڑکی جو اپنے چہرے پر سے برقعہ ہٹائے ہوئے تھی میرے بالکل سامنے آ گئی اور مجھے دیکھ کر ذرا ٹھٹکی اور مُسکرا کر میرے کندھے سے کندھا رگڑتی ہوئی نکل گئی۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔ اندھیری سڑک پر قدم سنبھال سنبھال کر رکھتے ہوئے میں مُسلسل اُسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اُس کے چیچک سے داغی چہرے کا مُسکرانا اور اُس کی ناک کی لمبی جھلنی کا اُس کے بُرقعہ سے ڈھکی ہوئی کمر کے ساتھ بل کھانا میں بھولا نہیں تھا۔ سڑک کے داہنی طرف ایک روشن برآمدے کے سامنے بہت سے لڑکے خوشی میں شور و غل مچا رہے تھے۔ برآمدے میں دیکھا ایک تعزیہ فرش پر رکھا تھا۔ اب جو اُس عورت کا خیال آیا تو سوچا محرم ہے!

اوبڑ کھابڑ ناہموار سڑک پر چلتے چلتے میں نے اپنے دوست سے پوچھا ''کیوں بھائی کہاں تک چلنے کا ارادہ ہے؟'' انھوں نے ہنستے ہوئے جواب دیا ''جہاں تم کہو'' میں نے چُپ ہی رہنا مناسب سمجھا۔ پھر انھوں نے ہی کہا ''سوچا آج تمھیں شرماجی کے وہاں لے چلوں'' یوں تو میں شرماجی کے نام سے واقف تھا لیکن اُن کا مکان کہاں ہے۔ یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ اُن کی بیوی کی تعریف میرے دوست نے اکثر مجھ سے کی تھی لیکن مجھے خود اُن سے ملنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ان کے بارے میں سوچ کر مجھے ہمیشہ حیرت ہوتی تھی کہ وہ کیسی حسینہ ہے جو لوگوں کو یہاں وہاں سے کھینچ کر اپنے پاس بُلا لیتی ہے۔ لیکن اُس سے بھی زیادہ اُس کے مبارک شوہر یعنی شرماجی سے ملنے کی تمنا تھی۔ یہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا کہ کس طرح وہ عجیب و غریب روزگار کرتے ہیں۔

میرے دوست نہایت ہی خوش مزاج آدمی ہیں۔ اور پھر ایسے مواقع پہ اُن کا کیا کہنا! سوائے انگریزی کے اور دوسری زبان ایسے موقعوں پر بول ہی نہیں سکتے۔ اور پھر کس صفائی اور تیزی سے ایسے موضوع پر وہ پرائی زبان میں باتیں کر سکتے ہیں! اور ایسے موقعوں پر انھیں صدہا ہنسانے والی کہانیاں اور روایتیں یاد آنے لگتی ہیں وہ اُس اندھیری سڑک پر قصہ سُنانے اور ہنستے ہنساتے چلے جا رہے تھے۔ میں ان کی بغل میں خاموش گوروں کی طرح قدم سے قدم ملائے چلا جا رہا تھا۔ ظاہری طور پر اُن کی باتیں سُن کر ہاں میں ہاں ملاتا جاتا۔ لیکن خود میرے دماغ میں مختلف خیالوں کا ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ کبھی اُس لڑکے کا ہنس [illegible] اور کبھی اس کی چمکتی آنکھیں بھیک مانگتی نظر آتیں۔ کبھی اُن ڈنکوں اور جلوسوں سے میرے خیالات کا بہاؤ رُک جاتا۔ پھر اُس خاموش اندھیری بستی کی طرف بھی میرا خیال جاتا جس میں سے ہو کر ہم لوگ گزر رہے، لیکن اُس وقت شرماجی ہی مجھے زیادہ آ رہے تھے۔ میں یہی بار بار سوچتا کہ شرماجی کو کیسے دیکھ سکوں گا۔

میرے دوست نے چلتے چلتے کہا ''اب ذرا دھیرے دھیرے چلو اُن کا مکان نزدیک ہے'' ایک دم میرے قدم رُک گئے۔ پھر وہ ایک طرف گلی میں مڑ گئے۔ اُن کے پیچھے پیچھے میں بھی ہو لیا۔ پتھر کی اندھیری گلی میں وہ اپنی ایڑیاں اُٹھا کر آہستہ آہستہ چل رہے تھے

۶۵ میں نے بھی اُن کی نقل کی۔ بائیں طرف وہ اونچا پختہ مکان کھڑا تھا۔ جس کی اونچائی اوپر اندھیرے دھندلے آسمان میں کھوئی جاتی تھی بائیں طرف کے پست قامت کچے مکان کی کھپریل میں ہاتھ اُٹھا کر چھو سکتا تھا۔ بیچ میں تنگ اندھیری پتھر کی گلی تھی جو اُن دو دُنیاؤں کو الگ کرتی تھی۔ ایک دُنیا وہ تھی جس کی ہزاروں روپیہ کی اونچی عالیشان عمارت کے ایک دس روپیہ کے کرایہ کے حصہ میں شرماجی اپنی منکوحہ کے ساتھ رہتے تھے۔ دوسری دُنیا اُن کچی دیواروں کے مکان کی تھی جس کی نامعلوم گرہستی سر شام ہی سے چراغ گُل کر کے سو گئی تھی۔ ایک دُنیا میں متوسط طبقہ کی آتمائیں اُس پتھریلی سرمایہ داری کی چار دیواری کے درمیان پِل کر اُوپر اُٹھنے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ اور دوسری طرف کچے مکان میں درمیانی طبقہ کے رہنے والے نیچے اُتر کر نیچوں اور مظلوموں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملائے جا رہے تھے۔

گلی میں جو پہلا دروازہ ملا اُس سے ہم لوگ آگے بڑھ گئے دوسرے دروازہ پر میرے دوست ٹھیرے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن اندر روشنی نہیں تھی۔ مجھے چونکہ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس لئے میں گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ میرے دوست

مجھے وہیں رُکے رہنے کی ہدایت کر کے خود اندر داخل ہوئے اور دو چار سیڑھیاں اوپر چڑھ کر ایک اجنبی کی طرح پکارنے لگے۔ کچھ دیر بعد جواب میں اوپر سے آواز آئی اور کہیں پر دروازہ بھی کھلا۔ اپنے دوست کو اوپر چڑھتے دیکھ کر میں بھی پیروں سے سیڑھیاں ٹٹولتا ہوا آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگا۔ زینہ کے اوپر موڑ پر سے کوئی لالٹین دکھا کر ہم لوگوں کا تاریک راستہ روشن کر رہا تھا۔ میرے دوست تو چونکہ اُس تاریک زینہ سے مانوس تھے اس لئے انھیں کچھ ایسی دقّت پیش نہ آئی۔ رہا میں سو میرے لئے اُس لالٹین کی روشنی بھی کافی ثابت نہ ہوئی۔ کیونکہ میرے اور اُس کے درمیان میرے دوست کا سایہ حائل تھا۔ خیر ساری دشواریوں کا سامنا کرتا ہوا جب میں اوپر زینہ کے آخری موڑ پر پہنچا اور میری نظر اُس چھوٹے کمرے میں پڑی جسے ڈیوڑھی بھی کہہ سکتے تھے۔ تو دروازہ کے ایک بے کھلے پٹے سے کٹتی ہوئی مجھے جو پہلی چیز نظر آئی وہ کسی شخص کی کسی قدر غیر معمولی توند تھی۔ اس عجیب و غریب چیز کو اپنا استقبال کرتے دیکھ کر مجھے بے تحاشہ ہنسی آئی جسے میں نے جیب سے رومال نکال کر بمشکل تمام روکا۔ اُس چھوٹے سے مستطیل کمرے میں پہونچکر میرے دوست نے شرماجی سے میرا تعارف کرایا۔ میرے ہنسنے کا جذبہ
66 چونکہ مجھ پر اب بھی غالب تھا اس لئے میں نے تو اپنی اور شاید شرماجی کی بھی آبرو رکھنے کیلئے کچھ بولنا چالنا غیر مناسب سمجھ کر خاموش بیٹھ جانا ہی مناسب سمجھا۔ لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ اُن دو دوستوں اور خاص کر اس قسم کے دوستوں کی دیرینہ ملاقات کے باوجود ملنے پر آپس میں کوئی سرگرمی نہیں پیدا ہوئی۔

میرے دوست نے پہلے اِدھر اُدھر کی باتیں چھیڑیں لیکن میرے واسطے جو بات باعثِ پریشانی تھی وہ یہ کہ ہر بات کچھ آگے جا کر لنگڑانے لگتی تھی۔ میں اپنی ہنسی اور قلبی پریشانی دونوں کو چھپانے کے لئے شرماجی کی طرف نہ دیکھ کر بقیہ ہر چیز پر نظریں دوڑانے لگا۔ چاروں طرف دیواروں پر تصویریں آویزاں تھیں۔ پہلے میری نظر پڑی گاندھی جی پر۔ ایک کیلنڈر کی تصویر میں وہ اپنے ٹوٹے ہوئے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے ماتھے پر تلک لگائے اپنی بوڑھی آنکھوں سے مسکرا رہے تھے۔ ننگے بدن کی ایک ایک ہڈی گنکر مجھے فقرہ آنے لگا آخر ان کی یہاں کیا ضرورت تھی؟ دوسری طرف دیکھا تو اس ملک کا سب سے زیادہ خود دار آدمی نظر آیا ___ جواہر لعل! اُس تصویر میں وہ کھڑے ... ہنسی ہنس رہے تھے۔ مجھے اور بھی زیادہ جھنجھ... ہوئی ___ آخر یہاں ہر شخص کو ہنسنے کا کیا مذاق سوجھا ہے۔ بائیں طرف نظر گئی تو ایک تصویر میں لیلا ڈیسائی تارے ناچتی ہوئی فخریہ انداز میں زمین پر لہنگا پھیلا کر انگوٹھے پیروں کے بل فرش پر بیٹھ گئی تھیں۔ اور خلا میں اُن کی خوبصورت سڈول ہاتھ کی اُنگلیوں میں رقص کی موسیقی تھرک رہی تھی۔ مجھے ذرا تسکین ہوئی ___ ہاں، یہ ایک چیز کسی قدر اپنی جگہ پر ہے!

اس اثنا میں میرے دوست شرماجی کو ہر طرح کی باتوں سے ٹٹول چکے تھے۔ پھر انھوں نے مصلحتاً اُس بڈھے کالے آدمی کے بارے میں انگریزی میں دریافت کیا جو زمین پر بیٹھا تھا۔ معلوم ہوا نوکر ہے پھر میرے دوست نے روزگار وغیرہ کے بارے میں پوچھنا شروع کیا اب تو میرے ہوش ٹھکانے نہ رہے۔ اندر ہی اندر دم گھٹا جا رہا تھا میں نے اختلاج کے بیہودہ دورہ کو دبانے کے لئے سگریٹ جلا کر جلدی جلدی دھوئیں کا ایک بادل اپنے اردگرد اکٹھا کر لیا۔ لیکن اس دوران میں یہ بات صاف ہو چکی تھی کہ روزگار سے میرے دوست کا مطلب انشورنس تھا جو شرماجی کا اصلی پیشہ تھا۔ شرماجی نے خاکسارانہ انداز میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "معاف کیجئے گا اس وقت میرے پاس صرف بیڑی ہے" اپنی جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالتے ہوئے میں نے انھیں ڈھارس بندھائی۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن وہ رُکے نہیں "پہلے میں بھی سگریٹ ہی پیتا تھا لیکن بیڑی مجھے زیادہ پسند ہے" میرے دل نے بات جاری رکھی "ظاہر ہے سگریٹ پینا خود ہی کبھی کبھی بیڑی پینے کی تمہید ہوتی ہے"۔ موقع پاکر میرے دوست نے اشارے میں شرماجی سے کچھ دریافت کیا۔ جواب میں شرماجی نے معافی چاہی اور مجبوری کا اظہار کیا۔

کچھ اور دیر ہم لوگ وہاں بیٹھے رہے۔ میرے دوست ایک عجیب دماغی تردّد میں پھنسے ہوئے نظر آ رہے تھے لیکن جلد ہی انھوں نے محسوس کیا کہ وہاں اُس حالت میں ہم لوگوں کی بُری گت بن رہی تھی۔ مجھے مخاطب کر کے انھوں نے کہا "تو چلو بھائی کسی اور دن فرصت سے آئیں گے" وہ بات یوں ہی مصنوعی طریقہ پر کہی گئی تھی یا اس کے پیچھے کوئی مصلحت تھی۔ یہ سوچنے کے لئے میرے پاس وقت نہ تھا۔ میں جھٹ اُٹھا اور شرماجی سے نامناسب طریقہ سے الوداع کہے بغیر تیزی کے ساتھ زینہ سے اُترنے لگا۔ نیچے پہونچکر میں نے سانس لی۔ میرے دوست مجھ سے دو منٹ بعد آئے۔ پھر ہم وہاں سے روانہ ہی ہو رہے تھے کہ اُسی وقت دو اور حضرات زینہ کے باہر دروازہ پر آ پہونچے۔ ان لوگوں نے شرماجی کو تانا مزد کر کے

پکارنا شروع کیا۔ اوپر سے شرماجی نے جواب دیا "شرماجی نہیں ہیں"
جب وہ لوگ کچھ دور چلے گئے تو میں نے اپنے دوست سے پوچھا "کیوں
بھائی یہ کیا بات ہے؟" انھوں نے دبی ہوئی زبان میں جواب دیا
"شرماجی نے بہت معافی مانگی ہے۔ اب انھوں نے اپنا خیال بدل
دیا ہے۔" سامنے وہ حضرات سونی خاموش لمبی گلی میں قدم بڑھائے
چلے جا رہے تھے۔ پتھر کی تنگ گلی میں ادھر سے آنے والی دھیمی روشنی
میں ان کی سفید گاندھی ٹوپیاں چمکتی دیکھ کر مجھے بےحد ہنسی آ رہی تھی
شالوں اور چپلوں سے آراستہ وہ لوگ دیکھنے میں کانگریسی معلوم ہو رہے
تھے۔ جناب شرماجی نے اپنا خیال بدل دیا تھا اور یہ لوگ ایسے لگ رہے
تھے جیسے "وزارت" سے استعفیٰ دیکر واپس لوٹ رہے ہوں۔ ادھر
سے جو منحوس روشنی آ رہی تھی اُس کی طرف میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ آسمان
پر دُمدار ستارہ چمک رہا تھا۔ میں ایک دم کانپ اٹھا اور میرے
رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

ہم لوگ چُپ چاپ پیدل ہی لوٹ رہے تھے جیسے لڑائی پر
سے ہارے ہوئے سپاہی۔ میرے دوست تو حقیقت میں ہار ہی نہیں
بلکہ زخمی ہو کر لوٹے تھے۔ وہ بالکل خاموش تھے اور آہستہ آہستہ چل
رہے تھے۔ اب میں آگے آگے تھا اور وہ میرے پیچھے۔ داہنے ہاتھ اونچے
پُل پر ریل گاڑی بہت تیزی سے گزر رہی تھی۔ اندھیری دھنواں
جیسی رات میں ٹرین کے روشن ڈبوں میں مسافر بھرے ہوئے تھے۔
فضا میں انجن اور ڈبوں نے ایک عجیب ہنگامہ اور شور بپا کر رکھا
تھا۔ گاڑی میں مُسافروں کا ہجوم دیکھ کر مجھے پھر درمیانی طبقہ کا خیال
آیا اور اُسی کے ساتھ شرماجی کا خیال آیا۔ آخر شرماجی ایسا کرتے ہی
کیوں تھے؟ تو کیا سچ مچ اُنھوں نے وہ گھر یلو روزگار بند کر دیا۔ میرے
دوست نے کہا "ہرگز نہیں" شاید کوئی اور موٹی اور مستقل آسامی
مل گئی ہے۔ میں سوچنے لگا۔ آخر اس کا فرائڈ کیا جواب دیتا؟ لیکن
آخر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ تو اقتصادیات کا مسئلہ ہے۔ ٹھیک
ہی تو کسی نے کہا تھا کہ طبقاتی کشمکش میں متوسط طبقہ نیست و نابود
ہو جائے گا۔ ٹھیک یہی اس وقت اُن دونوں کچے دکھے مکانوں میں
ہو رہا تھا۔ رفتارِ زمانہ کے ساتھ سماجی کشمکش میں پڑ کر دونوں کے قدموں
کے نیچے سے زمین کھسک رہی تھی۔ لیکن جہاں اُن میں سے ایک نے
قناعت کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیکر تیزی سے پیچھے جا رہا تھا۔
دوسرا اپنے ہمابر والوں سے بہتر ہونے کی غرض سے آخری کوشش
کر رہا تھا۔ اوپر جانے کے لئے لیکن پھر مجھے اس بات سے جھنجلاہٹ

ہوئی کہ ایسی گندی اور بدصورت فضا میں خواہ مخواہ ایسے مشکل
مسئلے کیوں دماغ میں چڑھ جاتے ہیں۔ پھر مجھے اُس آدمی کے سر
داڑھی اور مونچھوں کے لمبے اُلجھے اور بگڑے ہوئے بالوں کو سوچکر
ہنسی آنے لگی جو میرے دماغ میں اس ساری خرافات بھرنے کا ذمہ دار
ہے۔ کچھ دور چل کر پھر ہم لوگ سڑک سے بائیں ہاتھ پر ایک چھوٹے
سے تاریک مکان میں گھس گئے۔

میں اندھیری ڈیوڑھی میں کچھ دیر تک انتظار کرتا رہا۔ اندر آنگن
میں جاکر میرے دوست نے بڑھیا سے باتیں کیں پھر آکر مجھے بھی بلا کر
لیگئے۔ ہم دونوں کو بڑھیا نے ایک کمرے میں جہاں لالٹین کھڑکی پر
رکھی جل رہی تھی لیجا کر بٹھا دیا اور بڑھیا خود کہیں باہر چلی گئی تھوڑی
دیر خاموش بیٹھے رہنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اُس چھوٹے سے
کمرہ میں دھوئیں کی کثرت سے میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔ وجہ یہ تھی کہ
جب سے ہم دونوں وہاں آکر بیٹھے تھے سگریٹ ہی پیتے رہے تھے۔
کمرے کی پوری فضا ٹمٹماتی ہوئی لالٹین کی مدھم روشنی میں دھنواں
دھنواں ہو رہی تھی اور ہم دونوں اس میں دو بےجان چیزوں
کی طرح بیٹھے تھے۔

کچھ دیر بعد بڑھیا لوٹ آئی۔ پھر وہ مجھے اپنے ساتھ ایک کمرے 47
میں لیگئی۔ مجھ سے ایک چارپائی پر بیٹھنے کو کہہ کر اُس نے باہر سے دروازے
بند کر دئے۔ میں خاموش چارپائی پر بیٹھا سگریٹ کے دھوئیں سے دل کی
تیز دھڑکن کو کم کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ اتنے میں آہستہ سے
دروازہ کا ایک پٹ کھلا۔ ایک چھوٹے قد اور گٹھیلے بدن کی تندرست
لڑکی کمرے میں داخل ہوگئی۔ گھبراہٹ اور پریشانی میں چونکہ میری
آنکھیں جھک گئیں اس لئے میں اُسے دیکھ نہ سکا۔ وہ میری چارپائی
کے سرہانے کھڑی ہوگئی۔ طاق پر رکھی ہوئی ڈھبری اُس کی پیٹھ کی
طرف پڑ رہی تھی، اس لئے اس کا لمبا چوڑا سایہ میرے اور کمرے پر چھا گیا
کمرے میں جو رہی سہی روشنی تھی وہ اس گندے دھندلے ماحول میں کھو
چکی تھی۔ سگریٹ کے بچے ہوئے ٹکڑے سے دھوئیں کا آخری کش کھینچکر
اُسے ایک طرف پھینکتے ہوئے لڑکی کا آنچل پکڑ کر میں نے اپنی طرف کھینچنا
چاہا۔ اس سے قبل کہ میں اُسے اپنی گود میں بٹھاتا اُس نے شرم سے
اپنی آنکھیں دونوں ہاتھوں سے بند کرلیں۔ میں نے پیار سے اُس کے
ہاتھ آنکھوں پر سے ہٹا دئے۔ چراغ کی روشنی اُس کے چہرے پر پڑی
میں نے اُسے دیکھا، اُس نے مجھے دیکھا۔ دونوں میں کس نے کس کو
پہلے دیکھا معلوم نہیں۔ اُس کے ادھ کھلے ہونٹوں سے ایک چیخ نکل گئی

اور وہ بجلی کی طرح اچھل کر میری گود سے نکل کر کمرے کے باہر چلی گئی اُس کا چیخنا میرے دل اور کانوں کو ایک ساتھ چیر کر نکل گیا۔

میں تیزی سے کمرے سے نکلا۔ آنگن، ڈیوڑھی اور گلی میں سے ہوتا ہوا سڑک پر آنکلا۔ سڑک پر کچھ دور دوڑتا تو کچھ دور چلتا تھا۔ لیکن لگاتار بغیر کچھ سوچے سمجھے چلتا ہی جاتا تھا۔ سوچنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ دماغ پھٹا جارہا تھا۔ تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ لیکن بدستور چلتا جاتا تھا۔

میرے بالکل پیچھے آکر تانگا رُکا۔ گھوڑے کی ناک کی گرم سانس پیچھے میرے گلے سے مس ہوئی۔ میرے دوست تانگے سے اُتر کر میرے پاس آچکے تھے۔ میرا کندھا پکڑ کر مجھے جنبش دیتے ہوئے انھوں نے کہا۔ "کیوں، کہاں بھاگے جارہے ہو؟ آخر ہوا کیا؟ میرا انتظار تو کرتے۔ چلو، چلو تانگے پر بیٹھو!"

میں تانگے پر پیچھے کی طرف بیٹھا ہوا تھا اور وہ سامنے بیٹھے تھے۔ رات کافی جاچکی تھی، تیز ٹھنڈی ہوا دھیرے دھیرے مجھے جگا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ میرے خیالوں کا سلسلہ پھر جاری ہوا۔ شکنتلا آج یہاں؟ اِس حالت میں؟؟ .... میں اس سے کبھی محبت کرتا تھا۔ اُس کے واسطے دیوانہ تھا۔ اُس کی شادی ہوگئی، اُسی نے مجھے لکھا تھا۔ "زندگی میں میرے اور تمہارے راستے الگ الگ ہوچکے ہیں۔ اب ہم لوگوں کو مختلف سمتوں میں جانا ہے" لیکن آج پھر راستے ملے کیوں؟ اور یہاں ...... یہاں اس خرابے میں!

تانگہ ٹھیک میرے مکان کے سامنے رُکا۔ تانگے سے اُترتے ہوئے میں نے چوراہے کے اُس طرف دیکھا۔ جہاں شام کو لڑکا سڑک کے کنارے بیٹھا بھیک مانگ رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے کھسک کر چیتھڑے اپنی گود میں سمیٹے بجلی کے کھمبے کے نیچے سوگیا تھا۔ اُس نے مجھے اب کی بار دیکھ کر پیسہ نہیں مانگا۔ لیکن اب وہ اکیلا نہیں تھا۔ چیتھڑوں کی گندگی میں سگریٹ کی ڈبیہ اور پتی اکٹھا کرکے سماج کے گھور پر پل کر پنپنے والی انسانیت کا ایک دوسرا نمائندہ بجلی کے کھمبے کے نیچے آکر بیٹھ گیا تھا۔ بچے اور بوڑھے دونوں کندھے سے کندھا ملائے بجلی کے کھمبے سے لگ کر سوگئے تھے۔ اُن کے سروں پر بجلی کی روشنی سے مرکر گرنے والے پروانوں کا ایک انبار لگا ہوا تھا۔ بجلی اوپر جل رہی تھی۔ لیکن چراغ تلے اندھیرا تھا۔ شام رات میں کھوگئی تھی۔ دُنیا سوئی ہوئی تھی۔ صرف ایک اُلّو بجلی کے کھمبے پر بیٹھا چیخ رہا تھا۔!!

(صفحہ ۲۷ سے آگے)

اور وہ گیت بھی صادق نکلتا جنھیں وہ گایا کرتا تھا ــــ

جوانی تو برباد ہو ہی گئی ہے
مگر عمر کے خواب باقی ہیں اَب بھی
ابھی تو بہت دور ہے ایسی منزل
جہاں ٹھیر جائے گا، رومان کا پہیّا!

اور اسی کشمکش و پیچ میں اس نے پھر اپنے آپ سے سوالات کرنے شروع کئے۔ "یہ کیونکر ہو سکتا ہے، وہ ایک دیہاتی پادری کا لڑکا جس کی آزاد خیالی کے ساتھ پرورش ہوئی ہو ایک سیدھا سادھا اکھڑ اور بیباک آدمی ایک جھوٹی، آوارہ اور ذلیل مخلوق کے پنجہ میں پھنس کر رہ گیا، جو اس سے اتنی مختلف ہے، اتنی مختلف!"

جب گیارہ بجے کے قریب وہ کپڑے پہن کر ہسپتال جانے لگا تو نوکر آیا۔

"کیا ہے؟" اس نے کہا۔

"سرکار بیگم کہہ رہی ہیں کہ آپ نے جو ۲۵ روپئے کا وعدہ کیا تھا وہ دیدیجئے!"

چیخوف

بیگم

مسعود زاہدی

"میں نے تم سے کتنی بار کہا کہ میری میز صاف مت کیا کرو۔" نکولی نے کہا۔

"جب بھی تم میز صاف کرتی ہو تو چیزیں اس طرح رکھدیتی ہو کہ وقت پر نہیں ملتیں، وہ تار کہاں ہے؟ کہاں پھینک دیا اُسے؟ ڈھونڈو خدا کے لئے ڈھونڈو اُسے۔ قازان سے آیا ہوا ہے وہ اور کل کی تاریخ پڑی ہوئی ہے۔"

نوکرانی ——— ایک تپلی دُبلی زرد رُو اور بے نیاز سی لڑکی اس نے نیچے ٹوکری میں پڑے ہوئے تمام تار اکٹھے کر دئے۔ اور بغیر کچھ کہے سُنے ڈاکٹر کے ہاتھ میں دیدئے لیکن یہ تمام تار مریضوں کے تھے۔ تب اُس نے ڈرائنگ روم اور اولگا کے کمرے میں بھی تلاش کیا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ نکولی جانتا تھا کہ اسکی بیوی جلد واپس لوٹنے والی نہیں۔ کم ازکم صبح کے پانچ بجے سے پہلے تو نہیں لوٹے گی۔ بیوی پر سے اس کا اعتبار اُٹھ گیا تھا، اور جب وہ بہت دیر تک باہر رہتی تھی تو وہ سو بھی نہیں سکتا تھا۔ پریشان ہوجاتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ اس سے نفرت بھی کرتا تھا۔

اسے اس کی ہر چیز سے نفرت ہوگئی تھی، اس کے بستر، اس کے آئینہ، مٹھائیوں کی پیٹیاں، اس کی خوشبو کی شیشیوں، یہاں تک کہ اُن نیلوفر کے پھولوں سے بھی جو اسے ہر روز کوئی نہ کوئی بھیجتا رہتا تھا۔ اور سیلی کچیلی دوکان کی بیمار سی خوشبو سارے کمروں میں پھیلا دیتے تھے۔ ایسے موقعوں پر وہ زود رنج، بد مذاق، لڑاکا اور زود احساس ہوجایا کرتا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس وقت اس تار کا ملنا بہت ضروری ہے، اشد ضروری۔ اگرچہ اس میں اس کے سوا کچھ بھی نہ تھا کہ وہ اس کے بھائی نے بھیجا تھا۔ اور کرسمس کی مبارکباد دی تھی۔

اپنی بیوی کے کمرے میں میز کے نیچے سٹیشنری کے صندوق سے ڈھکا ہوا اُسے ایک تار ملا۔ اس نے اسے ایک اچٹتی سی نظر سے دیکھا۔ یہ تار اس کی خوشدامن کی معرفت اس کی بیوی کے نام تھا مانٹی کارلو کا پتہ تھا۔ اور نیچے مائیکل کے دستخط تھے۔ ڈاکٹر اس کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکا۔ یہ کسی غیر زبان میں تھا غالباً انگریزی میں۔

"یہ مائیکل کون ہے؟ مانٹی کارلو سے؟ اور پھر اس کی خوشدامن کی معرفت کیوں؟"

شادی کے بعد کی سات سالہ زندگی میں وہ کافی شکی ہوگیا تھا۔ چیزوں کو کرید کرید کر اُن کی تہ میں پہنچنا اس کی عادت ہوگئی تھی اور اس دوران میں اسے کئی بار اس امر کی تصدیق ہوگئی کہ اس شک نے اسے بہت اچھا سُراغرساں بنا دیا ہے وہ اٹھ کر اپنے مطالعہ کے کمرہ میں گیا اور سوچنے لگا، سوچتے سوچتے گزشتہ واقعات اس کے ذہن میں اُجاگر ہو گئے!

تقریباً آج سے ڈیڑھ سال پہلے وہ اپنی بیوی کے ساتھ پیٹرزبرگ گیا تھا اور وہاں اپنے ایک پُرانے سکول کے ساتھی کے پاس ٹھیرا تھا جو سول انجنیئر تھا۔ واقعات اس کے ذہن میں اور صاف ہوگئے ——— اسی انجنیئر نے اسے اور اس کی بیوی کو ایک اور شخص سے متعارف کرایا تھا جس کی عمر کوئی بائیس تئیس کے لگ بھگ تھی، اور اس کا نام ماہیکل یا مائیکل کچھ ایسا ہی تھا۔ لیکن لوگ اسے یونہی ایک عجیب طریقہ پر مُرسس کہنے لگے تھے۔

دو ہفتہ بعد ڈاکٹر نے اپنی بیوی کی تصویروں کے البم میں اُس شخص کی تصویر دیکھی جس پر فرانسیسی میں لکھا ہوا تھا۔

"حال کی یاد اور مُستقبل کی اُمید میں"

اس کے بعد پھر اس کی ملاقات اس شخص سے اپنی خوشدامن کے یہاں ہوئی تھی۔ اور اسی وقت سے اس کی بیوی رات کو دیر سے گھر آنے کی عادی ہوگئی تھی۔ اور بعض بعض مرتبہ تو رات رات بھر غائب رہتی تھی۔ اس کے بعد ہی سے وہ باہر جانے کیلئے ایک پاسپورٹ.

کی فرمائش کرنے لگی تھی جسے وہ ابھی تک برابر انکار کرتا چلا آیا تھا جس کی وجہ سے گھر میں ایک اچھی خاصی جنگ شروع ہو گئی تھی، اس مدتک کہ وہ نوکروں کے سامنے آتا ہوا بھی شرماتا تھا۔

چھ مہینہ سے اس کے ساتھی اسے برابر مشورہ دے رہے تھے کہ اسے کہیں باہر چلا جانا چاہیئے، اس کی صحت گر رہی ہے۔ تمام کام کو پسِ پشت ڈال کر اسے چاہیئے کہ کریمیا چلا جائے جب اس کی بیوی نے اس کے بارے میں سُنا تو اس کا پیار خاوند سے بڑھتا ہوا نظر آنے لگا۔ اور وہ اس سے برابر کہنے لگی کہ کریمیا میں سردی بہت ہو گی، اس سے بہتر یہ ہے کہ نائس چلا جائے تاکہ وہ بھی تیمارداری کی غرض سے اس کے ساتھ جا سکے۔ وہ وہاں اس کی نگہداشت رکھیگی۔ اور اسے ہر طرح آرام پہنچائے گی۔

اب اس کی سمجھ میں آتا جا رہا تھا کہ اس کی بیوی کیوں نائس چلنے پر زور دے رہی تھی، اس لئے کہ مائیکل قریب ہی مانٹی کارلو میں تھا۔

وہ ایک انگریزی کی لغت لیکر بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ لفظوں کا ترجمہ کرنے لگا۔

"میں اپنی محبوبہ کا جامِ صحت پیتا ہوں، اس کے ننھے پاؤں پر ہزاروں بوسے قربان، میں اس کا بے چینی سے منتظر ہوں"

اُس نے اپنے اس مضحکہ خیز پارٹ کا تصور کیا جو اگر وہ نائس چلا جاتا تو اُسے ادا کرنا پڑتا۔ اسے اپنی حالت اتنی قابلِ رحم نظر آنے لگی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور وہ بے چینی سے کمرے کے فرش پر ٹہلنے لگا۔ اس کے مردانہ جذبات ابل کر بغاوت پہ آمادہ ہو گئے۔ غصہ میں اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں اور گالیاں خود بخود اس کے ہونٹوں پر لڑھکنے لگیں۔ اسے اپنے اوپر حیرت ہونے لگی کیونکر ممکن ہے یہ؟ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک دیہاتی پادری کا لڑکا ایک مذہبی سکول کا تعلیم یافتہ، زندگی میں بیباکانہ کردار کا مالک، پیشہ کے لحاظ سے ایک ڈاکٹر، وہ کیونکر ایک عورت کا غلام ہو کر رہ گیا، ایک کم حیثیت، کم مایہ، اور کمزور عورت کا غلام! "ننھے پاؤں" وہ بڑبڑانے لگا، تاراس کی ہچکیوں میں مسلا جا رہا تھا! "ننھے پاؤں"!

شادی کے بعد کے سات سال اور اس سے پہلے جب اسے اس سے محبت ہوئی تھی اور اس نے شادی کی تجویز پیش کی تھی، یہ سب اس کے ذہن میں محفوظ تھے اور اس تمام عرصہ میں اپنی بیوی کے لمبے معطر بالوں اور اس کے ننھے ننھے پاؤں کے سوا اسے کچھ بھی یاد نہ تھا، اور یقیناً اس کے پاؤں تھے بھی بہت چھوٹے چھوٹے نازک اور حسین، اور وہ انھیں ابھی تک چاہتا تھا، اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ اب بھی اس کی آغوش میں ہیں ـــــ ان کے سوا کچھ بھی یاد نہ تھا اسے، کچھ بھی نہیں، وہ خانہ جنگی، ہسٹریا کی سی چیخیں، دھمکیاں، جھوٹ، خوفناک جھوٹ!

اسے اپنے باپ کا مکان جو دیہات میں تھا یاد آ گیا کبھی کبھی ایک پرندہ کھلی ہوا میں سے اڑ کر کمرہ میں آ جایا کرتا تھا اور کھڑکی سے ٹکرا ٹکرا کر چیزوں کو بے ترتیب کر دیا کرتا تھا، اس طریقہ سے یہ عورت بالکل ایک مختلف جماعت سے اُڑ کر اس کی زندگی میں در آئی تھی، اُسے بالکل تتر بتر کر دیا تھا۔ اس کی زندگی کے بہترین سال ایسے گزرے تھے جیسے جہنم میں گزر رہے ہوں، اس کی امیدیں ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے لئے ایک تماشا بن گئی تھیں، اس کی صحت گر گئی تھی اور اس کا گھر کھنگر خانہ معلوم ہوتا تھا، اس تمام عرصہ میں اس دس ہزار کی آمدنی میں سے وہ کبھی دس روپیہ بچا کر بھی اپنی ماں کو نہ بھیج سکا تھا جو دیہات میں رہتی تھی، اور اس کا قرضہ، وہ الگ پندرہ ہزار تک پہنچ گیا تھا۔ اس وقت اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ اگر اس کے گھر میں لٹیروں کا ایک گروہ بھی آ کر رہتا تب بھی یہ اتنی بری طرح برباد نہ ہوتا، جتنا اس عورت کی موجودگی سے ہو گیا تھا۔

وہ کھانسنے اور سانس کے لئے جدوجہد کرنے لگا، اسے اب تک اپنے بستر میں چلا جانا چاہیئے تھا، مگر وہ نہیں جا سکا۔ اور برابر کمرے میں ٹہلتا رہا۔ کبھی میز پر بیٹھ جاتا اور قلم اٹھا کر یوں ہی گھسیٹنے لگتا۔

"نازک پاؤں ...... ننھے پاؤں"

پانچ بجتے بجتے وہ بالکل کمزور ہو گیا، اور اسے سارا قصور اپنا ہی نظر آنے لگا، وہ سوچنے لگا کہ اگر وہ کسی اور سے شادی کرتی جو اس پر پوری طرح قدغن رکھتا ـــــ کون کہہ سکتا ہے؟ کون کہہ سکتا ہے؟ وہ بہت اچھی اور سگھڑ عورت ہوتی۔ وہ نفسیات میں بہت کمزور ہے اور عورت کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔

.... "اب مجھے بہت عرصہ زندہ بھی نہیں رہنا"

اس نے سوچا میں بالکل مردہ ہوں، مجھے زندوں کے آڑے نہیں آنا چاہیئے۔ دوسروں کا حق غصب کرنا بڑی زیادتی ہے۔ میں اس سے کنارہ کشی کر لوں گا۔ بہتر ہے کہ وہ اسی آدمی کے پاس چلی

جانے جس سے وہ محبت کرتی ہے ...... میں اُسے طلاق دیدونگا اور تمام ذمّہ داری اپنے سر لے لوں گا۔"

آخرکار اولنگا آگئی۔ وہ سیدھی مطالعہ کے کمرے میں گئی اور اُسی لباس میں جس میں وہ تھی، سفید لبادہ، ہیٹ اور فل بوٹ، وہ صوفے کی تہ میں ڈوب گئی۔ "بدتمیز، موٹا" وہ سسکیاں لینے لگی "بے ایمان، حرامخور، میں اسے برداشت نہیں کر سکتی، یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔"

"کیا بات ہے۔" نکولی نے اس کے پاس جاتے ہوئے پوچھا۔

"وہ طالب علم، آذ مدریکن مجھے گھر تک چھوڑنے آیا تھا۔ اس نے راستہ میں کہیں میرا بٹوہ کھو دیا۔ اس میں پندرہ روپیہ تھے، میں نے وہ اماں سے اُدھار لئے تھے۔"

وہ ایک عجیب انداز میں رو رہی تھی، ایک بچّی کی طرح اور نہ صرف اس کا رومال بلکہ اس کے دستانہ بھی آنسوؤں میں تر تھے۔

"اب اس کا کیا علاج" ڈاکٹر نے کہا، اگر اس نے کھو دئے تو کھو دئے، اب پریشان ہونے سے کیا فائدہ۔ خاموش رہو، میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"میں اتنی مالدار نہیں ہوں جو روپیہ یوں کھوتی پھروں۔ وہ کہتا ہے میں واپس کر دوں گا۔ مگر مجھے یقین نہیں، وہ بہت غریب ہے۔"

اس کا خاوند منتیں کرتا رہا کہ خدا کے لئے چُپ ہو جاؤ مگر وہ برابر طالب علم اور اپنے روپیہ کا ذکر کرتی رہی۔

"اچھا خاموش ہو جاؤ میں تمہیں کل پچیس روپیہ دیدوں گا" اس نے غصّہ سے کہا۔"

"اچھا میں کپڑے تبدیل کر آؤں" اس نے روتے ہوئے جواب دیا۔

"میں اپنے اس سمور میں آرام سے نہیں بیٹھ سکتی، تم بھی کتنے عجیب معلوم ہو رہے ہو؟"

اس نے خود کپڑے اُتارنے میں اولنگا کی مدد کی۔ سفید شراب کی بو جسے وہ بہت پسند کرتی تھی اس کے مُنہ سے آ رہی تھی، اس کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور اپنے چہرہ پر پوڈر لگا کر واپس آگئی اگرچہ آنسو ابھی تک اس کی آنکھوں میں جھلک رہے تھے۔ اس کے خاوند کو روشنی میں لبادہ کی جھلک اور اس کے بالوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے پاؤں میں سلیپر پہنے ہوئے تھی۔

"کس سلسلہ میں باتیں کرنا چاہتے ہو؟" اس نے اپنے آپ کو ایک جھولے دار کرسی میں جھلاتے ہوئے کہا۔

"میں یہ دیکھ چکا ہوں" اس نے تار اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

اُس نے اُسے پڑھا اور کندھے سُکیڑ کر کہنے لگی۔

"پھر یہ تو نئے سال کی مبارکباد پر آیا تھا۔ اس میں کوئی راز کی بات تو نہیں" وہ اور پہلے سے زیادہ زور زور سے جھولنے لگی۔

"تم مجھے انگریزی سے لاعلم ہونے کی وجہ سے اس طرح کہہ رہی ہو، ہاں مجھے انگریزی نہیں آتی، لیکن میرے پاس لغت ہے۔ یہ مرّس کا تار ہے۔ وہ اپنی محبوبہ کا جام صحت پیتا ہے، ہزاروں بوسے اس کے نازک پاؤں پر قربان کرتا ہے، خیر اسے چھوڑو۔" ڈاکٹر نے جلدی سے کہا۔ "میں کوئی اور نیا منظر نہیں پیدا کرنا چاہتا، بہتر یہ ہے کہ اب ہم اس چیز کو ختم ہی کر دیں ...... یہی کچھ میں تم سے کہنا چاہتا تھا —— تم اب آزاد ہو اور جہاں جی چاہے جا سکتی ہو"

اس پر خاموشی طاری ہو گئی اور وہ آہستہ آہستہ رونے لگی۔

"میں تمہیں اس لئے آزاد کرنا چاہتا ہوں کہ تم جھوٹ بولنے اور بہانے بنانے سے باز رہ سکو۔" نکولی نے اپنی بات جاری رکھی "اگر تم اس جوان آدمی سے محبت کرتی ہو تو کرو، اگر تم اس کے پاس جانا چاہتی ہو تو جاؤ، تم جوان ہو، تندرست ہو، اور میں .... میں بوڑھا ہو گیا ہوں، اور اب مجھے زیادہ دن ...... زندہ بھی نہیں رہنا، مختصراً یہ کہ ...... تم سمجھ گئیں نہ میرا مطلب۔

وہ مضطرب سا ہو گیا اور اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

اولنگا روتی رہی جیسے وہ خود سے ہمدردی کر رہی ہو، اس نے یہ مان لیا کہ وہ مرّس سے محبت کرتی ہے۔ اس کے ساتھ شہر کے باہر بھی جایا کرتی تھی اور اکثر اس کے کمرے پر بھی اس سے ملاقات کے لئے جایا کرتی تھی، اور یہ کہ اس نے باہر بھی اس کے ساتھ جانا چاہا تھا۔

"تم دیکھتے ہو میں کوئی چیز تم سے چھپاتی نہیں۔"

اس نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "میری ساری زندگی تمہارے سامنے عریاں ہے۔ میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ مجھے پاسپورٹ دلوا دو، دلوا دو پاسپورٹ!"

"میں پھر دہراتا ہوں کہ تم آزاد ہو۔"

وہ اس کے قریب ہی دوسری کرسی پر آگئی، اور اس کے چہرے کے تاثرات کو پڑھنے لگی، اسے یقین نہ آیا اور وہ اس کا اصل مدعا سمجھنے کی کوشش کرنے لگی، وہ کبھی کسی کا اعتبار نہیں کرتی تھی، چاہے

دوسرے کی نیت کتنی ہی صاف کیوں نہ ہو۔ وہ سوچتی تھی کہ اس میں ضرور کوئی نہ کوئی خودغرضی کا شائبہ چھپا ہوا ہے۔ اور جب اولگا نے پھر اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں بلّی کی سی چمک تھی۔

"کب دلواؤ گے پاسپورٹ"؟ اس نے پوچھا۔

ڈاکٹر کا جی چاہا کہہ دے "کبھی نہیں"، لیکن اس نے ضبط کیا۔

"تم کب چاہتی ہو؟"

"میں صرف ایک مہینہ کے لئے جاؤں گی۔"

"تم ہمیشہ کے لئے مَرس کے پاس جاؤ گی، میں تمہیں طلاق دیدوں گا، میں تمام ذمّہ داری اپنے سر لے رہا ہوں، تم سے شادی کرلینا۔"

"لیکن میں طلاق تو نہیں مانگتی۔" اولگا نے جلدی سے کہا۔ میں تم سے طلاق کو تو نہیں کہہ رہی، میں تو صرف پاسپورٹ مانگ رہی ہوں۔"

"لیکن آخر تم طلاق چاہتی کیوں نہیں؟" ڈاکٹر نے غصّہ سے پوچھا۔ تم عجیب عورت ہو، کتنی عجیب، اگر تم واقعی اس کی دلدادہ ہو، اور وہ بھی تم سے محبت کرتا ہے تو اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں کہ تم اس سے شادی کرلو۔ کیا تم شادی اور حرام کاری میں بھی تمیز نہیں کرسکتیں!"

"میں سمجھ گئی تمہارا مطلب۔" وہ اس سے الگ ہٹکر کھڑی ہوگئی اور اس کی آنکھوں میں کینہ جذبات جھلکنے لگے "میں سمجھ گئی تمہارا مطلب، تم مجھ سے اُکتا گئے ہو، اور اس لئے مجھ سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہو، یہ طلاق میرے سر منڈھ دینا چاہتے ہو، شکریہ! مگر میں اتنی بے وقوف نہیں جتنا تم سمجھتے ہو، نہ میں تمہیں چھوڑدوں گی، اور نہ طلاق قبول کروں گی، نہیں، کبھی نہیں! مدعا یہ ہے کہ میں اپنا مرتبہ نہیں گنوانا چاہتی، میں اپنے آپ کو لوگوں کی نظروں میں حقیر نہیں کرنا چاہتی۔" اس نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔ جیسے کوئی اسے بولنے سے روکنے والا ہے۔

"دوسری چیز یہ کہ میری عمر ستائیس سال ہے اور مَرس کی عمر تیئیس سال، وہ ایک ہی سال میں مجھ سے اُکتا جائے گا۔ اور مجھے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیگا اور اگر تم جاننا ہی چاہتے ہو تو ایک وجہ یہ بھی ہے کہ......

بہت ممکن ہے...... بہت ممکن ہے میرے جذبات سرد پڑجائیں گے اور...... میں اُس سے اُکتا جاؤں، نہیں میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی۔"

"میں تمہیں دھکے دیکر گھر سے نکال دوں گا۔" نکولی نے چلّا کر کہا، اور زور سے زمین پر پاؤں مارا۔ "میں تمہیں گھر سے باہر نکال دوں گا، بدکار، چھنال!"

"دیکھا جائے گا" اس نے کہا اور باہر چلی گئی۔

باہر دن کی روشنی پھیل گئی تھی، لیکن ڈاکٹر ابھی تک اپنی میز پر بیٹھا ہوا تھا، اور اس کی پنسل خود بخود کاغذ پر چل رہی تھی۔

"میری جان........ ننھے پاؤں"

یا پھر وہ کمرے میں گھومنے لگتا تھا، اس تصویر کے سامنے جو آج سے سات سال پہلے اس کی شادی کے بعد لی گئی تھی اور اس کی طرف بہت عرصہ تک دیکھتا رہا۔ یہ پورے گھر بھر کی تصویر تھی۔ اس کے خسر، خوشدامن، اس کی بیوی اولگا جب وہ بیس سال کی تھی، اور وہ خود ایک خوش باش اور نوجوان خاوند کی شکل میں۔

اس کا خسر داڑھی مونچھ صاف، ایک بیمار سا پیوی کونسلر تھا، دوست کا بے انتہا بھوکا۔ اس کی خوشدامن ایک گٹھے ہوئے اور پتلے پتلے بھوکے سے نقوش کی عورت تھی کسی نیولے کی طرح۔ اپنی لڑکی سے بیحد محبّت کرتی تھی یہاں تک کہ اگر وہ اس کو کسی غیر مرد سے......... دیکھتی تو اپنے کرتے کے دامن سے پردہ پوشی کرتی۔ اولگا بھی نازک اور بھوکے سے نقوش کی لڑکی ہے، لیکن ماں سے زیادہ بیباک وہ نیولا نہیں بلکہ اس سے بھی بڑے قسم کی جانور ہے۔ اور نکولی خود تصویر میں ایک سیدھا سادھا، نرم فطرت اور صاف دل جوان نظر آتا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک طالب علم کی سی آزادروی مسکرا رہی ہے۔ اور اس آزادروی میں اعتبار کی سی جھلک ہے، شاید یہ شکاری جانور جن کے پنجوں میں وہ گرفتار ہوگیا ہے اسے خوشی اور محبّت کی دوست دے سکیں۔ اور شاید اس کے وہ خواب پورے ہوسکیں جنھیں وہ طالب علمی کے زمانہ میں دیکھا کرتا تھا

(بقیہ مضمون صفحہ ۶۸ پر ملاحظہ کیجئے)

کسوٹی

کسوٹی

کیا گوری کیا سانولی

ایشیا کا یہ مسلک نہیں رہا ہے کہ وہ ماہانہ ہو کر ماہانہ رسائل سے اخذ و اقتباس کرے، کیونکہ ہمارا خیال ہے کہ ملک میں جو رسائل مقبول اور مشہور ہیں وہ اہلِ نظر کی نگاہوں سے گذرتے ہی ہیں، لیکن میراجی کا یہ مضمون اپنی حیثیت میں مفید و دلچسپ ہے اس لئے شائع کیا جاتا ہے۔۔ ساغر

پہلے انسان کو صرف عورت کی ضرورت تھی پھر زندگی پھیلتی گئی اور طبیعت رنگ بدلتی گئی یہاں تک کہ آج عورت کی مختلف قسمیں ذہن انسانی کا مرکز ہیں۔ سرو قد، بوٹا سا قد، بھرے بھرے سڈول اعضا، چھریرا جسم، حسن صبیح، حسن ملیح، غزالی آنکھیں، متوالی آنکھیں، باتیں ہی باتیں ہیں اور اس میں کسی کا کیا بس، دل ہی تو ہے ۔۔۔۔ لیکن ڈانوا ڈول ہوتے رہنے کے باوجود کوئی نہ کوئی وجہ تو اپنے انتخاب کی رکھتا ہو گا۔ عظمت اللہ کہتے ہیں ؎ ۴۷

کیوں مجھے تیری چاہ ہے اس کو کیوں پوچھے

جس کی بوجھن کچھ نہیں اس کو کیوں بوجھے

گویا دل کوئی سبب پیش نہیں کرسکتا تو آئیے ہم دماغ سے کام لینے کی کوشش کریں۔

ابتدا ہی سے اندھیرے اجالے کا ساتھ رہا ہے لیکن انسان نے ہمیشہ اجالے کو اندھیرے پر ترجیح دی ہے۔ ممکن ہے اس پسند کی علت تاریکی سے خوف ہو، وہ خوف جو مذہب کی ایجاد کا باعث بنا۔ اور یوں ہی کتب میں دیوی دیوتا اور فرشتے اور حوریں ہمیں گورے ہی دکھائی دیتے ہیں اور شیطان تاریکی کا بادشاہ۔ پھر بھی تہذیب تمدن کی ترقی یافتہ منزلوں میں ہمیں چارلس باڈلیئر ایسے شعرا یہ کہتے سنائی دیتے ہیں:۔

"اس کی ہر بات کالے رنگ کی ہے، وہ تو روح شبانہ دکھائی دیتی ہے، روح تیرگی ۔۔۔ وہ ایک مہر آبنوسی ہے ایک نجم سیاہ اس کے باوجود نور، مسرت کی کرنیں اس میں سے پھوٹ رہی ہیں ۔۔۔ وہ ہمیں بیدار ذہنیں جو دونوں کے مطمئن خوابوں میں مسکراتا ہو، بلکہ ایک سانولی غضبناک دیوی (ہے)"

گو یا رنگ کا مسئلہ ایک ایسا بھید ہے جسے ہم ابھی تک پوری طرح نہیں سمجھ سکے۔ یہ تو ہر کسی کو معلوم ہے کہ رنگوں کا اثر نہ صرف جسمانی لحاظ سے ہم پر ہوتا ہے بلکہ ذہنی یا نفسی لحاظ سے بھی ہمارے احساسات اور خیالات ان سے تحریک پاتے ہیں اور ہر رنگ انسانی ذہن پر مختلف جسمانی یا تخیلی تاثر پیدا کرتا ہے اور اس نسبت سے ہر جذبے یا خیال کا بھی مختلف رنگ ہے مثلاً غصے کا سرخ، محبت کا گلابی، حسد کا سبز ۔۔۔ وغیرہ۔ مشرق میں مغرب کی بہ نسبت رنگوں کی اس گہری اہمیت کا احساس زیادہ پرانا ہے جس کی ایک مثال راگ راگنیوں کے رنگ ہیں اور یہ سلسلہ صرف آواز تک ہی نہیں ختم ہو گیا بلکہ روزمرہ کی زندگی میں بھی اس کا جال پھیلا ہوا ہے اور مختلف پہلو مختلف تشریحات کے حامل ہیں۔ سہاگن سرخ جوڑا کیوں پہنتی ہے، سادھو سنت جوگیا لباس کیوں پسند کرتے ہیں، بیوہ سفید ساڑھی ہی لپیٹے رکھتی ہے۔ سیاہ کپڑا سوگ کا نشان ہے پھر بیلے اور رنگ برنگے کپڑے پہننے سے طبیعت میں ایک چلبلا پن ایک امنگ پیدا ہو جاتی ہے اور یونہی ایک طبیعت کے مقابلہ میں کوئی چلبلا یا رنگیلا دل بھر کیلے اور رنگ برنگ کپڑوں کو پسند کرتا ہے۔

لیکن اس وقت ہمیں رنگوں کے اتھاہ بھید کے گوناگوں پہلوؤں کی بجائے صرف گورے اور سانولے پہلو پر غور کرنا ہے اور اس کے ساتھ ہی سرسری طور پر دیکھنا ہے کہ ادب اور خصوصاً اردو ادب میں اس لحاظ سے شعرا کا کیا مسلک رہا ہے نیز اس کی وجہ کیا تھی لیکن پہلے ہم انسان کے موجودہ علم کی روشنی میں جنسی انتخاب کے معیار کے اصولوں کو دیکھتے ہیں۔

ہیولاک ایلس کی تحقیق کے مطابق حسن کا احساس کوئی اضطراری یا ... نہیں اس احساس اور انتخاب کی بنیاد پانچ اصولوں پر ہے۔

اوّل۔ جمالیاتی خصوصیات کی داخلی بنیاد جس کی تمام تنوع ... یک جا ہوتی ہیں اور جس کے ذریعے سے نسائی حسن کے اس آدرش تک پہنچا جا سکتا ہے جو اب تک تمام نسلوں کے ذہین انسانوں کا مقصد رہا ہے۔

دوم۔ کسی نسل یا قوم کی معینہ اور امتیازی خصوصیات حسن کے آدرش میں اختلاف پیدا کر دیتی ہیں کیونکہ اکثر حسن نسلی یا قومی لحاظ سے جسمانی خصوصیات ...

کی انتہائی نشو و نما کا دوسرا نام ہے اور اسکے ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کسی قوم یا نسل کی جسمانی خصوصیات کی انتہائی نشو و نما اس قوم یا نسل کی صحت اور زورِ طبیعت کی انتہائی نشو و نما کا اظہار بھی کرتی ہے۔

سوم۔ اکثر ممالک میں حُسن کا ایک اہم اور عموماً لازمی عنصر ثانوی جنسی خصوصیات بھی ہیں، مثلاً عورت میں سر کے بال، چھاتیاں، کولھے اور اسی قسم کی اور بہت سی باتیں۔

چہارم۔ انفرادی ذوقِ سلیم، جس کی بُنیاد اور نشو و نما مخصوص نظامِ جسمانی اور ذاتی تجربات پر ہوتی ہے اور اکثر یہ انفرادی اجزاء اجتماعی صورت بھی اختیار کر لیتے ہیں اور یوں حُسن کے بدلتے ہوئے فیشن رائج ہوا کرتے ہیں کیونکہ ایک فرد کی شخصیت کا اثر کسی خاص بات کو بہت سے افراد کے ذہنوں پر طاری کر دیتا ہے۔

پنجم۔ جب تہذیب و تمدن ترقی کی انتہائی منازل میں ہوں تو بعض اور اعصابی افراد حُسن کا ایک غیر معمولی آدرش قائم کر لیتے ہیں اور اسکی بجائے کہ وہ اپنی قوم یا نسل کے قریب تر حُسن سے متاثر ہوں انہیں ایسی صورتیں اور مورتیں پسند آنے لگتی ہیں جو اُن کیلئے مانوس نہ ہوں بلکہ اجنبی، اچھوتی اور دور کی چیز ہوں۔

بُنیادی طور پر جنسی انتخاب کے یہ پانچ اصول ہیں لیکن میرے خیال میں اسکے ساتھ ہی ہمیں محبت اور نفرت کے تعلق کو بھی نہ بھولنا چاہئیے۔ بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ اگر کسی شخص کو کسی خوبصورت یا گوری عورت سے محبت میں ناکامی ہوئی ہے تو نفسی عمل نے نفرت کا احساس پیدا کر کے دوسری یا اُسے پہلی سے بالکل مختلف قسم کی عورت کی طرف راغب کیا ہے۔ چنانچہ فرانسیسی شاعر چارلس باڈلیئر کی سیاہ پسندی اسکی بہترین مثال ہے۔ اپنی نسل کی عورت سے بوجوہ محبت میں غیر مطمئن ہونے کے بعد اُسکے احساسات ایکدم حبشن پر مرکوز ہوگئے لیکن ایسی مثالیں استثنا کا درجہ رکھتی ہیں۔ کیونکہ انسانی رجحان زیادہ تر گورے رنگ کی طرف ہے اور اس سلسلے میں جب ہم مختلف اقوامِ عالم کے معیارِ حسن پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں ذیل کی وضاحت ملتی ہے۔

پہلا گروہ خالص سفید اقوام کا جو فطرتاً سفید رنگ کو پسند کرتی ہیں۔

ایران:۔ سفید اور چہرے کا گلابی رنگ۔

یونان:۔ سفید رنگ۔

فرانس:۔ سفید اور گلگوں، دودھ سی سفید کھال۔

جرمنی:۔ سفید اور گلگوں۔

آئرلینڈ:۔ برف سے زیادہ سفید کھال۔

ترکی:۔ سفید رنگ۔

دوسرا گروہ غیر خالص سفید اقوام کا جو غیر خالص ہونیکے باوجود سفید رنگ کو پسند کرتی ہیں۔

جاپان:۔ سفید کھلا ہوا رنگ۔

شام:۔ انجیل میں لکھا ہے، تیری گردن ہاتھی دانت کا مینار ہے۔

عرب:۔ اسکا چہرہ پورے چاند کا سا تھا اور رنگ (کالے) بالوں سے بالکل متضاد

اطالیہ:۔ مشہور شاعر پٹرارش کی محبوبہ برف سی سفید ہے۔

تیسرا گروہ غیر خالص گندمی رنگ والا جو گورے رنگ کو پسند کرتا ہے۔

ہندوستان:۔ اور ہندوستان میں قدیم تصور کے لحاظ سے پدمنی کی مثال نمایاں ہے جس کا رنگ کنول کی طرح مانا گیا ہے لیکن انتہائی مثال کے طور پر راجپوتانے کے ایک گیت کا مصرعہ بھی دیکھئے:۔

گورے مکھ پہ سہائے کالی چوندڑی

اُردو ادب کی طرف آنے سے پہلے ہندوستان کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہئیے۔ پہلے ہندوستان میں صرف سیاہی مائل اقوام بستی تھیں چنانچہ نہ صرف وہ خود بلکہ اُن کے دیوی دیوتا بھی سیاہ اور وحشتناک تھے اور کالی اور کرشن مہاراج کے تصور کی بُنیاد بھی انہی کے تصورات پر ہے۔ بعد ازاں آریہ لوگ اپنے سفید رنگ کو ہندوستان میں لائے، پھر یونانی آئے اور اپنے رنگ کی آمیزش کی، پھر مغل آئے اور انہوں نے رنگ کی غزل کا نہ صرف مطلع بلکہ مقطع بھی عرض کیا اور یوں ہندوستان مختلف رنگوں کا ایک کھولتا ہوا سمندر بن گیا۔

چونکہ ہمیں بُنیادی اقوام کا ادب حاصل نہیں ہے اس لئے ہم باہر سے آنے والوں ہی کے متعلق اندازہ لگاتے ہیں ظاہر ہے کہ آریہ رفتہ رفتہ یہاں کے لوگوں میں گھُلے مِلے ہوں گے۔ چنانچہ ابتدا میں انکے دیوی دیوتاؤں کے جتنے تصورات ہیں اُن میں گورے رنگ کو ہی فوقیت حاصل ہے۔ برہما گورے، شو گورے، پاربتی کا ایک نام ہی گوری، وشنو گورے، اُن کی لکشمی بھی گوری اور بہت بعد میں جا کر وشنو کے (غالباً) نویں اوتار کرشن مہاراج سانولے نظر آتے ہیں، لیکن رادھا پھر بھی گوری ہی رہتی ہیں۔ ادب میں پہلے زمانے کے لحاظ سے سنسکرت کے شاعر امرو کو دیکھئے جس کا زمانہ ۴۸۳ قبل مسیح اور ۳۸۰ بعد مسیح کے درمیان ہے۔

"تمہارے بال کندھوں پر بکھرے ہوئے ہیں،
اور وشم آدیت کا جنگل مصر اکیشی کے رنگین مندر کو اپنی گود کے
گھیرے میں لئے ہوئے ہے"

ظاہر ہے کہ رنگین جگمگاتا ہوا مندر سیاہی مائل نہیں ہو سکتا۔ امرو ہی کی ایک اور نظم میں جو بدھ کی بیوہ کی پیار رکھتا ہے، مرد کو چندر کہا گیا ہے اور اُس کی جلد گلاب کا ایک پھول ہے"۔

ایک اور مصرع دیکھئے :۔

"میں تو اُڑ کر اُس جگہ پہنچنے کو ہوں جہاں وہ میری راہ دیکھ رہا ہے، جو دن سے کہیں سُندر ہے۔"

ایک اور نظم میں عورت کہتی ہے :۔

"جب وہ کالی جھیل میں سے نہا کر نکلتا ہے تو گویا چاند رات میں نمودار ہوتا ہے۔"

اور جو ذرا سانولے ہیں وہ گورا بننے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ سنگار کے سلسلے میں

"۔۔۔ بڑے بڑے کنول کے پھولوں سے برادہ لے کر اپنی چھاتیوں پر چھڑک لیا۔"

امرو کے بعد سنسکرت ادب کو چھوڑ کر ہم صوبائی رجحانات کی طرف آتے ہیں۔ بہار کے شاعر ودیاپتی نے سنسکرت ادب ہی کی روایات کے سہارے پر اپنے ذہنی عقیدے کو ذاتی محبت کے چھپانے کا ذریعہ بنایا اور اس لئے اسکے گیتوں میں رادھا گوری ہے اگرچہ یوں بھی رادھا کو گوری کہا جاتا ہے۔ چنانچہ

چہرہ جیسے بجلی چمکے ۔۔۔ اور کاندھے پہ بال گھٹا سے

ایک اور شعر

"چاند کنول کو گود میں لے کر ۔۔۔ ڈوب گیا مستی میں یکسر"

اس شعر میں چاند کرشن مہاراج ہیں اور یہاں ودیاپتی نے سانولے سلونے شام کی نسبت کا لحاظ بھی نہیں رکھا۔

اور سُنئے : ۔۔۔ رادھا چھپ کر ملنے جا رہی ہے ؎

انگ انگ رادھا کا ایسی سُندر جوت جگائے
چندر اُجالا جس کے اندر گھُل مل کر کھو جائے
نین کسی کے دیکھ نہ پائیں دیکھیں تو کب جانیں
رادھا اور چندرماں ایک ہوں، کیسے مانیں ؟

ممکن ہے کہ رادھا کا گورا تصور کرشن کے سانولے پن کے مقابل میں محض اضافی حیثیت رکھتا ہو لیکن گورے رنگ سے رغبت بہرحال ظاہر ہے۔

ودیاپتی کا ہمعصر چنڈی داس ہے جو بنگالی تھا۔ بنگالیوں کے متعلق کچھ کہنے سُننے کی ضرورت نہیں لیکن اسکے ہاں بھی رادھا اگرچہ اسکی اپنی محبوبہ رامی دھوبن کا ایک عکس ہے پھر بھی گوری ہی دکھائی دیتی ہے۔

اُردو شعرا گورے اور سانولے رنگ کے لحاظ سے عجب ڈھلمل قسم کے رہے ہیں اور ان کے ہاں اکثر دونوں رنگوں کا ذکر دکھائی دیتا ہے بعض شعرا اس لحاظ سے ممتاز نظر آتے ہیں۔

ہندوستانی زندگی میں سانولے رنگ کی کثرت کے باوجود یہاں کے گیتوں اور ٹھمریوں میں بھی جہاں عموماً

"سانولی صورت، میرا من"

دکھائی دیتا ہے وہاں

"گورے مکھ پہ سہائے چوندڑی" بھی نظر آتا ہے اور یہ بھی اسے جہوتا کے علاقے میں جہاں کے ریگستان میں پانی کو بھی شاید مل جائے صحیح معنوں میں گورا رنگ نادر معدوم ہی کا حکم رکھتا ہے کیونکہ پیلے رنگ کو گورا نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن یہ شاید مختلف نسلوں کے رنگا رنگ اجتماع کا اثر ہے اغلباً قدیم ہندوستان میں مغلوں کی آمد سے پہلے سفید رنگ مانوس ہونے کے باوجود کچھ خاص رغبت کا باعث نہ تھا۔

ولی دکنی گجرات کے سانولے حُسن کے گُن گاتا ہے۔ میر تقی کو فرقت کا غم اس قدر مارے ڈالتا ہے کہ معشوق کا حُسن ان کے کلام میں ایک ثانوی حیثیت اختیار کر جاتا ہے اسکے باوجود یہ شعر کہ

کیفیت اسکے لب کی کیا کہئے ۔۔۔ پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

گورے ہی رنگ کی ترجمانی کرتا ہے۔

میر حسن کی مثنوی کے قریباً تمام کردار گورے ہیں۔ چنانچہ بدر منیر کے متعلق کہتے ہیں ؎

۱۔ وہ ترکیب اور چاند سا وہ بدن ۔۔۔ وہ بازو پہ ڈھلکے ہوئے نورتن
۲۔ وہ مکھڑا جسے دیکھ مہ داغ کھائے ۔۔۔ وہ نقشہ کہ تصویر حیرت کو آئے
۳۔ زبس مثلِ آئینہ تھا اُس کا تن ۔۔۔ کہے تو کہ تھی ناف عکسِ ذقن
۴۔ وہ ساقِ بلوریں وہ اندازِ پا ۔۔۔ بھرے ہے سحر چشم و دل میں صدا
۵۔ سماں اُس گھڑی کا کہوں کیا میں آہ ۔۔۔ ستاروں میں تھا جلوہ گر ایک ماہ

نجم النساء کو دیکھئے :۔

۱۔ بھبھوکا سا تن اور مُنھ کی دمک ۔۔۔ کہ جوں شعلہ آتش سے اُٹھے بھڑک
۲۔ نہانے سے نکلا عجب اس کا روپ ۔۔۔ نکل آئے بدلی سے جس طرح دھوپ
۳۔ وہ مہتاب سا چہرہ ہو زرد زرد ۔۔۔ سراپا ہوا شکل اندوہ و درد

عیش بائی رقاصہ بھی گوری ہی ہے

۱۔ فقط کان میں ایک بالا پڑا ۔۔۔ کہے تو کہ تھا مہ کے ہالا پڑا
۲۔ لٹیں مُنہ پہ چھوٹی ہوئی سر بسر ۔۔۔ کہ بدلی ہو جوں مہ کے اِدھر اُدھر

یہ سب تو بڑے کردار تھے لیکن بدر منیر کی سائھنوں کو بھی دیکھئے :۔

۱۔ کئی ہمدم اُس کی جو تھیں ماہرو ۔۔۔ بچھائے ہوئے کرسیاں سو بسو

اسکے مقابل میں سانولے رنگ کی حمایت میں ولی کے علاوہ داغ اور انشا کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ انشا صنائع بدائع بہ رعایت لفظی کے زمانے

انشا اور اس زمانے کے شعرا پر خلوصِ جذبات کے لحاظ سے اعتبار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اکثر ان کے کلام میں محبوب کا رنگ شعر کی فنی باتوں سے معین ہو جاتا ہے پھر بھی انشا پہلا اُردو شاعر ہے جو سیّد اور نیز کی فارسی کا عالم ہونے کے باوجود اکثر سانولے رنگ کا ذکر کرتا ہے۔ چنانچہ

ہے نام خدا، وا چھڑے کچھ زور تماشا ـــــ یہ آپ کی رنگت
گات ایسی غضب، قہر پھبن اور جھمکڑا ـــــ اللہ کی قدرت

اور اس رنگت کی وضاحت اگلے ہی شعر میں ہے ؎

میں نے جو کہا ہوں میں ترا عاشقِ شیدا ـــــ اسے کان ملاحت
فرمانے لگے ہنس کے سنو اور تماشا ـــــ یہ شکل یہ صورت

اور دیکھیے ؎

یہ نمک، یہ چھب، یہ سج دھج، یہ ادا کو دیکھ تری
بتلاطمِ تحیّر ہوئے غرق ہوشمنداں ـــــ

ایک اور ؎ سانولے پن پہ غضب ہے دھج بسنتی شال کی
جی میں ہے کہ بیٹھیے جے اب کنہیا لال کی

غالب کے ہاں اگرچہ وہ داخلی ہوتے ہوئے بھی اپنی ہمہ گیری کی بنا پر غیر جانبدار شاعر ہے فطرتاً سفید رنگ ہی نمایاں ملتا ہے۔

مرزا رسوا عموماً ایک ناول نویس اور عالم کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن انکی شخصیت کے ساتھ اُن کی شاعری بھی دلچسپ اور قابلِ توجہ ہے۔ زندگی میں اُن کی محبوبہ ایک فرانسیسی عورت تھی لیکن جس طرح اپنے ناولوں میں انہوں نے آپ بیتی کے عنصر کو لوگوں کی نظروں سے چھپا کر پیش کیا ہے اسی طرح اپنی مثنوی امید و بیم کے ذریعے سے بھی اپنی محبوبہ کو

سانولا رنگ نشیلی آنکھیں   شوخ طرار رسیلی آنکھیں

الکر بات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بحیثیت عمومی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو شعراء کے محبوب کا رنگ عموماً جغرافیائی، نسلی اور روائتی اثرات سے نمایاں ہونے کے باوجود امتیازی حیثیت نہیں رکھتا لیکن غالب کے بعد کے زمانے میں دو مثالیں مجھے نہایت درخشاں طور پر دکھائی دیتی ہیں یعنی عبدالرحمٰن بجنوری اور عظمت اللہ مرحوم۔ ان دونوں شاعروں کی ایک ایک نظم گورے اور سانولے حُسن کی تعریف میں ہے اور اپنی مختلف خوبیوں کی بنا پر میں یہ دونوں نظمیں پیش کرتا ہوں۔

پہلے بجنوری کو سُنیئے

(۱) صنمِ فرنگ قمر جبیں، بتِ سیم رنگ، غضب حسیں
وہ عذار نازک و شرمگیں کہ رقیبِ ساغرِ آتشیں
وہ ہوا میں کاکلِ عصفریں کہ شہابِ ثاقبِ شب رواں

(۲) ورقاتِ غنچۂ گلاب گوں دو لبِ گداز پر از فسوں
مژۂ دراز و کج و نگوں میں نہاں وہ دیدۂ نیلگوں
کہ سحر کے پردۂ ارغواں میں فضائے گنبدِ آسماں

(۳) تجھے میں نے دیکھا ہے اک نگہ نہیں مجھ سے تو ذرا آشنا
ترے عشق میں ہوں میں مبتلا بسلا سل الم و بلا
مجھے کیا پتہ کہ ہے اب کہاں، تجھے کیا خبر گئی کس کی جاں

بجنوری کی نظم میں ایک گوری عورت کو جس جابکدستی سے پیش کیا گیا ہے وہ ایک سانولے حُسن کے متوالے کو بھی للچا سکتا ہے اور یہی کیفیت عظمت اللہ کی نظم میں ہے سُنیئے:۔

سندر صورت سندر ہی ہے رنگت گوری یا کالی
اندھر دیس کی سُندر پتری کالی کوئل سے کالی
بال بھی کالے گھنگھور گھٹا
ہونٹ وہ گدرے جامن کے سے اور اُداہٹ میں لالی

. . . .

بڑی بڑی سی آنکھ غلافی پتلی بھنورا سی کالی
خمار اک مستانا چھایا
وہ من موہنی مقناطیسی ان میں چمک ناگن والی
آنکھ لڑی اور دل کو لُبھایا
اور سراپا گدرا گدرا، سانچے میں ڈھلا، لچکیلا
جوشِ جوانی، پھوٹتا جوبن
بھرا بھرا سا ڈھلا ڈھلا سا وہ اک اک عضو سجیلا
وہ ہر چیز کا بے ساختہ پن
اک موج مچلتی مچلاتی چڑھتی اُترتی تھرّاتی
اور گردن کا نفیس ڈھلاؤ
سینے کا جوالا مکھ، کمر لچکتی، بل کھاتی
ہوش ربا اُتار چڑھاؤ
سُندر صورت سُندر ہی ہے رنگت گوری یا کالی
فطرت نے جس رنگ میں ڈھالی
فطرت کے لئے حُسن یہی ہے سج دھج کرانے والی
جان کی کھیتی جوتنے والی

مضمون تو ختم ہو گیا لیکن کوئی صاحب شاید یہ پوچھیں کہ عنوان پوری طرح چسپاں نہیں ہوتا لیکن میں کہوں گا کہ اپنے لئے سب برابر ہیں۔

کیا گوری، کیا سانولی   میراجی

نئی کتابیں

جگ بیتی

پنڈت جواہرلال نہرو کے ان خطوط کا ترجمہ ہے جو انہوں نے مختلف جیلوں سے اندرا کے نام لکھے ہیں۔ یہ تمام خطوط انگریزی میں ہیں۔ محمود علی خاں نے ان کا ترجمہ کیا ہے۔ کتاب مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہوئی ہے قیمت تین روپے مجلد۔

یہ تمام خطوط تاریخ عالم کا ایک ہلکا سا خاکہ ہیں یا یوں کہیئے کہ تاریخ کے جس قدر ضروری جزو ہیں اس کتاب میں پیش کر دیئے گئے ہیں۔

آجتک جس قدر تاریخیں اردو یا انگریزی میں لکھی گئیں ان تمام میں غلط واقعات کی اس قدر بھرمار ہے کہ ایک صحیح دل و دماغ کا آدمی انہیں پڑھتے پڑھتے اُکتا جاتا ہے اور غصہ سے کہیں کہیں خود بخود اس کی مٹھیاں بھنچنے لگتی ہیں۔ جہاں تک خیال کیا جا سکتا ہے ان تمام تاریخوں کے پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سب تعصب کا رنگ لئے ہوئے ہیں۔ خصوصًا وہاں سے جہاں ہندوستان پر مسلمانوں کے حملے شروع ہوتے ہیں۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ اور ممالک پر عربوں کے حملوں کو بربریت اور ظلم کی ایک داستان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن پنڈت جواہرلال کی یہ کاوش ایک صحیح اور سنجیدہ کاوش ہے انہوں نے چیزوں اور واقعات کو کہیں بھی غلط پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔

پنڈت جی کی نگاہوں نے چیزوں کو ان کے اصل روپ میں دیکھا ہے اس لئے ہمیشہ صحیح دیکھا ہے۔ اگر پرانی تاریخوں میں کچھ واقعات درست بھی ہیں تو ان پر غلط بیانی کا رنگ چڑھا دیا گیا ہے اور لکھنے والوں نے عجیب عجیب تاویلیں کی ہیں جو آج تک ہندو اور مسلمانوں میں منافرت پھیلانے کا ذمہ دار ہے اور تمام تر منافرت پھیلائی گئی تاریخ کے ہی ذریعہ۔ جب ہم سکول کی بنچ پر تاریخ کی کتاب لے کر بیٹھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم دراصل تاریخ نہیں بلکہ کچھ سوچنے سمجھنے والے جانوروں کی کہانیاں پڑھ رہے ہیں جو اکثر اپنی کمینگاہوں میں چھپے رہتے ہیں اور موقع ملنے پر حملہ کر بیٹھتے ہیں۔ غرضیکہ پرانی تاریخوں کے کچھ اجزا کے بارے میں بلاشک وشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ غلط باتوں کی غلیظ پوٹ ہیں۔

پنڈت جی واقعات کو غلط بیانی کے رنگ میں نہیں رنگنا چاہتے اسکے علاوہ وہ ہندو مسلمانوں یا ہندوستان کی دو بڑی قوموں میں منافرت پیدا کرنے کے بھی قائل نہیں، تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ دروغگوئی کے بھی متحمل نہیں ہو سکتے اس لئے واقعات کی غلط تاویلیں نہیں کر سکتے۔

ہم اس کتاب کو پڑھ کر ایک نشان لگا سکتے ہیں کہ یہاں سے تاریخیں اپنے صحیح رنگ میں پیش ہوتی ہیں۔ مسلمانوں نے ہندوستان کے مندروں پر حملے کئے لیکن اسکی وجہ تعصب نہیں بلکہ "مندروں کو تباہ کرنے کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ پرانے مندر عمومًا قلعے اور گڑھ کی حیثیت سے بھی استعمال ہوتے تھے۔ جنوب کے بہت سے مندر آج بھی قلعوں سے مشابہ ہیں جہاں حملوں کی صورت میں لوگ پناہ لے سکتے ہیں۔"

غرضیکہ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے خصوصًا وہ جو انگریزی سے واقف نہیں ان کیلئے یہ کتاب تاریخ تک پہنچنے کا ایک اچھا ذریعہ ہے۔

ادب کثیف

مصنفہ حاجی لق لق، شائع کردہ مکتبہ اردو لاہور قیمت ایک روپیہ۔

حاجی لق لق کا خیال ہے کہ غالب نے درست ہی کہا تھا ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتا

حاجی لق لق کی یہ کتاب طنزیات کا ایک مجموعہ ہے جس میں وہ کہیں کہیں بے سروپا باتیں کرنے لگتے ہیں لیکن اکثر جگہ بڑے لطیف اور دلکش پیرایہ میں طنز کرتے ہیں۔ اُردو میں ہمیں شعراء میں تو ایک دو معروف و غیر معروف طنز نگار نظر آتے ہیں۔ لیکن نثر میں ابھی تک بہت کمی ہے۔ اگر کچھ ہیں بھی تو چند مزاحیہ نگار ہیں۔ یہ تمام دور جدید کی پیداوار ہیں۔ لیکن لق لق کے یہاں مزاح اور طنز کا ایک اچھا خاصا امتزاج نظر آتا ہے۔

لق لق کا اسلوب پُرامید ہے، وہ اسے جدت اور دلچسپی کی گہری شکل دے سکتے ہیں۔ لیکن جب وہ بے معنی باتیں کرنے لگتے ہیں تو ایک قسم کی کوفت سی ہونے لگتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر وہ طنز نگاری کو بھی ادب کی ایک باقاعدہ صنف سمجھیں اور اسے ایک فن کار کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کریں۔ مثلاً ان کے "جاپان سپید آفتاب" کے عنوان سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہر قسم کے نقالوں پر ایک اچھا طنز کرینگے لیکن نہیں کرتے اور بہکی بہکی باتیں کرنے لگتے ہیں ہاں ان کی "آسمانی حور"، "آؤ چلیں" وغیرہ قسم کی چیزیں اچھی ہیں۔

حیوانی دُنیا کے عجائبات

مصنفہ عبدالبصیر خاں، شعبۂ حیوانیات، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔ شائع کردہ انجمن ترقی اُردو دہلی قیمت عہ۔

اب ہماری زبان مضامین کے لحاظ سے اتنی امیر ہوتی چلی جارہی ہے کہ وہ دن دور نہیں جب اس میں ہر موضوع پر اچھی اور عمدہ کتابیں دستیاب ہوسکیں گی۔ چونکہ ہمارے ملک کی فضا میں اس وقت تک محض حُسن و عشق گشت کررہے تھے، جتنی کتابیں بھی تھیں وہ سب اس قسم کے خیالات سے پُر تھیں مگر اب بہت سے ٹھوس مضامین اور خیالات اس میں آتے چلے جارہے ہیں اور یہ سب اس بہت مختصر وقت میں ہوا ہے بلا شبہ اس دور کو ہم نشاۃِ ثانیہ سے تعبیر کرسکتے ہیں۔

اس کتاب میں عبدالبصیر خاں نے حیوانی دُنیا کے بہت سے دلچسپ اور حیرت انگیز واقعات بیان کئے ہیں۔ حیرت انگیز اس وجہ سے کہ ہماری توجہ کبھی جانوروں کی طرف مبذول نہیں ہوئی تھی۔ جب یہ چیزیں ہماری نظروں کے سامنے آتی ہیں تو ہم ایک قسم کی حیرانی کا اظہار کرتے ہیں۔

اب تک عام خیال یہ تھا کہ تمام جانور محض (INSTINCT) جبلّت کے تحت میں کام کرتے ہیں لیکن اب معلوم ہوتا جارہا ہے کہ جانور کچھ عقل بھی رکھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں جانوروں کا بڑا حصّہ اب بھی اپنی جبلّت کے بھروسے پر زندگی بسر کررہا ہے لیکن وہ جانور جن کا دماغ بڑا ہوتا ہے اس میں (COMPLEXITY) اُلجھاؤ بھی ہوتا ہے اور یہی اُلجھاؤ ان کی عقل کی دلیل ہے۔ اس معاملہ میں آدمی کا دماغ بہت (COMPLEX) ہے اسی لئے انسان تمام جانوروں میں سب سے بلند مرتبہ رکھتا ہے۔

جانوروں میں اخلاق بھی ہوتا ہے۔ چیزوں اور واقعات کو پہلے سے جان لینے کی قوّت بھی اور یہ کہ ان کا رنگ کہاں تک ان پر اثر انداز ہوتا ہے یہ تمام باتیں اس کتاب کی دلچسپی کا سبب ہیں۔ ان لوگوں کے لئے جو جانوروں سے دلچسپی رکھتے ہیں یا اس علم سے دلچسپی رکھتے ہیں یہ کتاب بہت مفید ہے۔ اسکے علاوہ اگر یہ کتاب پڑھنے کی خاطر بھی خریدی جائے تو دلچسپی سے خالی نہیں اور معلوماتِ عامّہ کا سبب ہوگی۔

نغمۂ زندگی

یہ فضل احمد کریم صاحب فضلی کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ملنے کا پتہ دفتر انجمن ترقی اُردو دہلی اور فضل برادران لمیٹڈ، کینٹ ہاؤس، مشن روڈ ایکسٹنشن، کلکتہ۔

فضلی پر "سادگی و پُرکاری" کا مقولہ بڑی حدتک صادق آتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا اندازِ بیان اچھوتا اور نرالا نہیں بلکہ تقلیدی ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ مقلّد تقلید میں کامیاب کہاں تک ہے۔ فضلی اپنی اس کوشش میں بڑی حدتک کامیاب ہے اسکے یہاں الفاظ اور تراکیب کے ساتھ ساتھ بیان کی سادگی اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ اس نے پرانوں کے اسالیب سے کافی استفادہ کیا ہے۔

جہاں تک فضلی کی نظموں کا تعلّق ہے وہ فن کے لحاظ سے کوئی درجہ نہیں رکھتیں۔ نظم میں وہ اتنے کامیاب نہیں جس قدر غزل میں ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ قدرت نے انہیں محض غزل گوئی کیلئے پیدا کیا ہے۔ ہمارے شعراء میں ایک عام مرض یہ ہے کہ وہ ہر طرف پیر پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ یہ مسلمہ امر ہے کہ ہر آدمی صرف ایک ہی میدان میں تنوّع پیدا کرسکتا ہے اور مزاج کی رو کسی ایک ہی شعبہ میں کوئی نئی چیز خلق کرسکتی ہے۔ یوں دوڑنے کو آدمی ہر طرف دوڑ سکتا ہے مگر وہ بات نہیں پیدا ہوتی جو اس چیز میں ہوتی ہے جس سے طبیعت کو ایک فطری لگاؤ ہو۔

غزل کے اچھے اشعار کی ایک یہ بھی خصوصیت ہے کہ وہ ایک یا دو مرتبہ سُننے کے بعد فوراً یاد ہو جاتے ہیں۔ فضلی کے اکثر اشعار میں یہ بات پائی جاتی ہے۔

آپ نے ہم سے بے وفائی کی
اب کسی بات کا یقیں نہیں رہا

آگ سا چہرہ پانی پانی
اف رے مرا شرمانے والا

ہمراز نہ تھا جب تک رہتی تھی گراں جانی
اب ہے یہ پریشانی ظالم نہ کہیں کہہ دے

پریشان ہونے سے اب فائدہ؟
کہ جو بات ہونی تھی وہ ہوچکی

دیوان جوشش

مرتبہ قاضی عبدالودود صاحب، شائع کردہ انجمن ترقی اُردو، دہلی۔ قیمت عہ

جوشش عظیم آباد کے اُن شعراء میں سے ہے جو میر و مرزا کے زمانے میں زندہ تھے۔ اس کی زندگی کے کچھ زیادہ واقعات ہم تک نہیں پہنچتے۔ مثلاً یہ کہ بچپن اور جوانی کیونکر گذری۔ قاضی صاحب نے اس کتاب کی ترتیب میں بڑی کاوش کی ہے اور تقریباً ابتدا کے سوسے

زائد صفحات میں جوشش کے خاندانی حالات اور اسکی زندگی کے دوسرے واقعات معلوم کر کے حُسن کے ساتھ لکھے ہیں۔ جہانتک جوشش کی زبان کا تعلق ہے وہ وہی ہے جو اسکے ہمعصر شعرا کی زبان تھی لیکن اندازِ بیان میں کہیں کہیں میر کا انداز جھلکنے لگتا ہے۔

جوشش کی طرح اور نمعلوم کتنے شعرا گذرے ہونگے جنہوں نے اُردو میں اچھے خیالات کا اضافہ کیا ہوگا مگر وہ منظرِ عام پر نہ آسکے انجمن ترقی اُردو کی کوششیں اس سلسلہ میں قابل تحسین ہیں کہ اس نے بہت سی ایسی کتابوں سے جو بہت اچھی تھیں مگر عوام ان سے واقف نہ تھے واقف کرایا۔

جوشش کے رنگ اور زبان سے تھوڑی بہت واقفیت پیدا کرانے کے لئے نمونہ کے طور پر اُن کے چند شعر سُنئے:۔

اس تغافل شعار کی باتیں — میں کوئی اعتبار کرتا ہوں
مرگیا ہوں پر اسکے آنے کا — اب تلک انتظار کرتا ہوں
زہر کے گھونٹ گھونٹ کر تجھ بن — صبح دقع محار کرتا ہوں
کیوں نہ مجھ پر کرم کرے جوشش — جان اس پر نثار کرتا ہوں

تمہیدی خطبے

یہ گارسان دتاسی کے تمہیدی خطبے ہیں جو وہ اُردو زبان پر ہر سال کے آغاز میں دیا کرتے تھے۔ انجمن ترقی اُردو دہلی سے شائع ہوئے ہیں۔ اس کتاب میں دتاسی کے صرف چھ خطبے شامل کئے گئے ہیں۔ قیمت درج نہیں۔

گارسان دتاسی یورپ کے ایک بہت بڑے مستشرق گزرے ہیں وہ اُردو کے بڑے ہی خواہ تھے۔ فرانس میں شعبۂ اُردو کے وہ پہلے پروفیسر تھے بلکہ شعبۂ اُردو کھلا ہی ان کی وجہ سے تھا۔ انہیں اُردو سے اتنا لگاؤ تھا کہ انہوں نے باغ و بہار، قصۂ گل بکاؤلی اور اسی قسم کی بہت سی کتابیں جو اس زمانہ میں شائع ہو رہی تھیں ان کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب میں ان کے ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۵ء تک کے خطبے شامل ہیں۔

دتاسی نے اپنی ساری زندگی مشرق کی زبانوں خصوصاً اُردو کی تحصیل اور ترویج میں گزاری۔ وہ ہر سال اپنے لکچر شروع کرنے سے پہلے اپنے طالب علموں کو جو نئے ہوں یا پُرانے ایک خطبہ دیا کرتے تھے جو اس ایک سال کی اُردو کی ترویج و ترقی پر ایک مکمل تبصرہ سا ہوتا تھا۔ انہیں میں سے چھ خطبوں کا ترجمہ اس کتاب میں ہے۔

ہماری غذا

یہ رابرٹ میکرسن کی تصنیف ہے جسے مبارز الدین احمد رفعت نے ترجمہ کیا ہے انجمن ترقی اُردو دہلی نے شائع کیا ہے۔ قیمت ۸؍

ہمارے یہاں اس قسم کی کتابوں کی جن میں ٹھوس مضامین ہوں بہت کمی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے ہمیں بتایا ہے کہ غذا کا مقصد کیا ہے اور اس سے جسم کی تعمیر کیونکر ہوتی ہے۔ اسکے علاوہ انہوں نے بتایا ہے کہ پروٹین اور حیاتین کیا ہے اور ان کی کتنی قسمیں ہیں اور کس جانور میں اور کس سبزی میں یا دالوں میں ان کی مقدار زیادہ ہوتی ہے یا کس میں کتنی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ہمارے سامنے ایک ایسا گائڈ آجاتا ہے جو ہمیں ہماری خوراک اور اسکے اصول سے واقف کرا دیتا ہے۔

ہر قسم کی سبزی، گوشت اور دالوں کے بارے میں حیات سے متعلق اس میں ہدایات اور ان کا تذکرہ ہے۔

وہ لوگ جو صحت کو ہزار نعمت سمجھتے ہیں ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ

شائع کردہ انجمن ترقی اُردو دہلی قیمت ۱۲؍

ہمارے یہاں اُردو میں منظوم تاریخیں معدودے چند ہیں اور انہیں بھی عموماً وہ لوگ زیادہ دیکھتے ہیں جن میں تحقیق و تدقیق کا مادہ ہوتا ہے ورنہ تاریخ کے اکثر طالب علم ان کی طرف سے بے نیاز ہیں۔ کسی چیز کو نظم کرنے کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ اس کی دلچسپی بڑھ جائے تاریخ ان لوگوں کیلئے جنہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ایک خشک مضمون ہے اسے دلکش بنانے کا شعر ایک اچھا ذریعہ ہے اسکے علاوہ نثر کی نسبت نظم زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔ تاریخ کی حیثیت سے شعر کا وجود ہے بھی نثر سے قدیم۔ شعر کا تعلق دماغ کی ان لطیف کیفیتوں سے ہے جہاں آدمی پرواز کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن جب شعر پر پابندی لگ جاتی ہے اس وقت وہ جذبۂ لطیف اتنا آزادی کے ساتھ کام نہیں کرتا جتنا آزادی کے ساتھ بغیر کسی پابندی کے کام کرتا ہے۔ لیکن اگر کوئی دماغ کسی قید کے باوجود نہایت عمدگی اور سلیقہ کے ساتھ نظم کے اصل محاسن قائم رکھتے ہوئے شعری تخلیق کرے وہ یقیناً خلاق اور قادر ہے۔ یہ تاریخ بھی ایک پابندی کے ساتھ نظم کی گئی ہے۔ تاریخ کو نظم کرنے سے پہلے شاعر نے موضوع کے مآخذ اور اپنے ماٰمے میں مختصراً

بہت کچھ کہدیا ہے ؎

ہے تاریخ مطبوع جو اک اچھی | وہ ہے نثر میں اور ہے فارسی
کیا نظم اُردو میں اس کو تمام | کہ ہوں مستفیض اس سے سب خاص و عام

ان اشعار سے معلوم ہو جاتا ہے کہ شاعر نے ابو الفتح ضیاء الدین محمد کی تاریخ دکن کا ایک باب جو سلطنت بہمنیہ سے متعلق ہے اس کا ترجمہ فارسی نثر سے اُردو نظم میں کیا ہے۔ سہیل دکن کا اک شاعر ہے جس کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں اسکے حالات زندگی کے متعلق تفصیل کے ساتھ کچھ نہیں ملتا، ہاں اسکے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اس کام کو اپنی عمر کے آخری حصہ میں شروع کیا ہے ؎

جوانی کا آتا ہے جس دم خیال | تو ہوتا ہے بس دل میں جوش و جلال
گئی عمر مانند آبِ رواں | ہوا باغ تن پائمال خزاں
کہاں وہ طبیعت کا جوش و خروش | قریں ہے کہ ہو شمع ہستی خموش
مگر رہ گیا میں پسِ کارواں

شاعر تاسف جوانی پہ کچھ رسمی اور روایتی معلوم ہوتا ہے لیکن ہماری واقفیت کے لئے بہت کافی ہے۔ سلاطین بہمنی کے بارے میں بھی تاریخ میں بہت ردوکد ہے۔ عام روایت ہے کہ حسن دہلی میں کسی منجم برہمن کا ملازم تھا۔ برہمن نے اسپر بہت مہربانی کی اور کچھ آراضی دہلی کے گرد و نواح میں کاشت کیلئے دے دی حسن کو ایک مرتبہ برہمن کے دئے ہوئے کھیت میں سے کچھ اشرفیاں ملیں تو وہ اس نے لیجا کر برہمن کی خدمت میں پیش کردیں۔ برہمن بہت خوش ہوا اور دربار میں جاکر حسن کی ایمانداری کی تعریف کی پھر اس کا زائچہ دیکھا اور بزرگی کے آثار دیکھ کر اس سے بولا ؎

ہو درجات عالی پہ تجھ کو سعود | سعادت ہے تیری جبیں سے نمود
بفضلِ الٰہی ہے تو خوش نصیب | ترا طالع چمکیگا اب عنقریب
مرے ساتھ یہ عہد و میثاق کر | ترقی پہ ہو جبکہ تو جلوہ گر
مرا نام ہو جزو اسم کرام | ترے ساتھ روشن ہو میرا بھی نام

اور اسی وجہ سے اس نے حسن گنگو بہمنی نام رکھا لیکن اسکے علاوہ ایک اور بھی روایت ہے جسے سہیل نے بیان نقل بھی کردیا ہے ؎

عجم کے جو مشہور ہیں تاجدار | کہ بہمن تھا ایک اور اسفندیار
ملقب ہوا بہمنی جو حسن | یہ تھا نسل بہمن سے بے ریب و ظن
تھا عالی نسب اور عالی نہاد | حسن نام تھا اور کیانی نژاد

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ حسن نے اپنے نسلی امتیاز کو قائم رکھنے کے لئے یہ لقب اختیار کیا۔ جہاں تک نظم کا تعلق ہے نہایت خوب ہے۔ پڑھتے وقت کہیں کہیں مثنوی سحر البیان کا لطف آنے لگتا ہے مگر چونکہ سحر البیان جیسی چیزوں کی تفصیل نہیں اس لئے فوراً وہ لطف جاتا رہتا ہے۔ بہرحال اتنا ضرور ہے کہ پوری کتاب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس قسم کی چیزیں بہت نایاب ہوتی ہیں۔ یہ انجمن ترقی اُردو کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ہمیں ایسی نایاب چیزیں اُردو میں مل رہی ہیں۔ اہلِ ذوق کو چاہئے کہ اسے ضرور خریدیں۔

محمد رسول اللہ

مترجمہ مولانا عبدالرحمٰن عاقل رحمانی، پبلشرس، کتابستان، پوسٹ بکس ۱۶۹۲ بمبئی نمبر۳۔ قیمت آٹھ آنے۔

یہ کتاب کارلائل کے ہیرو اور ہیرو ورشپ کے ایک جزو کا ترجمہ ہے جو بہت خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے اور اصل مضمون کے محاسن اپنی جگہ پر قائم ہیں۔

ہمارے نزدیک اس کتاب کی اہمیت اس وجہ سے زیادہ نہیں ہو جاتی کہ اسے ایک انگریز نے لکھا ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ کارلائل اپنے دور کا ایک بہت بڑا فاضل اور بہت بڑے دل و دماغ کا آدمی ہے اور اس کا قلم جس چیز پر بھی اُٹھے گا وہ بہت سوچ بچار کے بعد اُٹھے گا۔ اس تمام مضمون میں کارلائل ہمیں کہیں بھی جذباتی نظر نہیں آتا بلکہ نہایت ٹھوس دلائل کے ساتھ تمام مضمون میں رسولِ اکرم کی زندگی کو لیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ وہ شخص جسے مسلمانوں کی کسی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔ جب اس قسم کا موضوع لے کر بحث کرے گا تو بالکل ایک غیر جانبدارانہ حیثیت سے کریگا۔ کارلائل کے قلم اور آواز کا بڑا وزن ہے اور اسے اپنے دور میں بڑے عالم کا درجہ حاصل ہے۔ رسول اکرم کی زندگی اس انداز سے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس کا دماغ کسی غلط چیز کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں۔ اس کے کانوں میں رسولِ اکرم کے بارے میں جو کلمات پڑتے تھے اسے اس نے ایک عرصہ تک سوچا، رسول اکرم کی زندگی کا مطالعہ کیا، اسلام سے واقفیت بہم پہنچائی، اسکے اصولوں کو ناقدانہ نظر سے پرکھا، عرب کے پورے ماحول کو نظروں کے سامنے رکھا، تاریخ سے انحراف نہیں کیا اور تب کہیں جاکر صحیح انداز میں جو کچھ اس نے محسوس کیا وہ لکھ دیا۔

کتاب کسی خاص خوبصورت انداز میں نہیں چھپی ہوئی۔ کوئی اہتمام نہیں کیا گیا۔ لیکن ہاں وہ موضوع جو کتاب کے اندر بند ہے بہت ضروری اور اہم ہے۔ بحث مباحثہ کے خیال سے اس کا مطالعہ کوئی معنی نہیں رکھتا لیکن ہاں ایک صداقت کے متلاشی اور واقعات کو صحیح شکل میں دیکھنے والے کے لئے اس کا مطالعہ مفید اور ضروری ہے اس قسم کے لوگوں کیلئے گویا مذہب اسلام اور اسکی دعوت کے مطالعہ کیلئے ایک قدم ہے اور وہ لوگ جو محض انگریزی تحریر سے مرعوب ہو سکتے ہیں اسکے علاوہ کسی ہندی یا اعرابی کا قول ان کی نظر میں صادق نہیں ان لوگوں کے مرعوب کرنے کے لئے بھی اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے اس قسم کے لوگوں کیلئے کارلائل اور گوئٹے کا محمدؐ کو نبی مان لینا کافی دلیل ہے اس بات کی کہ وہ سچّے اور برحق تھے۔

گورکی کی آپ بیتی

مترجمہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری
شائع کردہ انجمن ترقی اُردو دہلی۔

یہ گورکی آپ بیتی کا پہلا حصہ ہے جس میں صرف اسکے بچپن کے واقعات ہیں۔ گورکی کا درجہ دورِ جدید کے افسانہ نویسوں اور ناول نویسوں کی فہرست میں بہت بڑا ہے لیکن اس کتاب کے دیکھنے سے

معلوم ہوتا ہے کہ ایک سوانح نگار کی حیثیت سے اس کا درجہ کسی سے کم نہیں۔

ہمارے موجودہ ادیب بڑی حد تک اُسی تحریک سے متاثر ہیں اور ہم آجکل جو اکثر کہانیوں اور افسانوں میں تیسرے طبقے کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں اس کا علم بردار بھی صحیح معنوں میں گورکی ہی ہے ڈاکٹر صاحب جب مقدمہ میں گورکی کے ماحول سے ہمیں واقف کراتے ہیں تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ گورکی سے پہلے کا طرزِ تحریر صرف اونچے طبقے کے لوگوں کی زندگی کی عکاسی کرتا تھا۔

ٹالسٹائی خود ایک بہت بڑا جاگیردار تھا۔ ظاہر ہے کہ اسکی کہانیوں کے کرداراس اونچے طبقے کے لوگوں سے لئے گئے ہیں اسکے علاوہ چیخوف بھی اس گروہ سے متعلق ہے اور بقول اختر حسین کے کہ عوام ابھی تک ادب میں ایک ...... محسوس کر رہے تھے۔ ایک اجنبیت اور کمی کا احساس ان کے دلوں میں جاگزیں تھا۔ گورکی پہلا شخص ہے جس نے لوگوں کی توجّہ کو اپنی طرف بڑی شدّت کے ساتھ کھینچا اور پہلی بار لوگوں نے محسوس کیا کہ کوئی انہیں میں سے بول رہا ہے اور ان کے دلوں میں جھانک کر اس آواز کو جو ایک گوشہ میں دبی ہوئی بھی باہر پھینک رہا ہے۔ انقلاب روس میں گورکی کا بڑا ہاتھ ہے۔

جو گورکی کی زندگی ہے وہی اس کا ادب ہے۔ اس کے ناول اور افسانہ پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر جگہ ایک کردار خود گورکی ہے کسی نہ کسی رنگ میں اسکی زندگی اور اس کا عمل اس کا ادب بھی مختلف چیزیں ہیں۔ وہ زندگی سے بے انتہا قریب اور زندگی سے یہ قربت ہی اس کی شہرت اور تکلیفوں کا باعث ہوئی۔

اس کی آپ بیتی بجائے خود ایک کہانی ہے، ایک امر کہانی۔ گورکی کی نانی، نانا اور ماموں اب بھی ہمارے گرد پھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسکے باپ جیسے متوالے اور بے فکر جوان اب بھی ہمارے گرد پھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسکے باپ جیسے متوالے اور بے فکر جوان اب بھی ہماری نگاہوں کے سامنے سے گزرتے رہتے ہیں۔ لیکن ہر شخص کے ہاتھ میں گورکی کا قلم نہیں۔ پھر آدمی کے پاس گورکی کی آنکھیں نہیں اور ہر انسان اتنا زود حس اور چیزوں کا متلاشی نہیں۔ ہر آدمی کو اپنی زندگی ایک شہد کی مکھیوں کا چھتہ نہیں معلوم ہوتا جہاں جاہل اور سیدھے سادھے لوگ اپنے تجربات لے کر آئیں اور انہیں مالا مال کر کے لوٹ جائیں۔

یہ واقعہ ہے اس ہندوستان میں بھی ہزاروں انسان ایسے ہیں، ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں جنکی زندگی اگر گورکی کی قسم سے لکھی جائے تو اس کی داستان کو بھی ماند کر دے۔ مگر جیسا میں نے کہا ہر شخص گورکی نہیں۔ جب اس قسم کی گفتگو ہمارے نزدیک کی جاتی ہے جیسی گورکی کے اردگرد ہوا کرتی تھی تو ہم گفتگو کرنیوالوں کو جھلا کر دھتکار دیتے ہیں، "کیا بکواس ہے، بیہودے وقت خراب کرتے ہیں، دماغ چاٹ لیا"۔ لیکن گورکی کا دماغ اس قدر موم نہیں جو اتنی آسانی سے چاٹا جا سکے بلکہ ایک لچکدار پتھر ہے جس پر یہ ساری چیزیں اپنے نقوش چھوڑ جاتی ہیں اور تیس چالیس سال بعد بھی اتنی ہی تروتازہ ہیں جتنی ابتدا میں تھیں۔

گورکی ایک لڑاکا، ضدی اور ...... بچّہ ہے۔ دن بھر دھما کے بجیں مگر وہ کا وہی۔ کوئی عجیب کردار نہیں۔ ہمارے عام بچّوں سے مختلف ہیں۔ دن بھر ہمارے معمولی گھرانوں میں ایسا ہی ہوتا رہتا ہے۔ ہر جاہل اور غریب گھر میں گورکی پلتے ہیں مگر افسوس تو یہ ہے کہ وہ آخر میں جا کر گورکی ثابت نہیں ہوتے۔ وہی مزدور جو پیسے روز کمانے والا، ایک میلی کچیلی عورت کا خاوند بطخ کے بچّوں کی سی

ایک قطار ساتھ لئے ہوئے، روتے، بھٹکتے، بھنبھناتے، اپنے ہی جیسے اور گورکی اپنے کثیف تعیش سے پیدا کرتا رہتا ہے۔

گورکی اپنے افسانوں کی طرح آپ بیتی میں بھی کردار کو پس منظر میں رکھ کر ماحول کو اُبھارتا ہے۔ اس کا ماحول ہی انسانی کردار کا ذمہ دار ہے۔ اس کا قلم ایک مصور کا قلم بن کر ماحول کی نقشہ کشی کرتا ہے۔ ایک جگہ ایک منظر یوں بیان کرتا ہے۔

"اسٹول پر کھڑے ہوکر میں بالائی ہیرو کے سے کارخانے کے پھاٹک کو دیکھ سکتا تھا۔ جیسے کسی بوڑھے بھکاری کے کالے اور پوپلے منہ کی طرح ادھ جلی لالٹینیں اُبالتی تھیں اور انسانوں کا گروہ اسکے اندر آجاتا تھا۔ دوپہر کو پھاٹک کا سیاہ دہانہ دوبارہ کھلتا اور کارخانہ ادھ جبا کے مزدوروں کو باہر اُگل دیتا۔ یہ لوگ کالی نالی کی مانند سڑک پر بہتے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ برفیلی ہوا کا جھونکا انہیں مکانوں کے اندر دھکیل دیتا۔"

یہ تمام واقعات اور ماحول وہ ہے جو چالیس سال بعد بھی گورکی کے دماغ میں روز اوّل کی طرح محفوظ ہے۔ یاد داشت اور قوتِ بیان ہی دو چیزیں گورکی کی میراث ہیں اور کہانیوں کے کردار پلاٹ، کہانیاں گورکی کی زندگی ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین نے ترجمہ بھی نہایت برجستہ انداز میں کیا ہے اور زبان وہ استعمال کی ہے جسے صحیح معنوں میں ہندوستانی کہنا چاہئے۔ اختر حسین رائے پوری اور گورکی دونوں شخصیتیں ایسی ہیں جن کے تعارف کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی اور یہی دونوں نام کتاب کی جاذبیت اور اچھا ہونے کی دلیل میں کافی ہیں۔

ٹراٹسکی کا بیان

مترجمہ ایم۔ ایم۔ جوہر، شائع کردہ مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی، قیمت ۱۰/

یہ مختصر سا مجموعہ ان بیانات کا ترجمہ ہے جو ٹراٹسکی نے اپنی بریت میں دئے تھے۔

حکومت نے ٹراٹسکی اور اسکے لڑکے پر چند الزامات لگائے تھے اس مقدمہ میں گولڈمین ٹراٹسکی کا وکیل تھا۔ ان بیانات میں ٹراٹسکی نے ہر چیز کو واضح طور پر بتایا ہے۔

جو الزامات ٹراٹسکی پر لگائے گئے تھے وہ مندرجہ ذیل ہیں:-

۱۔ سوویٹ یونین کے حکومتی طبقے کے سربرآوردہ لوگوں کے قتل کی سازشیں، خاص کر کرف کا قتل۔

۲۔ سوویٹ یونین میں کارخانوں، ریلوں کے تباہ کرنیکی عملی تدبیریں تاکہ اقتصادی نظام درہم برہم ہوجائے۔

۳۔ سوویٹ یونین کے نظام کو تباہ کرنے کے لئے ایک جماعت کی تنظیم جس کا مقصد یہ ہے کہ مزدوروں اور فوجیوں کو قتل کیا جائے تاکہ سوویٹ یونین کی فوجی طاقت کو صدمہ پہنچے۔

۴۔ جرمنی اور جاپان سے خفیہ سازباز۔ تاکہ یہ دونوں ملک سوویٹ یونین پر حملہ کریں اور یونین میں اندرونی بدنظمی پیدا کرنا تاکہ ٹراٹسکی خود سوویٹ یونین کا حاکم بن جائے۔

۵۔ سوویٹ یونین میں سوشلسٹ طریق پیداوار کا خاتمہ اور سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کو از سر نو زندہ کرنے کی کوشش،

ٹراٹسکی نے انہیں اعتراضات کا جواب اس کتاب میں دیا ہے۔

لینن کے بعد ٹراٹسکی اور سٹالن کے درمیان کچھ کشیدگی ہوگئی جس کی بنا پر دونوں میں ایک گہری خلیج حائل ہوگئی یہاں تک کہ اسے روس سے نکال دیا گیا اور آخر میں میکسیکو میں اسے قتل کرادیا گیا۔

سوویٹ یونین کی کارگزاریوں سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے یہ کتاب بہت کافی مفید ہے۔

کتاب کے شروع میں مترجم نے سوویٹ یونین کی کارگزاریوں کو شروع سے لیکر انہیں مختصراً بیان بھی کیا ہے جس سے ٹراٹسکی اور سٹالن کے جھگڑے اور بعد کی وجہ اور نوعیت معلوم ہوجاتی ہے

ٹراٹسکی لینن کے خاص ساتھیوں میں سے ایک ہے......
.... ہیں۔ لینن کے ساتھ ٹراٹسکی کی زندگی اور اسکی کارگزاریوں کا جاننا بھی ضروری ہے۔

شانِ خدا

مؤلفہ مولانا عبید الرحمٰن عاقل رحمانی، پبلشرس:- کتابستان، پوسٹ بکس ۲۱۶۴ بمبئی نمبر ۳ قیمت ۱۲؍

اس کتاب میں عاقل صاحب نے خدا کے وجود اور اسکی صفات کا تذکرہ کیا ہے۔

ہمارا یہ دور مادیت کا دور ہے۔ آج سے ایک عرصہ پہلے یورپ ایک نہایت ہی بُرے دور سے گزرا۔ اسکے بعد پھر وہ زمانہ شروع ہوا جسے احیاء علوم کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی زمانہ سے یونانی مفکرین کا سرمایہ منتقل ہوکر یورپ کے ممالک میں پھیلنے لگا۔ یورپ کی موجودہ ترقی اسی احیاء علوم کے بعد سے شروع ہوتی ہے۔ یہ ترقی ہر طرف دوڑنے لگی۔ یہاں تک کہ مذہب کے بارے میں بھی لوگ آزاد خیال ہونے لگے۔ جہاں تک مذہبی تشکیک اور کی بیطرفی کا سوال تھا اس میں کوئی حرج نہیں۔ ضرورت تھی کہ پورا

یورپ مارٹن لوتھر ہوجاتا۔ لیکن یہ مادیت بڑھ کر اتنی ہوگئی کہ اسکے بعد کسی مذہب کی ضرورت باقی نہ رہی یا یوں کہئے کہ مذہب بھی تجارتی اصولوں پر رائج ہوگیا۔

اس تجارتی مذہب نے ایک عرصہ بعد مغرب میں کروٹ بدلی اور لوگ پھر روحانیت پر یقین رکھنے لگے لیکن ہندوستان ایک کثیر آبادی ہے نئے اور پرانے غلاموں کی۔ یہاں جو چیز بھی یورپ سے آئی مذہب بن گئی۔ بادشاہ کی زبان تو خیر رعیت کی زبان بننے ہی لگی۔ لیکن مذہب کے سلسلے میں بھی لوگ کئی قدم آگے بڑھنے لگے اور دہریت فیشن میں داخل ہوگئی۔

لیکن ان فیشن پرست لوگوں کے علاوہ بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے دہریت کو صحیح معنی میں سمجھا اور ہندوستان کی مشکلوں کا واحد حل قرار دیا۔ دراصل وہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جسکے نیچے دنیا کا ہر طبقہ پس رہا تھا ایک ساتھ ایسا جذبہ ابھرا کہ آدمی کو ہر چیز سے بغاوت کرتے ہی بنی۔ یہ تحریک یورپ سے یورپ سے خصوصاً روس سے شروع ہوکر ہندوستان پہنچی

اس سے بحث نہیں کہ تحریک کیسی ہے — اتنا ضرور

۸۴ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ لوگوں نے اس کی ضرورت محسوس کی اور نمایاں طور پر قدیم عناصر سے اپنی بیزاری کا اعلان کردیا۔

یہ تحریک ابھی تک اسی طرح جاری ہے لیکن ہمیں صرف یہاں خدا کے وجود سے بحث ہے۔ بحث ہم یہاں خود نہیں چھیڑ رہے ہیں بلکہ اس کتاب کا موضوع یہ ہے۔

ان لوگوں کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہتے جو دہریت پر یقین رکھنے کے علاوہ اس پر مصر بھی ہیں اور اپنے پاس اس کے جواز میں دلائل بھی رکھتے ہیں اور جن کے پاس اپنی بریت میں دلائل نہیں ان کے لئے یہ کتاب یقیناً مفید ہوگی۔

عاقل صاحب نے کتاب کے کچھ حصے کئے ہیں اور حصے قائم کرکے بتدریج آگے بڑھے ہیں۔ پہلے حصہ میں خدا کے ہونے کے دلائل پیش کئے گئے ہیں اور قرآن کی آیتوں کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے مفکرین عالم کے اقوال بھی نقل کئے ہیں۔ ان اقوال کی مدد سے ثابت کیا ہے کہ مذہب ایک فطری چیز ہے۔ اور خدا کا وجود ہے۔ اس حصہ میں ان کی ان تھک کوشش بالکل صاف اور نمایاں ہے۔ اسکے علاوہ اس حصہ میں انہوں نے بڑے بڑے مفکروں کے اعتراضات نقل کرکے ان کے جوابات بھی دئیے ہیں۔

دوسرے حصہ میں انہوں نے اس کے واحد و یکتا ہونے کو ثابت کیا ہے اور یہاں بھی کلام اللہ کی آیتوں کو پیش کیا ہے

تیسرے حصہ میں صفات الٰہی کا بیان ہے۔

ان دونوں حصوں میں بھی مشہور فلسفیوں کے اقوال نقل کئے گئے ہیں۔ غرضیکہ پوری کتاب خدا کے بارے میں کچھ جاننے والے کے لئے یا خدا کے جاننے کی خواہش رکھنے والے کیلئے نہایت مفید ہے۔ کتاب کے نام سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ دوسری جماعت کے بچوں کے لئے لکھی گئی ہے لیکن ایسا نہیں۔ کتاب نہایت فلسفیانہ، عاقلانہ اور عالمانہ انداز میں پیش کی گئی ہے۔

ناتسیّت

شاہد حسین رزاقی ایم۔ اے (عثمانیہ)
شائع کردہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔ قیمت عہ

ہمارے زمانہ کی جنگ دو ہی ناموں سے تعبیر کی جارہی ہے مارکسزم اور ناتسی ازم۔ دراصل یہ جنگ ہے بھی دو ہی قوتوں کے درمیان۔ ایک مارکس قوت اور دوسری ناتسی قوت۔ اس کتاب میں مارکسی نہیں بلکہ ناتسی قوت سے بحث کی گئی ہے اور جرمنی کی ابتدائی قوت سے بحث کی گئی ہے اور جرمنی کی ابتدائی کشمکش سے شروع کرکے ہمارے موجودہ دور تک کے واقعات بیان کئے ہیں۔

دراصل ہماری وہ تمام تاریخ جب سے انسان نے موجودہ دنیا کا شعور حاصل کیا ہے آمریت اور عمومیت کے ساتھ رہی ہے جوں جوں انسان بڑھتا جارہا ہے فرد کو ترجیح دیتا جارہا ہے اور یہ فرد کی بقاء کا سوال اب اتنا اہم ہوگیا ہے کہ بڑی بڑی کتابیں اس پر لکھی جاچکی ہیں۔

فرد کے خیال کو اجاگر کرنے والا تاریخ میں سب سے پیش پیش روسو ہے اور اسکے اس خیال نے انقلاب فرانس میں بڑی مدد دی تھی۔

اسی خیال کو لیکر جرمن قوم اٹھی تھی۔ قوم نہیں، ہٹلر سے بہت پہلے ہونے والے جرمنی کے کرتا دھرتا فریڈرک اعظم اور بسمارک۔ آج کی تمام ذہنیت وہی ہے جو بسمارک کے تخیل سے نکل کر تھوڑی بہت نمایاں ہوئی تھی۔ جرمنی کو ایک متحدہ قوت بنانے کا خیال ایک عرصہ پہلے لوگوں کے ذہن میں جگہ پاچکا تھا۔ آج ہر

ہر ملک یہی کوشش کر رہا ہے کہ اسکے علاوہ تمام دُنیا چاہے ختم ہو جائے لیکن اسے زندہ رہنے کا حق مل جائے۔ یہ خوفناک جنگ اسی کا مظاہرہ ہے۔

اس کتاب میں شاہد صاحب نے جرمن قوم کے رجحانات' اس کا فلسفہ' اس میں کام کرنے والے اجزاو کا بالتفصیل تذکرہ کیا ہے۔

جرمن قوم کے رجحانات کے علاوہ ناتسی ازم کا مفہوم۔ اس کی وجہ تسمیہ اور اس کے آغاز کو اچھی طرح واضح کر دیا ہے ہٹلر کس طرح اس حلقہ میں آیا۔ ناتسی پارٹی کا آغاز کیونکر ہوا اور کس طرح ہٹلر کو اقتدار حاصل ہوا۔

اس میں شک نہیں جرمن قوم کا موجودہ رویّہ ایک زبردست دباؤ کے نیچے دبے رہنے کی بنا پر اس قسم کا ہو گیا ہے کہ وہ آج ساری دُنیا کو اپنے زیرنگیں اور اپنی نوآبادیات کی شکل میں دیکھنا چاہتی ہے لیکن یہ تمام خواہش خود غرضی کی بدترین مثال ہے۔ دورِ جدید کی تمام قومیں اس کشمکش میں مبتلا ہیں لیکن انفرادی آزار کا خیال رکھتے ہوئے کسی کو بھی دوسرے پر غلبہ پانے کا حق نہیں۔

ہٹلر کی شخصیت اور اسکے ساتھ ہی اس کی ذہنیت کو بنانے والی قوتوں کا تذکرہ اس کتاب میں نہایت عمدہ طریقہ سے کیا گیا ہے۔ قومی اشتراکی جماعت کا نصب العین جو بعد میں صرف ناتسی جماعت کہلائی ابتدا میں کیا تھا۔ اس نے خود جرمنی میں اقتدار حاصل کرنے کے لئے کس طرح جد و جہد کی' اسے کیسی کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا' کس کس قسم کی چالاکیاں اور عیاریاں عمل میں لائی گئیں۔ کس طرح اس پارٹی نے لوگوں کو اپنا ہم نوا بنایا اور کیونکر پورے ملک کی فضا کو بدل دیا۔ یہودیوں کے طرزِ عمل نے جرمنوں پر کیا اثر کیا۔

آخر میں شاہد صاحب نے فرد اور ــــ 'عمومیت' قیادت' آمریت اور اہلیت اور مرکزیت پر اپنی رائے دی ہے اور اسکے ساتھ ہی پورے ماحول کی معاشرتی' معاشی اور اخلاقی حالت پر تبصرہ کیا ہے غرضیکہ پوری کتاب جرمنی' اس کی موجودہ زندگی' اُسکے آغاز اور کوششوں سے پُر ہے۔

ہندوستانی کھیل

مصنفہ خواجہ الطاف علی' شائع کردہ مکتبۂ جامعہ دہلی۔ قیمت ۸ر

اس قسم کی کتابیں جب ہم دیکھتے ہیں تو فوراً محسوس کر لیتے ہیں کہ اب ہم ذہنی طور پر کس طرف جا رہے ہیں۔ زمانہ کی ضروریات کیا ہیں اور اب ہمیں کون کون سے طریقے اپنے بچاؤ اور ترقی کے لئے اختیار کرنے چاہئیں۔

اُردو زبان میں بہت کم کتابیں ایسی ہیں جنہیں مفید کہا جا سکے خصوصاً بچوں کے لئے۔ دراصل تربیت اطفال ہی وہ چیز ہے جو کسی قوم کی زندگی پر صحیح معنی میں اثر انداز ہوتی ہے یہ چیز دوسرے ملکوں میں بہت نمایاں اور صاف ہے کہ وہاں بچوں کی تربیت' صحت اور تعلیم کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے بچے تندرست اور تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ اس تندرستی کا اثر آئندہ آنے والی نسل پر براہِ راست پڑتا ہے مگر ہمارے ملک میں ابھی تک بچوں کی تربیت کا کوئی خاص خیال نہیں کیا جاتا۔

کھیل ایک ایسی چیز ہے جس کا اثر بچے کی تندرستی اور صحت پر بہت زیادہ پڑتا ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ وہ بچے جو تندرست اور صحت مند ہوتے ہیں اکثر ذہین ہوتے ہیں اور یہی تندرست بچے آئندہ نسل کی صحت و قوت کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ چنانچہ کھیل بچہ کے لئے نہایت ضروری شے ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ محض کھیل کے ذریعہ بچہ اپنی ذہنیت کا اظہار کرنے لگتا ہے اور بعض عقلمند والدین محض اُسے بھٹکتا ہوا دیکھ کر اندازہ لگا لیتے ہیں کہ اس کا رجحان کس طرف ہے اور پھر اسی رجحان کے پیش نظر پوری کوشش کرتے ہیں کہ اس کی تربیت اور تعلیم کن بنیادوں پر ہونی چاہئے۔

مگر کچھ والدین ایسے بھی ہیں جو ابھی تک بچوں کے کھیل کود کو لہو و لعب کی ابتدا قرار دیتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کے لئے ہماری بدلتی ہوئی دُنیا میں کوئی گنجائش نہیں۔ اسی قسم کے لوگوں کی اولاد سوکھی ہوئی چڑچڑی۔ ڈرپوک اور بدہیئت ہو کر گھروں سے نکلتی ہے۔

خواجہ الطاف نے ہندوستانی کھیلوں پر کتاب لکھ کر بڑی قومی خدمت کی ہے۔ مانا کہ ادبی اور تاریخی طور پر اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ لیکن یہ کتاب جس کی بچوں کی دُنیا میں بڑی اہمیت ہے ان تمام چیزوں کے لئے ایک رہنما کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس کتاب میں خواجہ صاحب نے ہندوستان میں کھیلے

جانے والے مختلف کھیلوں کا ذکر کیا ہے اور اسکے ساتھ اُن کے کھیلنے کا طریقہ بھی بیان کیا ہے۔

لیکن کتاب کے آغاز میں "بچہ اور اسکی ترکیب جسمانی" پر ایک اچھا طویل مضمون بھی درج ہے جسے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کس حاجت غرض و غایت کے ماتحت لکھی گئی ہے اور اس سے کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

آخر میں کتاب کے اندر چارٹ اور ہدایات درج ہیں تاکہ کھیلوں کے بعد بچوں کی صحت کا اندازہ کیا جا سکے اور دیکھا جا سکے اس کا بچوں پر کیا اثر پڑا۔

کتاب جتنی بچوں کے لئے مفید ہے اس سے زیادہ ورزش کرانے والے اساتذہ کیلئے مفید ہے۔ جتنی انگریزی کی اصطلاحیں کھیلوں میں استعمال کی جاتی ہیں آخر میں ان سب کا اُردو ترجمہ بھی دیدیا گیا ہے۔ کتاب بڑی مفید ہے اس سے زیادہ ورزش کرانے والے اساتذہ اور بچوں کے لئے اسکا پاس رکھنا ایک رہنمائے تربیت کو ساتھ رکھنے کے مترادف ہے۔

(ادارہ)

یو۔ پی میں خوب صورت، باشوکت، صحیح اور بہترین طباعت کا واحد مرکز

ساغر پریس میرٹھ

شعبۂ طباعت ادبی مرکز میرٹھ

معیاری طباعت کو پسند کرنے والے اصحاب کو نوید

ساغر نظامی کے زیر انتظام و نگرانی میرٹھ میں ساغر پریس نے جو کارہائے نمایاں کئے اُن کا بہترین نمونہ **بادۂ مشرق** ہے جس کی طباعت کے متعلق متفقہ طور پر ہندوستان کی یہ رائے ہے کہ اُردو تو کجا انگریزی زبان میں بھی اس شان کی کتاب نہیں دیکھی گئی۔ اگر آپ اپنی تصنیف یا کوئی بغیر کسی دقت و پریشانی کے اپنے مرکز پر مقیم رہ کر چھپوانا چاہتے ہیں تو منیجر ساغر پریس کو مطلع فرمائیے۔ حسب وعدہ و دلخواہ باصحت تیار کرکے پہنچا دیا جائے گا۔ نہ آپ کو کاپیاں دیکھنے کی ضرورت ہوگی نہ پروف ملاحظہ کرنے کی۔ خود ساغر نظامی کی نگرانی میں ہر کام پایۂ تکمیل کو پہنچایا جائے گا۔

پتہ

احمد یار خاں منیجر ساغر پریس۔ سی پٹ بازار۔ میرٹھ

۱۹۳۵ء میں جاری ہوا

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی ماہنامہ

ایشیا

منظور شدہ

محکمۂ تعلیمات حکومت صوبۂ متحدہ حکومت بہار

حکومت سی پی اور حکومت صوبۂ پنجاب

ناشر

مکتبہ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

(جملہ حقوق محفوظ) (نمونہ مفت نہیں بھیجا جاتا)

قیمت سالانہ پانچ روپیہ (ہندوستان سے)
قیمت فی نمبر ۸ ر

قیمت سالانہ آٹھ روپیہ (دوسرے ممالک سے)
ایجنسیوں کو ۲۵ فی صدی کمیشن

فہرست

ماہنامہ ایشیا

ناظم :- اسد یار خان اعظم

ادبی مرکز میرٹھ

ستمبر و اکتوبر سنہ ۱۹۴۲ء

شمارہ	مضمون	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۱	تاثرات (حیدرآباد کی علمی دنیا)	ساغر	
	نئی صبح		
	ادبیات و سیاسیات		
۲	آنے والی دنیا کی جھلک	مرزا ارشاد بیگ	۱۱
۳	یورپ میں ایک ہندوستانی ادیب	ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری	۱۶
۴	ابتدائی مسیحی کلیسا کے سیاسی افکار	اکرام قمر ایم اے	۱۹
۵	چین جمہوریت کی تیاریوں میں (ترجمہ)	عزت صدیقی و جواہر لعل نہرو	۲۴
۶	ادب و ماحول	اختر الایمان	۲۷
	نیا راگ		
	(نظم و غزل)		
۷	حسرت آخر کا ایک ورق	جوش ملیح آبادی	۳۵
۸	ابھی نہیں	جان نثار اختر	۳۸
۹	تعمیرِ نو	آدا بدایونی	۳۹
۱۰	مرے لئے	صفیہ شمیم ملیح آبادی	۴۰
۱۱	نیا جہان	سروش عسکری طباطبائی	۴۱

شمارہ	مضمون	مضمون نگار	نمبر شمار
۱۲	سمندر کی ریتی پہ اک روز ہیں نے!	راحت سعید	۴۲
۱۳	یاد	مسلم ضیائی ایم۔ اے	۴۵
۱۴	تنہائی	اختر الایمان	۴۳
۱۵	عید	ساغر نظامی	۴۶
	نئی کہانی		
	افسانے و ڈرامے		
۱۶	ایک عاشق کے نفسیات	ل۔ احمد اکبرآبادی	۵۱
۱۷	کوڑھی کی موت	رام پرتاب بہادر ایم اے	۵۷
۱۸	جانم	اختر الایمان	۶۲
۱۹	ماؤں کو آخری سلام	ساغر نظامی	۷۰
	کسوٹی		
	تنقید و تبصرہ		
	نئے ادبی رجحانات	ادارہ	۷۴
	جمالِ کشمیر	"	۷۸
	قومیت اور بین الاقوامیت	"	۰
	افادی ادب	"	۷۹
	مولانا محمد علی کے یورپ کے سفر	"	۸۰

نئی صبح

اشارات

اگست کا ایشیا شائع ہونے کے بعد ادبی مرکز کی زندگی میں نئی تبدیلی کے امکانات پیدا ہوئے، ان امکانات کے حاصل کرنے میں یہ تو ہوتا کہ میری زندگی اور بھی مصروف ہو جاتی لیکن ادب کی نئی تشکیل کا جو فریضہ ہم سب کام کرنے والوں کے پیش نظر ہے اسکی ادائگی میں کچھ آسانیاں ضرور پیدا ہو جاتیں۔

میرٹھ سے منتقل ہونے کے کل سامان ہو گئے، نئی دنیا کی نیو ہی نہیں رکھ دی گئی کچھ دیواریں بھی چن دی گئیں، نئی بستی کا تخیل پرانی آبادی کی ابتری کا سبب ہوتا ہی ہے اس لئے میرٹھ میں جو استحکامات تھے، ان سے دل بھی اچاٹ ہوا، اور ان میں کچھ توڑ پھوڑ بھی ہوئی، کیونکہ اب کھیل کا ڈراپ سین ہو چکا ہے اس لئے مناظر کی تفصیل لاحاصل ہے، پھر آپ کی ذات سے ہٹی ہوئی چیزوں کا کیا تعلق! ؟ بہر حال ایک موڑ ایسا آیا جس سے آگے تخیل اور عمل کی گاڑی نہ سرک سکی۔

ان واقعات کا نفسیاتی ردِ عمل کامل انہدام کی صورت میں رونما ہونا ہی چاہتا تھا کہ ٹوٹے ہوئے جوڑ جوڑ میں زندگی پھر کسمسائی، دل نے پھر کچھ اور میں نے اپنی زندگی و مقصد کو بحالہ جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

ادھر یہ سب کچھ ہو رہا تھا ادھر کاغذ کے متعلق جب معلوم کیا گیا یہی جواب ملا، کراچی سے ابھی ویگن نہیں آئی ہیں۔ بازار سے سفید کاغذ خریدنے کی جرأت کی، تو وہ نرخ سُننے کہ جرأت بھی اپنا سا مُنہ لیکر واپس آئی، کاغذ سونے چاندی کے بھاؤ بھی بڑے ایچ پیچ سے ملتا ہے۔ کاغذ کے اسٹاک کرنے کے
10 جو انتظامات کئے تھے وہ ابھی چند ماہ اور لینگے۔ بہر حال پورے ستمبر اور اکتوبر کے اوائل تک ایشیا کے شائع نہ ہونے کا اصلی سبب کاغذ کا نہ ملنا ہی تھا جسے دوسری باتوں نے کچھ اور مضبوط کیا۔

آپ جانتے ہیں جو ادارے، آزاد خیالی یا ادب کے نئے آئیڈل کو سامنے رکھ کر کام کر رہے ہیں، ان کیلئے دقتیں ہی دقتیں ہیں۔ "مست قلندر" اور "بیسویں صدی" کی سی آسانیاں ان غریبوں کو کہاں نصیب! ؟ مطلب یہ ہے کہ آپ ہماری حقیقی مصیبتوں کو محسوس کریں، اور ایشیا کی دیر سے حاضری کو معاف کر دیں۔ ہمارا دور ایک شدید عبوری و بحرانی دور ہے اسکی فرو گزاشتوں کو نظر انداز کرنا ہی پڑیگا۔ شاید سب سے بڑا معجزہ اس عہد میں کسی شے کا قائم رہ جانا ہے۔

کبھی کبھی تو میں ایشیا کے جاری رہنے کو اپنی "حماقت" اور ذہانت دونوں کا کارنامہ یقین کرنے پر غور کیا کرتا ہوں!

جنوری ۱۹۴۳ء سے ایشیا میں بعض اجزا کی کمی اور بعض عناصر کا اضافہ پیش نظر ہے، ادب بحرانی اور عبوری دور سے گزر رہا ہے، ملک میں مختلف جماعتیں اور افراد کام کر رہے ہیں، ان میں ذمہ دار جماعتیں بھی ہیں، غیر ذمہ دار افراد بھی۔ کچھ پارٹیاں ایسی بھی ہیں جو بیسویں صدی کے جمہوری تصور کے خلاف ابھی تک "درباری ایچ پیچ" پر یقین رکھتی ہیں، ان پارٹیوں کے پڑھے لکھے افراد نے اپنا پیشہ بنا لیا ہے کہ تنقید کو مدح خوانی بنا دیں، اور اس مدح خوانی کو اپنے "گینگ" تک محدود رکھیں، یعنی تنقیدی فرض کا الگ گلا گھونٹیں اور دوسروں کا حق بھی غصب کریں۔ اس طرح وہ تاریخ ادب میں غلط یاد داشتیں محفوظ کر رہے ہیں۔ ایشیا نے فیصلہ کیا ہے کہ ایسی کسی جھوٹی تشہیری یاد داشت کو تاریخ ادب میں فائل نہ ہونے دیا جائے، اور اگر ہونے دیا جائے تو اک اضافی نوٹ کے ساتھ

یہ ارادہ مصروفیتوں کو بڑھا ضرور دیگا۔ لیکن بہر حال ضروری فرض ہے، اسے تو ادا ہونا ہی چاہئے، اسکے علاوہ شعر و ادب میں نئے فارم اور نئے اسالیب کے ماتحت جو سامان پیدا ہو رہا ہے اس کی چھان بین کرنا بھی ادبی اداروں کا اوّلین فرض ہے۔ کھلے دل سے اچھائیوں کو سراہنا اور کمیوں کی طرف اشارہ کرنا چاہئے۔ کسی عہد کے رسائل اس عہد کی نظم و نثر اور جملہ ادبی جد و جہد کی تاریخ ہوتے ہیں۔

ساغر

ارشاد بیگ

تیسرا مقالہ

آنے والی دُنیا کی جھلک

شعوری ارتقاء اور اس کے نتائج

حیاتیات کی نئی سائنس کیا ہے؟ طبیعات و کیمسٹری کی طرح اس کے بھی کئی گوشے ہیں جن پر سے ابھی تک پردے نہیں اُٹھے تھے تفصیل سے یہ سب پھر آئندہ مقالہ میں بتایا جائے گا۔ لیکن یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ جس طرح طبیعات اور علم کیمیا نے ہمارے بیرونی ماحول کو بدل کر رکھ دیا۔ اسی طرح حیاتیات کے انکشافات اور اصول ہماری احساساتی اور شعوری کیفیات اور عوامل کو بالکل بدل کر رکھ دیں گے۔ اور سائنس کی خارجی قوتوں پر قابو عطا کر کے ہمیں ایک عظیم ترین دُنیا میں داخل کر دیں گے۔ حیاتیاتی سائنس کی کنجی جس کے ہاتھ میں ہوگی آنے والی دُنیا پر وہی حکومت کرے گا۔ اور وہی ایک نئے دور کا نقیب ہوگا۔ حیاتیات کا تعلق ہمارے تحت الشعور، ہمارے نفسی قواعد و ضوابط اور ہمارے ذہن اور ذات کی قوتوں سے ہے۔

فرد اور جدید حیاتیات

حیاتیاتی ارتقاء ہماری ذہنی صلاحیتوں، ہمارے زاویہ ہائے نگاہ اور اعضائے جسمانی میں ایک غیر شعوری عمل کے ذریعے ایک خاص تغیر پیدا کر رہا ہے۔ ہمارا رجحان اور خلقی میلان اور ہماری تمام تر قوتیں ایک ایسے مرکز کی طرف رجوع ہو رہی ہیں۔ جہاں وہ اپنا بہترین اطمینان اور راہ عمل پائیں گی۔ فرد ایک بلند ترین اور اعلیٰ سطح ارتقاء سے منسلک کیا جا رہا ہے تا حال فرد ایک غافل اور حیوانی رَو میں بہتا رہا ہے۔ فرد کے ذہن میں اَب تک ایک ایسی کشاکش اور کشمکش طوفان اٹھاتی رہی۔ جس نے زندگی کو ایک بے بسی۔ خوف۔ قربانی اور جبر میں قید رکھا ہے۔ فرد اور اجتماعی تعلقات کے تصادم نے زندگی پر ہمیشہ ظلم کیا۔ اور انسان کے سامنے صداقت یا تو اس کی ترقی یا برتری کے لئے بہترین نظام کے نام سے قبل از وقت اور تخلیلی عناصر سے پُر نظام پیش کئے جاتے رہے ہیں۔ ارتقائی عمل غیر شعوری طور پر ہمیں ایک شعوری مکمل نظام کے لئے آگے بڑھاتا رہا ہے

غلط نظام میں پہلی بے چینی یہ ہوتی ہے کہ فرد کی ارتقائی صلاحیتیں نہ تو اُس سے مطمئن ہوتی ہیں اور نہ اُس میں اپنے لئے جگہ پاتی ہیں۔ اس لئے فرد میں اور زندگی میں ایک اجنبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ فرد کا فطری ذہن خود کو روایاتی یا نامکمل تصوّرات کا ہمنوا نہیں پاتا۔ نتیجہ کے طور پر ذہن میں دو عملی پیدا ہو جاتی ہے۔ زندگی میں "بے بسی" شعور کی ہار کا نام ہے۔ اور غلط شعور ہمیشہ ہارتا ہے۔ صحیح شعور ارتقائی قوتوں کا نمائندہ ہوتا ہے۔ زندگی میں "خوف" شعور کے عدم تکمیل کا نتیجہ ہے۔ اور مجبوری اپنی قوتِ محرکہ کا صحیح ادراک حاصل نہ کر سکنے کو کہتے ہیں۔ قربانی کا جذبہ ارتقائی قوتوں کی عدم تنظیم اور عدم شناخت سے پیدا ہوتا ہے۔ انسان نے اپنی ذات کو سمجھنے کی بجائے اپنی ذات گھڑنے کی زیادہ کوشش کی ہے۔ ارتقائی قوتوں سے گریز بے بسی پیدا کرتی ہے زندگی قوت سے محروم ہو جاتی ہے۔ جب فرد کی ذات شعوری ارتقاء کے درجے سے منسلک ہو جائے گی۔ بے بسی۔ قربانی۔ خوف اور مجبوری زندگی سے خارج ہو جائے گی۔ کیونکہ جب فرد زندگی کی قوتِ محرکہ کے شعوری ارتقاء سے ہم آہنگ ہوگا تو خوف کیا معنی؟ خوف غلط شعوری تصوّرات اور خفیقی قوتوں کے تصادم سے پیدا ہوتا ہے۔ آنے والی زندگی آزاد مکمل اور مطمئن ہوگی۔ فرد کی قوتیں صحیح رُخ پر کام کریں گی۔ فرد کی قوتیں نقص یا عدم تکمیل کے باعث پہلے کی طرح حیوانی کیفیات میں نہیں رہیں گی۔ بلکہ ایک صحیح رشتہ سے وابستہ رہ کر کام کریں گی۔

سیاسی خاکہ

حیاتی قوتیں ہمیں سائنس کی موجودہ قوتوں سے آگے بڑھا دیں گی اس لئے آنے والا نظام سائنس کی طاقتوں پر قابو پا سکے گا۔ زمانہ کی غیر شعوری قوتیں موجودہ تحریکوں اور حکومتوں کے قابو سے اب تک باہر تھیں۔ اب یہ ایک ایسا طریقہ معلوم کرنے کی سعی کی گئی ہے جس کے مکمل ہونے پر حملہ آور کی قوتِ ادراک کو بیکار کر دیا جائے۔ اس لئے

آنے والی دُنیا میں مستقل امن قائم ہوگا۔ یہ ایک بے شک حیرت انگیز بات ہے۔ جس کا جواب طبیعیات اور کیمسٹری کے پاس نہیں ہے۔ نہ مشرقی تام نہاد روحانیت کے پاس ہے۔ آنے والے نظام میں ریاست کو قوتِ محرکہ اور شعور پر کامل کنٹرول حاصل ہو گا۔

دُنیا ایک حکومت کے ماتحت کام کرے گی۔ اور بلند ترین شعور (خود شعوری ہیئت ذہنی کا حامل) آنے والی دُنیا کا صدر ہوگا۔ ملکی حدود اور سلطنتیں ختم کر دی جائیں گی۔ وزارت اور جانداد کا تصفیہ مٹ جائے گا۔ حاکم محض ایک چاکر حیثیت میں نئے ماحول میں اپنا کام کریگا۔ حکومت کسی کا ورثہ نہیں ہو گی۔ تمام دُنیا کی ایک شرح تبادلہ ہو گی اور کار فرما حکومتیں اندرونی معاملات میں آزاد ہوں گی۔ ایک ہی ارتقائی طرز تمدن اور ایک ہی ارتقائی زبان جاری ہوگی۔ سسٹم کا طریقہ منسوخ کر دیا جائے گا۔

خیالی فردوس حیاتیات کی روشنی میں

اگر زندگی ایک شعوری ہیئت حاصل کرے۔ اور ہمارا نظام زندگی ایک ناقص نظام کے بجائے صحیح اور مکمل قوتوں کا نمائندہ ہو جس میں ہماری خواہشات احساسات اور ادراک کی لطیف ترین کیفیتیں صحیح میدان پانی چلی جائیں تو اس سے زیادہ مکمل خیالی فردوس کا مرئی نمونہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

ہر شخص کو اگر برابر پھلنے پھولنے کا موقع ملے۔ اور ہر شخص اپنی صلاحیتوں کے مطابق ترقی کرتا چلا جائے تو زندگی میں پھر لوٹ کھسوٹ کا سلسلہ ختم ہو سکتا ہے۔ سوشلزم کا اولین مقصد انسانی لوٹ کھسوٹ ہی کو ختم کرنا ہے لیکن اس کو ختم کرنے کا طریقہ سائنس جس کی تعلیم مارکس نے دی ہے وہ تاریخ کا خام طریقہ ہے۔ جب نظام عالم ارتقائی عمل کے ذریعہ ایک نشاۃ ثانیہ حاصل کرے گا۔ اس وقت صنعتی پیداوار کے طریقوں پر حیاتیاتی قوتوں کے ارتقا سے تشکیل یافتہ نظام میں خود بخود قابو ہو جائیگا۔ اور وہ طریقے زندگی کے لئے بجائے ایک جلب منفعت ثابت ہونے کے برکت ثابت ہوں گے۔ سرمایہ داری دوسرے لفظوں میں حیاتیاتی ارتقار کا عبوری دور ہے۔ اس لئے سوشلزم کے مقابلہ میں حیاتیات کے پاس زیادہ صحیح طریقۂ علاج ہے۔ موجودہ سوشلزم حقائق سے اتنا ہی دور ہے جس قدر دوسرے مکتب خیال۔ کیونکہ سوشلزم تاریخ کے "حیاتیاتی تصور" سے ناواقف ہے۔ تاریخ کا ارتقا حیاتیاتی ارتقار ہے۔ اور تاریخ کا عمل حیاتیاتی عمل ہے۔

جمہوریت کا صحیح مفہوم

اس حیاتیاتی ارتقار کی رو سے جمہوریت کا صحیح مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب فرد کی صحیح ارتقائی قوتوں اور خواہشات کا لحاظ رکھا جائے۔ اس لئے اصطلاحاً صحیح جمہوریت وہی ہے جس جمہوریت میں ہماری ارتقائی ذات کی صحیح نمائندگی ہوتی ہو۔ عوام پر ہمیشہ نامکمل اور روایاتی یا سکونیاتی یا یک طرفہ شعور چھایا رہتا ہے۔ عوام کو زندگی کا سرچشمہ بنانا زندگی کے ارتقار کو روکنے اور ترقی و خوشحالی سے دور رکھنے کے مترادف ہے۔ نئے ارتقار سے ہم آہنگ نظام عوام کے جذبات کی صحیح نمائندگی کرے گا بہ نسبت اس کے کہ عوام کا شعور کوئی نظام بنائے۔ اور موجودہ جمہوریت کے معنی سوائے اس کے کچھ نہیں ہیں کہ عوام کا شعور زندگی کی باگ تھامے۔ یعنی اس کے معنی یہ ہیں کہ سکونیاتی یا غیر ارتقائی شعور زندگی پر چھا جائے۔

آزادی کا پس منظر

موجودہ تحریکات قوموں کو بلند کرنے کا دعویٰ کرتی ہیں۔ اور انہیں آزاد کرنے کی علمبردار ہیں۔ لیکن وہ انسانی تمدن کے ارتقائی تغیر کا جائزہ نہیں لیتیں۔ تاریخ ایک نئے دروازہ پر کھڑی ہے۔ نوع انسان کو ایک نئے اور بلند ترین ارتقائی طرز زندگی اور نئے طریق کی ضرورت ہے۔ اس لئے آزادی کا پس منظر ایک بلند ترین ارتقائی تمدن اور ماحول کو بنانا چاہئے موجودہ حالت میں بغیر ارتقائی قوتوں کو کام میں لئے اور کسی نئے ماحول کی تعمیر بغیر آزادی کا علمبردار بننا تاریخ کے حقائق سے چشم پوشی کرنا ہے۔

ویلز کہتا ہے کہ دُنیا کو اس لئے تباہی سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل تھا کہ دُنیا یہ نہیں جانتی تھی کہ اسے کس چیز سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے۔ نئی حیاتیات اس کا جواب دیتی ہے کہ ہمیں ایک غیر شعوری ہیئت سے زندگی کی ایک شعوری ہیئت میں داخل ہونا ہے۔ اور مسئلہ سیاسی یا مادی یا مذہبی نہیں۔ بلکہ حیاتیاتی ارتقار کا ہے۔ زندگی میں اب تک غیر شعوری ارتقا ہوتا رہا اب شعوری ارتقار کا آغاز ہونے والا ہے اور ہمیں اس سے منسلک ہونا ہے۔

جنگ کے معنی

حیاتیات کے نزدیک جنگ ارتقائی قوتوں اور سکونیاتی تصورات

کا تصادم ہے۔ ایک جماعت دوسری جماعت سے اس لئے لڑتی ہے کہ وہ ارتقائی قوتوں کو قبول کرنا نہیں چاہتی۔ کیونکہ اسکے نزدیک اسکے اپنے تصورات ہی زیادہ قیمت اور ترقی کا ذریعہ ہیں چونکہ تاریخ کا ارتقا غیر شعوری ارتقاء ہے اس لئے یہ فیصلہ مشکل ہوجاتا ہے کہ کونسا حق پر ہے جنگ ناگزیر ہوجاتی ہے اور جیت ارتقائی قوتوں ہی کی ہوتی ہے تاحال انسان کی تاریخ میں نہ تو ایک شعوری ہیئت حاصل ہوسکی تھی نہ قوتِ ارادی اور تصور کو کنٹرول کیا جاسکا تھا۔ شعوری ہیئت کی عدم موجودگی کی وجہ سے ارتقائی قوتوں کے بڑھنے کا نتیجہ کسی خاص طبقہ یا جماعت کی برتری کی صورت میں نکلتا تھا۔ نظامِ عالم کے سب پہلو ایک ضابطہ کے تحت میں نہیں آتے تھے اس لئے جنگ میں فتح کے بعد کوئی حقیقی غیر جانبدار نظام قائم نہیں ہوسکتا تھا۔ لیکن آج انسان ایک شعوری نظم سے منسلک ہونے والا ہے اس لئے اب ارتقا کی سمت اور راہ آشکارا ہوجائے گی۔ اور غیر شعوری ارتقا کے خاتمہ کے ساتھ جنگ کا خاتمہ بھی ہوجائے گا۔

غلامی

غلامی کو ابتک لعنت سمجھا جاتا رہا ہے اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن حیاتیاتی عمل کے لئے غلامی غیر شعوری ارتقا پر مبنی زندگی کے لئے ناگزیر تھی کیونکہ غلام رہنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ قوم ارتقائی قوتوں اور صلاحیتوں سے محروم ہے۔ اگر ارتقائی قوتوں سے محروم قوم کو آزاد کردیا جائے تو زندگی کی خوشحالی۔ ارتقا اور ترقی میں رکاوٹ ثابت ہوگی۔ اگرچہ بظاہر اور وقتی طور پر غلامی لعنت ہے لیکن غلامی کی عدم موجودگی زندگی کے ارتقائی عمل کے لئے مہلک ضرب ثابت ہوتی۔ اگر آزادی کے معنی سکوتیہائی تصورات کے ذریعہ ارتقائی قوتوں کا روک دینا ہوتا۔ ہمارے ملک کی کوششیں ایسی ہی ہیں

آزادی حاصل کرنے کے لئے زمانہ کی نئی ارتقائی قوتوں سے ہم آہنگ ہونا چاہئے اور زمانہ کی نئی ارتقائی قوتیں شعوری ارتقا کے نظام کو حاصل کرنے میں مضمر ہیں یعنی سائنس سے پیدا شدہ ماحول پر قابو جنگ کا اختتام زندگی کا صحیح نشو دنما۔ حیاتیات میں قوت کے معنی جسمانی قوت۔ موٹاپا یا درندگی کے نہیں ہیں۔ نہ حیاتیات میں قوت کثرتِ تعداد کو کہتے ہیں۔ حیاتیات میں قوت زندگی کی لطیف ترین ذہنی ترقی کا نام ہے جو اپنے پس پشت تموّج اور ہیجان رکھتی ہو۔ یہی ذہنی قوت ہمیں نئے طریقے۔ نئے انکشافات اور نئی قوتوں کی ضرورت ہے جو تاریخ میں آج سے قبل ظہور پذیر نہیں ہوئی ہیں۔

جس طرح مغرب نے اپنی ایجادوں کے ذریعے مشرق کی جسمانی قوت کو بیکار کردیا۔ اسی طرح یہ حیاتیاتی قوتیں مغرب کے میکانی طریقوں کو بیکار کردینگی۔ وہ حیاتاتی قوتیں ایک ایسے شعور کے حصول سے منسلک ہیں۔ جہاں دماغ پر ہیجانی اور تموجاتی کیفیتیں مکمل طور پر منکشف ہو جائیں گی۔

نیا نظام غلامی کا ذریعہ یا آلہ ثابت نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ نظام ہماری ذات کے محض ہیجانات اور قوتوں کو ادراک کے ذریعے ایک صحیح تشکیل میں پیش کردے گا۔ غلامی کے معنی ایک مکمل نظام کی عدم موجودگی کے ہیں۔ لیکن موجودہ جنگ کا اختتام ہمیں ایسے نظام سے ہمکنار کردیگا۔ جہاں ہم اپنے ذہن کے نیچے چھپی ہوئی قوتوں کا شعوری طور پر جائزہ لے سکیں گے۔ اور اس طرح زندگی صحت۔ مسرت اور ترقی کا مخزن بن جائے گی۔

آئندہ زمانہ میں آزادی کا مفہوم

آزادی کے معنی کسی غیر قوم سے نجات حاصل کرنیکے ہی نہیں ہیں، بلکہ ارتقائی قوتوں کو حاصل کرنے کے ہیں۔ یعنی قوت کا حصول آزادی کا ذریعہ ہے۔ اس لئے ہمارے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہم نئے حقائق کا جائزہ لیں اور نئی قوتوں کا علم حاصل کریں۔

یورپ اور نوآبادیاں

یورپ کے سامنے نوآبادیات کا غلط تصور اس قدر مہلک ہے جو صحیح حالات کو سمجھنے میں رکاوٹ ثابت ہورہا ہے۔ ترقی اور خوشحالی کا مفہوم نوآبادیات میں ہی مضمر سمجھا گیا ہے لیکن حال یہ ہے کہ نوآبادیات پر قابو رکھنے اور زمانہ کی رفتار کو روکنے کی قوت ارتقائی عمل نے زائل کردی ہے۔ نوآبادیات پر قبضہ ایک حیاتاتی دقعہ تھا جو گزر چکا۔ اب زندگی نئے ماحول اور حقائق اور تصورات میں پہلے سے زیادہ خوشحال ہوگی۔

زمانہ کی دو غلطیاں

اہم ترین غلطی آج کل یہ کی جاتی ہے کہ حالات کا جائزہ موجودہ طریقوں کی روشنی میں لیا جاتا ہے حالانکہ زندگی کے طریقوں میں ارتقا ہوتا رہتا ہے۔ مگر ہمیں آنے والے امکانات کو کبھی نظرانداز نہیں کرنا چاہئے دوسرے یہ کہ مسئلہ ایک عالمگیر مسئلہ ہے۔ حیاتیاتی تحقیقات کی روشنی میں

"حقیقت انسان" ایک ہی ہے یعنی نفسی قوتیں۔ قوتِ حیات نفسی قواعد و ضوابط غرض زندگی کی ایک ہی حرکت اور ماہیت ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ مسئلہ کسی ایک ملک سے وابستہ نہیں ہے۔ بلکہ زندگی کا پس منظر عالمگیر ہے۔ اس لئے کوئی ایک ملک یا دو ملک آپس میں اس مسئلہ کو نہیں سُلجھا سکتے۔ جب تک کہ عالمگیر تخلیقی نظام نہ پیدا ہو باقی تمام کوششیں عبوری ہیں۔

سماجی نظام کا خاکہ

آنے والے نظام میں مخلوط ازدواج کا رواج ہوگا۔ قوم نسل مذہب۔ سب ختم ہو جائیں گے۔ سب کا ایک ارتقائی تمدّن ہوگا۔ مخلوط ازدواج سے دُنیا میں اولاد خوبصورت ہوگی۔ اور نسل آدم میں حُسنِ صحت کا اضافہ ہو جائے گا۔ دُنیا کو خدا کی تمیز ہوگی تصوّری خدا کے تخیّل میں دُنیا اسیر نہیں رہے گی۔ بلکہ ہماری زندگی کی رہنمائی کرنے والی لطیف ترین قوت ہی خدا کی نمائندہ ہوگی۔ اور خدا ایک زندہ قوّت اور حقیقت ہوگا۔ عبادتوں میں وقت ضائع نہیں ہوگا بلکہ زندگی کی حقیقی موج اور روحانی لطیف ترین تڑپ انسان میں

14 بیش بیش ہوگی۔ بیکار رسموں۔ تہواروں۔ عرسوں میں قیمتی لمحات ضائع نہیں کئے جائیں گے۔

نوج بالکل باقی نہیں رہے گی۔ کیونکہ حیاتیاتی قوّت کی رُو سے ریاست کو تمام افراد کی قوّتِ ارادی پر قابو ہوگا۔ دُنیا ایک کثیر نقصان سے بچ جائیگی اور جیل خانے توڑ دئے جائیں گے۔ موجودہ طریقۂ تعلیم باقی نہیں رہے گا۔ اور انسان عملی زندگی سے زیادہ قریب ہو جائیگا تقدیر اور تدبیر کا تصادم ختم ہو جائے گا۔ ہر شے انسان کے موافق حرکت کرے گی۔ حتیٰ کہ ہوا تک انسان کی ترقی میں مزاحم نہ ہوگی۔

ہمارا ماحول اور جدید ہیئتِ ذہنی

آنے والے نظام کے حیاتیاتی اثرات

(۱) **دورِ امن**۔ جنگ نوعِ انسان کے حیاتیاتی ارتقا میں ایک گزرنے والی شے ہے۔ اور اپنی افادیت زائل کر چکی ہے۔ کبھی یہ تاریخ کے غیر شعوری ارتقا میں سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتی تھی اور زندگی کو آگے بڑھانے کا ایک ذریعہ تھی۔ اُس وقت انسان کے شعور میں قوّتِ حیات نمودار نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے جنگ ہی تاریخ کی روحِ رواں تھی۔ لیکن جب قوّتِ حیات مختلف مدارج کے بعد مکمل حیثیت سے ظہور پذیر ہوگی۔ تو تمام ارتقا، شعوری ارتقا ہوگا۔ اور نوعِ انسان کی قوّت شعوری قوت سے گریز نہیں کر سکے گی۔

(۲) **شعوری دور**۔ آنے والا زمانہ ایک شعوری دور ہوگا۔ یعنی اب تک ہم ایک اندھے عہد سے گزر رہے تھے جس میں ہمارے ذہن کو ٹکرا ٹکرا اور ٹٹول ٹٹول کر چلنا ہوتا تھا۔ ہمیں اپنا آغاز اور انجام کچھ معلوم نہیں تھا۔ اور ہم زندگی کی پُر اسرار حرکت اور قوّت کے اطراف اور افکار سے سمجھنے سے قاصر تھے

(۳) **دورِ بقا**۔ اب تک قوّتِ حیات نے ہمارے جسم میں ایک قائم رہنے والی حیثیت اختیار نہیں کی تھی۔ بلکہ ابھی تک تربیتِ تشکیل کے منازل طے ہو رہے تھے۔ یعنی قوتِ حیات باقی رہنے والی صورت میں ظاہر ہی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن آنے والے دور میں نشو و ارتقا کے لئے قوّت حیات جسم میں شعوری حیثیت اختیار کرے گی۔ اس وقت تک قوّت حیات . . . . کی جست کو دماغ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ قوّتِ ارتقا اس مرکز پر آ کر رک جاتی تھی اور ادراک کی گرفت سے باہر رہتی تھی۔ لازماً اُس کی نشو و نما کی تمام راہیں بند رہتی تھیں۔

(۴) **موت کا پردہ**۔ آنے والے نظام میں موت کا تاریک پردہ ادراک پر حائل نہیں رہے گا۔ موت تو ہوگی لیکن آئندہ نشو و ارتقا کی راہیں منکشف ہو جائیں گی۔ یعنی موت ایک اسرار اور ایک قوّت نہیں رہے گی۔

(۵) **آزاد ذہن کا زمانہ**۔ آنے والے دَور میں ذہن آزاد ہوگا۔ تاریک اور غلط تصوّرات، اُلجھنیں اور رُکاوٹیں حائل نہیں ہوں گی۔ تمام تاریک پردوں اور بندشوں کی جکڑ بندیاں مٹ جائیں گی۔

خود شعوری ہیئت ذہنی اور غلط تصوّرات کا ازالہ

شعوری ہیئت ذہن کا طلوع تمام غلط تصوّرات اور خیالات کا ازالہ کرتا ہے۔

(۱) حیاتیاتی نقطۂ نگاہ سے خدا، سچائی اور وحی کے تصوّرات بالکل مختلف ہوں گے۔ اس وقت تک خدا ذہن انسانی میں ایک شعور ایک تمیز کی حیثیت میں نہیں تھا۔ اس لئے صحیح نظام اور صداقت دُنیا میں قائم نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ حق کو قائم کرنے والی قوّتِ حیات شعور میں مکمل حیثیت سے نہیں آئی تھی۔ اور وحی ایک لطیف پرواز

ادراک کے سوائے ایک صحیح اور قوّت حیات کے مکمل نمائندہ کی حیثیت میں نہیں تھی اور نہ قربِ حق کا شعور ہی تھا۔ اس لئے مذاہب کے سُنہری دور اور حق کے پروگرام خیالی ثابت ہوئے۔ نامکمل ذہن کو خدا کا نمائندہ نہیں کہا جاسکتا۔ اور کوئی مذہب آنیوالے شعوری نظام کا حریف ثابت نہیں ہوسکتا۔ نہ کسی میں کوئی ایسی خلقی قوّت ہی ہے۔

۲۔ **تحریکاتِ عالم۔** سوشلزم۔ جمہوریت۔ فیسزم۔ نازی ازم اور سیاسی پروگرام نامکمل ثابت ہورہے ہیں۔ اور شعوری سطحِ ذہن پر قائم شدہ نظام سے نہایت پست ہیں۔

۳۔ **حق وناحق کا فیصلہ** اب تک نہیں ہوسکا۔ اور یہ خامی صحیح اور کامل کسوٹی کے نہ ہونے کی وجہ سے تھی۔ لیکن شعوری سطحِ ذہن کا ظہور ہوتے ہی قوّتِ حیات شعور میں نمایاں ہوجائے گی۔ اور کسی ثبوت عملی کی ضرورت نہیں رہے گی۔ قوّت خود ثبوتِ عملی بن کر پیش ہوگی۔

آنیوالے نظام اور دوسرے نظاموں میں فرق

۱۔ دوسرے نظام مثلاً مذاہب کے اپنے طریق کو عقل کی نگاہ میں مضحکہ انگیز طریق ہونے کے علاوہ کسی دوسری صورت میں ظاہر و ثابت نہیں کرسکتے تھے۔ مگر عقل ان سے بہتر پروگرام پیش کرتی رہی۔ آنیوالے نظام میں بہترین عقلی عناصر کا اجتماع ہوگا۔

۲۔ مذاہب سچائی کا واسطہ دے دے کر دُنیا کو اپنی طرف بُلاتے ہیں۔ مگر زندگی میں عملی حیثیت اختیار کرنے کے لئے قوّتِ حیات ان کی پُشت پناہی نہیں کرتی کیونکہ وہ قوّتِ حیات کے نمائندہ ہیں ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نظام آج عملی زندگی سے خارج ہوچکے ہیں لیکن آنے والا نظام سچائی کا واسطہ دے کر نہیں بلکہ خود اس طرح بڑھے گا جیسے زمین بیج کو جگہ دیتی ہے۔

۳۔ دوسرے نظام شعوری سطحِ ذہن کے قبل از وقت ترجمان بنتے تھے۔ جبکہ ذہن نے حیاتیاتی طور پر ان مدارج کو طے ہی نہیں کیا تھا اس لئے ان میں بہت کافی خلا ہے اور وہ قوّتِ حیات کے مسلمات شعوری وتکمیل کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے۔

اجتماعی حقوق

(۱) نوعِ انسان کو یہ حق حاصل ہونا چاہئے کہ وہ امن سے رہ سکے ایک اجتماعی نظام کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ وہ نوعِ انسان کو پُرامن ماحول عطا کرے تاکہ دُنیا جنگ کے اندیشوں اور خطروں سے بے فکر ہوکر ترقی وتہذیب اور تمدّن میں اپنی عام توجہ صرف کرسکے یعنی انسان کے اجتماعی نظام میں خلل واقع نہ ہو۔

(۲) نوعِ انسان کو یہ حق حاصل ہونا چاہئے کہ وہ شایستہ اور انسانیت پر مبنی زندگی بسر کرے۔ خودفروشی۔ جُوا۔ بدمعاشیاں اور وہ تمام خرابیاں ایک انتشار پر مبنی نظام میں موجود ہوتی ہیں ختم ہوجانی چاہئیں۔ یعنی آنے والے نظام میں صحیح سماجی اور معاشرتی اطوار اور خاکے ہونے چاہئیں۔ حیوانیت کا دور ختم ہوکر انسانیت کے دور کا آغاز لازمی ہے۔ تمام خام کاریاں اور نقائص ختم ہوجانے چاہئیں۔

(۳) تمام نوعِ انسان کو یہ حق ہے۔ کہ وہ خدا کی تمیز حاصل کرے۔ اور اعلیٰ ترین اقدار سے ہمکنار ہو۔ اب ضرورت ہے کہ یہ نوع بغیر خدا کی تمیز کے حقائق اور سچائی میں نہ بھٹکتی رہے نئے نظام کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ دُنیا کو خدا کی تمیز کے مدارج طے کرائے۔

(۴) تمام دُنیا غیر شعوری جدوجہد اور کشاکشِ حیات میں ملفوف ہے۔ اُسے اپنے سفر کی منزل کا علم نہیں۔ نوعِ انسان کو حق ہے کہ وہ اپنی جدوجہد سے شعوری طور پر واقف ہو۔ اور یہ غفلت کا لامتناہی بہاؤ ختم ہوجانا چاہئے۔

(۵) تمام نوعِ انسان کو یہ حق ہے کہ وہ ابدی زندگی سے ہمکنار ہو۔ اور فنائیت سے محفوظ ہوجائے۔ حیاتاتی نقطۂ نگاہ سے ہماری قوّتِ حیات کائنات میں فنا نہیں ہونی چاہئے۔ بلکہ ایک بہتر سے بہتر منزل کی طرف بڑھنی چاہئے۔ نئے نظام کے لئے لازمی ہے کہ وہ ہمیں آرزؤں کا اطمینان دلائے۔

(۶) نوعِ انسان کو حق ہے کہ ایک بلند معیارِ زندگی حاصل کرے۔ اور غربت دُنیا سے یکسر فنا ہوجائے۔ دُنیا میں صحت حُسن اور دولت کی فراوانی ہو۔ فوج۔ مخالف جماعتیں۔ اور غلط پروپیگنڈے پر طاقت کا بھی صرف ختم ہوجائے۔

(۷) نوعِ انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ حوادث و سانحات کا شکار نہ ہو۔ اور بے ثباتی۔ بحران یا مخالف حالات کا اُسے سامنا نہ کرنا پڑے۔ مختصر یہ کہ آج سب سے اہم بات یہ ہے کہ نئی آنے والی دُنیا ہمیں اُس منزل تک لے جائے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

یورپ میں ایک ہندوستانی ادیب

آج سے کوئی پانچ سال پہلے کی بات ہے کہ میں یورپ پہنچا۔ واپسی کو اب کچھ اوپر دو سال بیت گئے لیکن اگر آنکھیں بند کیجئے تو پچھلے جنم کی بات معلوم ہوتی ہے۔ پُرانا یورپ اور اسکے ساتھ پُرانی دُنیا ہمارے سامنے قتل ہو رہی ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ اسکے بعد سنسار کا رنگ روپ کیا ہوگا۔ آج کی صحبت بھی اس پُرانے یورپ کی ادبی زندگی کی یاد تازہ کرنا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ میں کوئی ادبی بحث چھیڑنا چاہتا ہوں۔ جن جانے پہچانے ادیبوں سے ملنے کا موقع ملا اور جن آرٹسٹک اثرات سے میں دو چار ہوا انہیں کا تھوڑا سا ذکر مقصود ہے۔

میں نے اپنی تعلیم اور قیام کے لئے پیرس کا انتخاب کیا تھا۔

پیرس جو ہمیشہ ادب اور آرٹ کا گہوارہ رہا ہے اس وقت ہر قسم کی سیاسی اور کلچرل تحریک کا گھر تھا رنگ و نسل کی کوئی تمیز نہ تھی اور ہر اعتبار سے اسے آزادی کی راجدھانی کہا جاتا تھا کہ یہاں کی ہر رات میں دیوالی کی پھبن تھی۔ بلکہ اس لئے کہ یہاں انسانیت اور آزادی کی وہ مشعل روشن تھی جس نے صدیوں تک ساری دُنیا میں اُجالا کیا۔ پیرس گویا ایک روشن مینار تھا جس پر چڑھ کر ہر آنکھ والا یورپ کی کلچرل زندگی کے اُتار چڑھاؤ کا جائزہ لے سکتا تھا۔

پیرس پہنچنے کے بعد مجھے سب سے پہلے ترکی کی مشہور ادیبہ خالدہ ادیب خانم سے ملنے کا موقع ملا۔ انہوں نے اپنے ہی محلّے کے ایک فرانسیسی کنبہ میں میری رہائش کا انتظام کر دیا۔ سال ڈیڑھ سال میں اُن سے برابر ملتا رہا۔ اور خیالات کے بُنیادی اختلاف کے باوجود میں نے محسوس کیا کہ زندگی میں پہلی مرتبہ ایک مکمل انسان سے مل رہا ہوں اُن کی سادگی بہتے ہوئے پانی کی طرح نرمل تھی اور ان کے خلوص میں بلور کی طرح کبھی بال نہ آتا تھا۔ اُن میں بناوٹ نام کو نہ تھی اور یہ ایک عورت میں انہونی سی بات ہے۔ اُن کی ذات سدا بہار پھول کی طرح ہے جو سرد و گرم میں ایک سا رہتا ہے، جس کی مہک میں کبھی فرق نہیں آتا۔ ساتھ ہی ساتھ اُن میں ایک قسم کی مضبوطی بھی جو بادِ مخالف کے آگے جُھکنا نہیں جانتی۔ خانم کی خود داری کی ایک مثال یاد آتی ہے جب انہوں نے اپنے شوہر عدنان بے کے ساتھ ترکی کو چھوڑ کر غریب الوطنی اختیار کی تو اتاترک نے اُن کی قومی خدمات کے صلہ میں ایک معقول ماہانہ پنشن مقرر کر دی۔ لیکن دونوں نے یہ پنشن لینے سے انکار کر دیا۔

اب دستور یہ تھا کہ سالہا سال سے مہینہ کی ہر پہلی تاریخ کو بینک کا چیک اُن کے پاس آتا اور وہ اسے دیکھے بنا جوں کا توں لوٹا دیتے۔ اتاترک کے انتقال کے بعد ہی عصمت انونو نے انہیں ترکی بُلا لیا۔ ہندوستان سے اُنہیں بڑی ہمدردی تھی اور اُن کا یہ جملہ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہا ہے کہ: "ہندوستان کی تصویر میرے ذہن میں ایک بھکاری کی صورت میں محفوظ ہے جو تاریخ سے کسی چیز کی بھیک مانگ رہا ہے"۔

پیرس یونیورسٹی میں میرے شعبہ کی سیکریٹری ایک روسی خاتون تھیں اُن کا نام مادام شوپاک تھا۔ انقلاب کے بعد ان کا خاندان روس سے چلا آیا تھا۔ وہ نہایت شریف اور علم پرور خاتون تھیں اور اپنی برادری کے ادیبوں سے اُن کی جان پہچان تھی۔ جب مجھے فرانسیسی سمجھنے اور لکھنے کا سلیقہ ہو گیا تو میں نے اُن سے درخواست کی کہ کچھ روسی ادیبوں سے ملائیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ انقلاب کے بعد روس سے زیادہ تر مشہور ادیب اپنا گھر تج کر فرانس چلے آئے تھے۔ ان میں ——

KUPRIN- BUNIN- ROMESOF

MAREJKOVSKY خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

BUNIN تنہا روسی ادیب ہے جسے نوبل پرائز ملا۔

کیپرل کے ناول YAMA THE PIT کی ساری دُنیا میں دھوم ہے۔ ROMESOF کی شہرت دوسرے ملکوں میں زیادہ نہیں۔ لیکن اپنی زبان کا وہ سب سے بڑا صاحب طرز سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ نئے روس میں بھی اُسکے قلم کا لوہا مانا جاتا ہے

"دیوتاؤں کی موت" کے نام ور مصنف (Marejkowsky) کے کمال میں کوئی شک نہیں۔ لیکن عمر کے ساتھ اس پر مذہب کا رنگ گہرا ہوتا جاتا ہے۔ مادام شوپاک کی عنایت سے میں (Kuprann) اور (Marejkowsky) دونوں سے ملا۔

سین ندی کے پاس کی ایک تنگ سی گلی کے کسی بوسیدہ مکان میں کیپرن رہتا تھا۔ دستک دیتے ہی دروازہ کھلا۔ اور ایک لڑکی نے سر نکال کر کہا۔

"جدراستویتے! ابا آپ لوگوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ لیکن بیماری کی وجہ سے وہ پلنگ سے نہیں اُٹھ سکتے۔ وہ آپ سے اپنی خواب گاہ میں ملیں گے۔

بڑی بڑی مونچھوں والا ایک بوڑھا بستر پر لیٹا ہوا ہے۔ یہی کیپرن ہے۔ وہ ادیب جس نے بدنصیب طوائفوں کی دُکھ بیتی لکھ کر دُنیا کو دہلا دیا۔ یہ اُس کے چل چلاؤ کا زمانہ تھا۔ دھیمی آواز میں وہ کہنے لگا۔ میں نے بھی نیچ کے طور پر ظلم کے خلاف احتجاج کیا ہے زندگی کی چھب کسی ایک رنگ سے نہیں بن سکتی۔ اور یہ کون کہہ سکتا ہے کہ کسی رنگ کی کمی یا زیادتی سے اس کا روپ سنور یا بگڑ جائے گا۔ حقیقت اور مسرت کی تلاش میں انسان بہت سے تجربے کرتا آیا ہے تو پھر روس کو بھی اس کی اجازت کیوں نہ دی جائے۔ کیونکہ میں اس تجربے کے ہر پہلو کو نہ سمجھ سکتا تھا۔ اس لئے راستہ سے ہٹ گیا۔ اسکی مخالفت نہ کی۔ جو بھی ہو، روس کی مٹی میری روح میں بسی ہوئی ہے اور مرنے سے پہلے میں ایک بار اسے دیکھنا چاہتا ہوں"

اس ملاقات کے چند ہفتہ بعد کیپرن کو روس جانیکی اجازت مل گئی۔ اور وہ وہاں جا کر کس مپرسی کی حالت میں مر گیا۔ باتوں باتوں میں وہ مجھ سے اپنے پرانے دوست مشہور آرٹسٹ نکولس رورک کے حالات پوچھنے لگا جو بہت دنوں سے ہمالیہ کے دامن میں کلو کی وادی میں رہنے لگے ہیں۔

(Marejkowski) رہن سہن اور شکل و صورت میں پُرانے زمانہ کے کسی ادیب سے ملتا جلتا تھا۔ کمرہ کے کونے میں مریم کا بُت رکھا ہے۔ اور اس کے آگے موم بتی جل رہی ہے۔ ہاتھوں میں تسبیح ہے اور زبان پر ایک رٹ ہے کہ دُنیا اس لئے ہلاک ہو رہی ہے کہ اُسے کسی شے پر ایمان نہیں۔ ایک بار وہ کہنے لگا کہ اگر تم پُرانے روس کا تماشہ دیکھنا چاہتے ہو تو کرسمس کی رات کو ایک محفل میں شریک ہو۔ یہ دعوت زار کے بھتیجے کے اعزاز میں ہوگی جو اس کا حقدار ہے۔ وہاں تم لٹے ہوئے روسی امراء کے طور طریقوں کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھ سکتے ہو۔ ایسا موقع کب ملنا تھا۔ میں فوراً تیار ہو گیا۔ ایسا دلچسپ تماشہ کبھی دیکھنے میں نہ آیا۔ ایک بہت بڑے کمرہ میں جھاڑ فانوس روشن ہیں۔ مردہ زاروں کی تصویریں دیواروں پر لٹکی ہوئی ہیں۔ گرانڈ ڈیوک مائیکل ایک زرّیں کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ ہر آنے والا جو یا تو شوفر یا بھٹیارہ تھا۔ یہاں کاؤنٹ کے بھیس میں نظر آتا تھا۔ سب نے آکر اس نقلی زار کے ہاتھ کو چوما۔ ایک بھاری بھرکم پادری نے اس کے لئے برکت کی دُعا مانگی۔ پھر سب نے ہز ہائینس کا جام صحت پیا۔ دیر تک لوگ کیویار (Caviar) کھاتے رہے، ووڈکا پیتے رہے۔ اور پولسکا یا والز ناچتے رہے۔ ہر ایک تقریر کا یہی موضوع تھا ——

جب ہم اپنی زمینداری میں رہتے تھے، جب ہم دربار میں پیش ہوئے میرے پاس جو کاؤنٹس بیٹھی ہوئی تھیں کہنے لگیں — میں نے بھی سُنا ہے کہ ہندوستان خوبصورت شہر ہے۔ کیوں صاحب یہ ہے کس طرف۔ گویا قبرستان کے مُردے تھوڑی دیر کے لئے جاگ اُٹھے تھے اور بیتی ہوئی زندگی کا ناٹک دکھلا رہے تھے۔

فرانسیسی ادیبوں میں مجھے رومان رولان کی شخصیت نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ باہر اس کی جتنی عزت ہے اُتنی فرانس میں نہیں۔ عوام میں اس لئے نہیں کہ گزشتہ جنگ کے پہلے سے وہ فرانس کی عسکریت اور سرمایہ دارانہ تمدن کی مخالفت کرتا آیا تھا۔ ادیبوں میں اس لئے نہیں کہ اس کی زبان زیادہ منجھی ہوئی نہیں ہوتی۔ اور یہ سب سے بڑا گناہ ہے جو فرانس کے کسی لکھنے والے سے سرزد ہو سکتا ہے۔ اس زمانہ کے فرانسیسی ادب کی مثال اس رنگیلے بوڑھے کی سی تھی جو دن رات آئینہ میں اپنی شکل دیکھ دیکھ کر کبھی ماضی کا ماتم کرتا ہو اور کبھی حال سے بیزاری کا اظہار زمانۂ حال سے بیزاری اور مستقبل سے ناامیدی ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ اس دور کے بہترین ناول نگار (Cellina) اور Montherland اور Andre Malraux اسی رجحان کے ترجمان ہیں۔ کے سوا اِٹنل کے کسی بڑے لکھنے والے میں انسانیت کا درد نہ تھا۔ یہی وہ بیزاری اور شک پرستی کا زہر تھا جو گزشتہ جنگ کے بعد فرانس کے رگ و پے میں سرایت ہو گیا۔ اور اس کی ہلاکت کا باعث ہوا۔

رومان رولاں ۳۸ء میں سوئٹزرلینڈ سے فرانس لوٹ آیا تھا۔ اور پیرس سے کوئی پچاس میل دور Vanilly نامی

گاؤں میں رہتا تھا۔ جیسے ہی مجھے یہ بات معلوم ہوئی دل بے اختیار چاہا کہ اس سے ملیئے۔

Soul Enchanted اور Jean Christophe کے مصنف کو میں اس دور کا سب سے اچھا تو نہیں لیکن سب سے بڑا ناول نگار سمجھتا ہوں۔ اور گورکی کے ساتھ اس کی تحریروں نے مجھ پر بڑا اثر کیا ہے۔

میں نے خط لکھ کر اس سے ملنے کی اجازت چاہی۔ جواب آیا کہ ضرور آؤ۔ اور ایک ویک اینڈ کے لئے میرے مہمان رہو۔

یہ دو دن ہمیشہ یاد رہیں گے۔ رومان رولاں کا آرٹ ایک بہتے ہوئے دریا کی طرح ہے جو کبھی گرجتا ہے تو کبھی میٹھے سُروں میں گنگناتا ہے لیکن اس کا بہاؤ کبھی نہیں رُکتا۔ اور اس کی شخصیت پہاڑ کی طرح سربلند نہیں جس کے قریب جا کر آدمی کو اپنی کمتری کا احساس ہوتا ہے۔ بلکہ ایک پُرسکون سمندر کی طرح ہے جس میں تیر کر آدمی کو تازگی محسوس ہوتی ہے اس وقت یورپ پر جنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے اور وہ اُداس تھا "انسان نے انسانیت کے تئیں اپنا فرض ادا نہیں کیا" —— وہ بولا "کاش کہ لکھنے والے اپنے فرض کو سمجھتے۔ اور دُنیا کو نیند سے بیدار کر سکتے"۔

ایک چھوٹی سی تقریر کی مثال ریل کے سفر کی ہے جس میں آپ کھڑکی سے سر نکال کر باہر کے نظارہ پر ایک اُچٹتی ہوئی نظر ڈال سکتے ہیں اور بس۔

اب میں بہت سی باتوں کو چھوڑ کر ایسی صحبتوں کا ذکر کرتا ہوں جن کا اثر بہت سی ادبی محفلوں سے زیادہ ہوتا ہے۔

پیرس کی کئی تفریح گاہیں اور کیفے صرف ادیبوں اور آرٹسٹوں کے لئے مخصوص ہیں۔ موں مارت کا ایک کیفے وکٹر ہیوگو سے منسوب ہے۔ سو سال سے یہاں شاعر اور ادیب بیٹھتے آئے ہیں وہی اُنیسویں صدی کا ماحول ہے۔ دیواروں پر شاعروں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی نظمیں اور مصوروں کے ہاتھ کے بنائے ہوئے اسکیچ لٹک رہے ہیں۔ شراب کے دام نہ ہونے پر یہ کیفے کے مالک کو بیچ دئے جاتے تھے۔ کوئی اپنی نظم سنا رہا ہے تو کوئی پیانو پر اپنا نیا گیت گا رہا ہے۔ کسی میز پر ادبی علمی بحث چھڑی ہوئی ہے۔ تنگ نہ خانہ سگریٹ کے دھوئیں سے بھرا ہوا ہے۔ عجیب عجیب لوگ جمع ہوتے ہیں یہاں کوئی نو سال سے دُنیا کی خاک چھانتے ہوئے ہر کس و ناکس سے پوچھتا پھرتا ہے کہ حقیقت کیا ہے۔ اور اُن کے جواب کو تیرہ موٹی موٹی جلدوں میں قلمبند کر چکا ہے ایک حاضر جواب کو یہ کمال حاصل ہے کہ آپ کا نام و پتہ پوچھ کر اُسی وقت آپ کی ذات گرامی پر ایک نظم تحریر کر کے اٹھنی میں آپ کو بیچ دیگا۔ کسی نے دھن دولت سے مُنہ موڑ کر خانہ بدوشوں کا سنگ پکڑ لیا ہے۔

خانہ بدوشوں سے زیادہ کسی کی زندگی آرٹسٹک نہیں۔ خاص طور پر ہنگری کے جپسی۔ نہ اُن کا کوئی گھر بار ہے نہ خاندان نہ جائداد۔ جب تک جی چاہتا ہے رہتے ہیں۔ اور جی اُکتاتا ہے تو اُٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ انھیں مہذب کرنے کی سب کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ اور جب اُنھیں ایک جگہ رہنے پر مجبور کیا گیا تو وہ دق میں مبتلا ہو کر مر جاتے ہیں۔ ہنگری کی سیر کرتے کرتے میں نے ایک دوست سے پوچھا۔ کہ کیا جپسیوں کے ساتھ تھوڑا سا وقت گزارا جا سکتا ہے۔ بڈاپیسٹ سے کوئی سو میل دور بالاموں کی جھیل کے کنارے ان کی زمینداری تھی۔ اور وہاں جپسیوں کے کارواں ٹھیرا کرتے تھے۔ ایک شام میں نے اُن کے ساتھ گزاری۔ اور یہ سینکڑوں مہذب صحبتوں سے زیادہ پُرلطف تھی۔ ہنگری کے جپسیوں کی موسیقی دُنیا میں انتخاب ہے۔ اور ان کے نغمہ و رقص کا جوش کہیں دیکھنے میں نہیں آتا۔ یہ آوارگی اور سرمستی تہذیب کے بیماروں میں کہاں سے آنے لگی۔

بہت سی باتیں یاد آتی ہیں۔ کن کن کا ذکر کیا جائے۔ تاریخ میں ایسے دَور بھی آتے ہیں۔ جب چند سالوں کا تجربہ صدیوں کے تجربے سے زیادہ بوجھل ہوتا ہے۔ اور اس بوجھ سے دب کر ایک پوری نسل بوڑھی ہو جاتی ہے۔

شاید ہم اس دور سے گزر رہے ہیں۔

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو۔ دہلی)

اکرام قمر ایم۔اے

ابتدائی مسیحی کلیسا کے سیاسی افکار

عہد نامۂ جدید کی سیاست

۳۱۳ء میں شہنشاہ قسطنطین نے عیسائیت کو مملکتِ روما کا ایک مذہب قانوناً تسلیم کر لیا۔ حضرت عیسیٰ کے وقت سے لیکر اس اہم ترین تاریخ تک تین صدیوں کے دوران میں عیسائی کلیسا کو عجیب و غریب انقلابات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس زمانہ کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) یروشلم تا ۵۰ء (۲) انطاکیہ ۵۰ء۔۱۵۰ء
(۳) اسکندریہ ۱۵۰ء۔۲۵۰ء (۴) روما ۲۵۰ء۔۳۱۳ء

پہلے دور ۔۔۔ مسیح اور اس کے حواریوں کے دور ۔۔۔ میں حضرت عیسیٰ اور اُن کے حواری سیاسیات سے دوسری تمام دُنیوی چیزوں کی طرح بے اعتنائی برتا کرتے تھے۔ انھیں حاضر اور ارضی چیزوں سے کچھ تعلق نہ تھا۔ بلکہ غائب اور ابدی چیزوں سے واسطہ تھا وہ دُنیا کی بے ثباتی کے قائل تھے اور کہتے تھے کہ جلد ہی روزِ حساب آنے والا ہے جس میں صرف روحانی اشیا ہی تسلیم کی جائیں گی۔ اور اس بات کو کچھ اہمیت نہیں دی جائے گی کہ اس دُنیا کی عارضی زندگی میں ایک شخص بادشاہ رہا ہے یا گدا۔ اشرافیت پسند رہا ہے یا جمہوریت پسند۔ جمہوریت پسند رہا ہے یا بادشاہت پسند۔ یہ چھوٹی سی عیسائی برادری ایک ریاست ۔۔۔ سلطنت در سلطنت ۔۔۔ کے مشابہ تھی۔ اگرچہ اس میں ارضی حکومت کے تمام لوازمات۔ مثلاً قطعۂ ارض، آمدنی، فوج اور پولیس موجود نہ تھے۔ مگر ان تمام سے محرومی کے باوجود یہ برادری بجائے ایک کلیسا کہلانے کے ایک سلطنت ہونے کی دعویدار تھی۔ مسیح اس کا شہنشاہ تھا، اس کے احکام کو یہ برادری تسلیم کرتی تھی۔ حتیٰ کہ انھیں مقدس موسوی قوانین پر بھی فوقیت دیتی تھی۔ اس نے خود مختار ادارے قائم کئے۔ اس کے سیاسی (مذہبی کے برعکس) اسلوب کے عجیب و غریب نتائج نکلے

ایک طرف تو اس نے یہودیوں کو یہ یقین دلایا کہ مسیح کی "سلطنت" ایک ایسی تنظیم ہے جو مذموم رومی جوئے کے اُتار پھینکنے میں مدد دیگی۔ دوسری طرف اس نے حکومت روما کو خائف کر دیا۔ اور آپنے آقا کو صلیب پر لٹکوا دیا۔ کیونکہ "یہودیوں کا ہونے والا بادشاہ" تھا۔ مگر مسیح نے نہایت حزم و احتیاط سے کام لیتے ہوئے مشتعل یہودیوں اور پریشان خاطر رومیوں کو یہ بات صاف طور پر بتلا دی تھی۔ کہ وہ نہ تو ان کے سیاسی مسائل میں کسی قسم کی دلچسپی لیتا ہے۔ اور نہ وہ داؤد کی حکومت دوبارہ قائم کرنے کا یا قیصر کے اقتدار کو للکارنے کا خواہاں ہے۔ اس نے اپنی تعلیمات میں دو ایسے فقرے کہے ہیں جو سیاسی نظریات کی تاریخ میں اہم ترین حیثیت کے مالک ہیں پہلا فقرہ ہے کہ "میری سلطنت اس دُنیا کی نہیں ہے" دوسرا فقرہ ہے: "قیصر کی چیزیں قیصر کو اور خدا کی چیزیں خدا کو دو۔" ان جامع فقروں نے مذہب کو سیاسیات سے علیحدہ کر دیا۔ ان کے دائرہ عمل جدا جدا کر دئے۔ اور ان کی حد بندی کر دی۔ ان فقروں نے کلیسا کو ریاست سے علیحدہ کر دیا۔ اور یونانی و رومی شہری ریاست کے اس نظریّہ کو ختم کر دیا کہ خدا کی عبادت شہری انتظام کے ماتحت ہے۔

دنیوی اغراض سے علیحدگی کا طریق کار جو مسیح اور اس کے بارہ حواریوں کا طرۂ امتیاز تھا۔ مسیح کو سولی لٹکانے کے بعد بہت عرصہ تک جاری نہ رہا۔ ایک طرف تو دُنیا کا متوقع خاتمہ نہ ہوا۔ کلیسائے یروشلم کی تمام دولت ختم ہو چکی تھی۔ اور اب وہ پریشان کن افلاس کا شکار تھا۔ دوسری طرف انجیل کی تعلیم بنی اسرائیل سے باہر بھی پھیل گئی اور غیر یہودیوں نے بھی اسے قبول کر لیا۔ مشرقی مذاہب سے اس کے تعلقات پیدا ہو گئے جو اس پر بہت اثر انداز ہوئے۔ اس نے تجسیم مسیح (مسیح کا انسانی شکل اختیار کرنا) کفّارہ، دوسری زندگی اور بقائے دوام کی نئی تعلیم پیش کی جس نے اسے یہودیت سے فی الفور علیحدہ کر دیا۔ حالانکہ اس کی بنیاد یہودیت پر ہی تھی۔ اس نئی تعلیم

کا مبلغ سینٹ پال تھا۔ اور انطاکیہ (جہاں حواریوں کو سب سے پہلے عیسائی کا نام دیا گیا) نے جدید اناجیل اربعہ کی تعلیم کی نشر و اشاعت کی۔ یہ تعلیم ایشیائے کوچک، مقدونیہ اور یونان میں نہایت تیز رفتاری و کامیابی کے ساتھ پھیل گئی۔ حتیٰ کہ روما تک بھی پھیل گئی۔ غیر یہودیوں نے انبوہ در انبوہ ہر جگہ اس کا خیر مقدم کیا۔ مگر یہودیوں نے ہر جگہ اس کی مخالفت کی۔ سینٹ پال ایک رومی شہری تھا۔ اس نے اپنی شہریت کی تمام مراعات اور اختیارات کو اپنی حفاظت اور تبلیغ کیلئے مکمل طور پر استعمال کیا۔ اکثر اوقات اس نے مدنی حکام کے پاس درخواستیں گزرانیں جن سے وہ خود بھی تباہی و بربادی سے بچ جاتا اور اس کا ننھا سا کلیسا بھی محفوظ ہو جاتا۔ اس لئے روما کی شہنشاہی قوت کا وہ ممنونِ احسان اور شکر گزار تھا۔ اس کا خیال تھا کہ روما کی حکومت قیام امن اور ضبط و قانون کے ذریعہ چھوٹے پیمانے پر وہی کام کر رہی ہے۔ جو کلیسا سر انجام دیتا ہے۔ اور لوگوں کو مسیح کی طرف بلا رہی ہے چنانچہ اس نے یہ تعلیم دی کہ دنیوی قوت خدا کی عطا کردہ ہے۔ اور کہا۔ "جو قوتیں اس دُنیا میں موجود ہیں وہ خدا کی مقرر کردہ ہیں۔" اس نے اپنے پیروؤں کو حکم دیا کہ وہ "بادشاہ اور ہر صاحب اقتدار کے لئے"
۲۰ دعا مانگا کریں۔ اس نے اطاعت پر زور دیتے ہوئے کہا "ریاست اور طاقت کے مطیع رہو۔ حکام کا کہنا مانو اور ہر اچھے کام کیلئے تیار رہو" رومی شہریت کی اُس نے جتنی تعریف کی اور رومی بادشاہت کے ساتھ جتنی عقیدتمندی ظاہر کی اُتنا ہی اُس نے کلیسا اور ریاست اور برگزیدۂ حق اور دنیوی لوگوں کے فرق پر زور دیا جو مسیح کی تعلیم کا ایک نمایاں پہلو تھا۔ خطا کار کارنتھیوں (یونان کے علاقہ کارنتھ کے باشندے) کو مخاطب کرتے ہوئے وہ نہایت غیظ و غضب کے ساتھ کہتا ہے "جب تم میں سے کسی ایک کو دوسرے کے خلاف شکایت ہو تو کیا اس میں یہ جرأت ہے کہ اسقفوں کے بجائے انصاف کُش اشخاص کے سامنے اپنا مقدمہ لیکر جائے؟" اس سے یہ صاف طور پر عیاں ہے کہ کارنتھ کا کلیسا ایک خود مختار کلیسا تھا۔ اور عدل و انصاف کرنے کیلئے اس کے اپنے حکام اور اپنا مناسب طریق کار تھا۔

یہ ایک دلچسپ امر ہے کہ سینٹ پال کی تحریروں اور رواقیوں کی تعلیمات میں نمایاں مشابہت ہے۔ مثلاً یہ نظریہ کہ قانون قدرت بلا امتیاز ملت و حالات ہر شخص کے دل اور ضمیر پر کندہ ہے۔ اور یہ خیال کہ ہر شخص بلا امتیاز دنیوی مراتب کے خداوندی انعام و اکرام کا مساوی حقدار ہے۔

سینٹ پال کے نظریات کی تائید سینٹ پطرس کے مبینہ مکتوبِ اوّل میں پائی جاتی ہے جس میں یہ درج ہے کہ "انسان کے ہر حکم کے سامنے خدا کی خاطر سر تسلیم خم کر دو۔ خدا سے ڈرو ــــ بادشاہ کی عزت کرو۔"

دَورِ جبر و تعذیب

عیسائی کلیسا اور سلطنت روما کا یہ خوشگوار اتحاد زیادہ عرصہ قائم نہیں رہا۔ ایک طرف تو اپنی تمام رواداری کے باوجود سلطنت اس بات پر زور دیتی تھی کہ بلا کسی استثنار کے رعایا قربانیاں اور خدمات کرے جو عیسائی تعلیم کے منافی تھیں۔ اور دوسری طرف کلیسا محض ایک ایسے مذہب کی حیثیت میں زندہ رہنے کو تیار نہ تھا جس کے ساتھ حکومت کی طرف سے صرف رواداری برتی جا رہی ہو۔ وہ اس بات پر قانع نہ تھا کہ اُسے فقط یہودیت کی ایک خاص شاخ یا مشرق کے کثیر مذاہب میں سے ایک مذہب سمجھا جائے۔ اس کا اعلان تھا کہ عیسائیت اور صرف عیسائیت ہی عالمگیر اور سچا مذہب ہے۔ جب پنتھیئن خداؤں (روما کے گول مندر کے دیوتاؤں) نے اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ مسیح کے محض پیشرو ہیں تو کلیسا نے ان سب کو شیاطین قرار دیا۔ یہ اعلان عامۃ الناس اور خصوصاً غیر اہل کتاب پجاریوں کے لئے اشتعال انگیز تھا اور شہنشاہ کو اس پر سب سے زیادہ طیش آیا۔ کیونکہ شہنشاہ ہونے کی وجہ سے وہ رومائے قدیم کے پجاریوں کی مجلس کا ایک رکن تھا۔ چنانچہ حکومت نے کلیسا کی ہستی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور عیسائیوں کو "غیر مدنی الطبع" اور "دشمنِ انسانیت" قرار دیا گیا۔ اس اعلان کی وجہ سے گاہے بگاہے ہنگامے اور جبر و تعذیب کے واقعات رونما ہوئے۔ عیسائیوں نے ـــ جو جوش سے بھرے ہوئے۔ شہادت کے شائق اور اس طرح جنّت کے حصول کو یقینی خیال کرتے تھے ـــ مخالفانہ تعصب کو دُور کرنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ کلیسا کی ہستی کو تسلیم نہ کرنے سے علانیہ مخالفت شروع ہو گئی۔ یہ بڑھتی ہوئی مخالفت ابتدائی کلیسا کی تاریخ کے دَورِ اسکندریہ (۱۵۰ء-۲۵۰ء) کی نمایاں خصوصیت تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسکندریہ ہی میں غیر اہلِ کتاب فرقوں اور عیسائی رسوم کے معتقدوں کے درمیان اختلاف نے متعدد شورشوں کی شکل اختیار کر لی۔ اب سلطنت روما نہ صرف کلیسا کی محافظ و سرپرست نہ تھی بلکہ اس کی مخالف تھی اور اسے کچلنے کیلئے

ہے بکا ہے اس پر سختیاں بھی کرتی۔ اس روش کے جواب میں کلیسا نے بھی
۔۔۔ سلطنت کے بارے میں بدل لیا۔ کلیسا اب بادشاہت کو خدا
۔۔۔طرف سے مقرر شدہ نقیب اناجیل، امن کا ضامن، اور لوگوں کو قانون
۔۔۔ذریعے مسیح کی طرف لانے والا اُستاد نہیں سمجھتا تھا بلکہ اسے ناجی کے
۔۔۔کے لئے خطرناک اور دُنیا کی نجات کے لئے نقصان دہ شیطان
۔۔۔متا تھا۔ اس نے مقدس سینٹ جان کے اس پیغمبرانہ الہام کو اپنایا
۔۔۔میں روما کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ "بابل ــــ سب سے بڑی
۔۔۔ ــــ طوائفوں اور ارضی خباثتوں کی ماں ہے" اور اسے
۔۔۔زاہدوں اور شہیدوں کے خون سے بدمست" قرار دیا گیا ہے۔

عیسائیت نے غیر مدنی روش اختیار کر لی تھی اور دُنیاوی
۔۔۔قوتوں سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ مگر دُنیاوی طاقتوں کے لئے اس سے
۔۔۔زیادہ ۔۔۔دار اور خطرناک چیز کلیسا کی بڑھتی ہوئی تعداد و تنظیم تھی۔ اپنے
۔۔۔مخصوص صدقات، پادریوں، اسقفوں، اور بطریقوں کی وجہ سے کلیسا
۔۔۔سلطنت کے اندر ایک اور منظم و مضبوط سلطنت کی حیثیت اختیار
۔۔۔کر چکی تھی جو اپنی تنظیم و ذرائع کی بنا پر بادشاہت کے قوت و اقتدار کی
۔۔۔رقیب بن گئی تھی۔ تیسری صدی کے وسط میں شہنشاہ ڈیشئس
۔۔۔نے یہ اعلان کیا کہ وہ ایک مخالفِ قیصر کی نسبت اسقفِ روما کو زیادہ
۔۔۔خطرناک سمجھتا ہے۔ چنانچہ اس نے خوفناک "تعذیب عام" کی ابتدا کر دی
۔۔۔۲۵۰ء سے ۳۱۱ء تک مختلف وقفوں کے ساتھ جاری رہی
۔۔۔ پُر خطر و ہولناک سالوں کے دوران میں چند قابل ترین و
۔۔۔محب وطن بادشاہوں نے عیسائی کلیسا کے قلع قمع کے لئے پُر زور
۔۔۔کوششیں کیں۔ مگر یہ کوششیں قطعی طور پر ناکام رہیں اور انھیں اپنی
۔۔۔ناکامی کا علانیہ اعتراف کرنا پڑا۔ ۳۱۱ء میں تعذیبی فرامینِ حکومت
۔۔۔منسوخ کر دئے گئے۔ جیسا کہ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں اس سے دو سال بعد
۔۔۔قسطنطین نے عیسائیت کو سلطنت کے قانونی مذاہب میں جگہ
۔۔۔دی۔ چونکہ غیر اہل کتاب اشخاص (pagans) کے دماغ
۔۔۔اور روح مردہ ہو چکی تھی۔ اس لئے اس اعتراف کا مطلب
۔۔۔عیسائیت کا قیام تھا۔ اسی سال تک ــــ جو جبر و تعذیب کی
۔۔۔صدیوں کے درمیان رواداری کا دلچسپ دَور ہے ــــ
۔۔۔عیسائیت اور دوسرے فرقے شانہ بشانہ موجود رہے۔ ایک فرقہ سلطنت
۔۔۔دور کی مقبولیت حاصل کر رہا تھا اور دوسرے فرقے زوال پذیر
۔۔۔آخر کار ۳۹۲ء میں شہنشاہ تھیوڈوسئس اول نے منادر بند
۔۔۔کر دئے اور غیر اہل کتاب لوگوں کی قربانیاں ممنوع قرار دیں۔ صرف
عیسائیت ہی اب تمام سلطنت میں قانونی مذہب کی حیثیت
رکھتی تھی۔

(۳) قسطنطین سے آغستین تک

قسطنطین کی تبدیلیٔ مذہب ایک اہم واقعہ تھا جس کے دُور رس نتائج نکلے جس طرح اس سے پیشتر کے ناکام دورِ جبر و تعذیب کے اسباب سیاسی تھے اسی طرح اس واقعہ کے اسباب بھی سیاسی تھے قسطنطین اپنے پیشرو ڈیوکلیشئن کی طرح سلطنت کے شکستہ اتحاد کو دوبارہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ ڈیوکلیشئن کو یہ توقع تھی کہ اسقفوں کا خاتمہ کر کے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیگا۔ مگر قسطنطین اس مقصد کیلئے انہی اسقفوں کو آلۂ کار بنانا چاہتا تھا۔ اسقفوں نے شاہی مشیروں میں تبدیلی کا خیر مقدم کیا۔ اسے انھوں نے خداوند کی طرف سے ایک خوشگوار تبدیلی سمجھا۔ اسکی وجہ سے انھیں بجائے اپنی جانوں کا ایندھن بنا کر تاپنے کے شاہی آگ کے سامنے ہاتھ تاپنے کا موقع مل گیا۔ انھیں اس بات پر مجبور کر دیا گیا تھا کہ وہ قسطنطین کو بجائے ایک نائب کے اپنا سرپرست اور بجائے ایک شاگرد کے اپنا اُستاد سمجھیں۔ اس تبدیلیٔ مذہب کے چوبیس سال بعد جب وہ
21 بسترِ مرگ پر تھا تو اس نے بپتسمہ لیا۔ تاحین حیات وہ رومائے قدیم کے پجاریوں کی مجلس کا رُکن رہا۔ اور اپنے شاہی حقوق کی بنا پر وہ اپنی سلطنت کے عیسائی کلیسا کا سردار اعلیٰ بن گیا۔ اگرچہ اس نے ابھی تک بپتسمہ نہیں لیا تھا۔ مگر تمام مسیحی دُنیا کی پہلی مجلس نیکائی (قصبہ نیکیا میں عیسائیوں کی دو مجالس منعقد ہوئی تھیں۔ پہلی ۳۲۵ء میں اور دوسری ۷۸۷ء میں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اس قضیے کا تصفیہ کریں کہ حضرت مسیح جسمانی حیثیت سے عشائے ربانی میں موجود ہوتے ہیں کہ نہیں اس کے علاوہ اس مسئلہ پر بھی غور کریں کہ عیسائیت میں بتوں کو رکھنے کی اجازت ہے یا نہیں) منعقدہ ۳۲۵ء کے افتتاحی اجلاس کی صدارت کی جو اس کے گرمائی محل میں منعقد ہوئی تھی اور جہاں اس کا "اسقفِ اعظم" کی حیثیت سے استقبال کیا گیا تھا۔

المختصر عیسائی کلیسا نے اب وہ حیثیت اختیار کر لی تھی جسے اس نے پہلی صدی عیسوی میں قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اب کلیسا ریاست کا ایک محکمہ بن چکا تھا اور اس کے اسقف حکومت کے عہدہ دار بن چکے تھے سیاست اور مذہب کی علیحدگی کو سرکاری طور پر دور کر دیا گیا تھا۔ غیر اہلِ کتاب حکومت کا یہ نظریہ کہ مذہب سلطنت کے ماتحت ہے دوبارہ زندہ ہو گیا۔ یہ تاکیدی حکم بے معنی ہو کر رہ گیا کہ "قیصر کی چیزیں قیصر کو اور خدا کی چیزیں خدا کو دو۔"

قیصر کو زمین پر خدا کا خلیفہ اور اس کی اطاعت کو ایک مذہبی فریضہ تصور کیا جانے لگا۔ اس لئے سلطنت کے قبول عیسائیت کو کلیسا کا ارتداد بھی کہا جا سکتا ہے۔

اس غیر کتابی (Pagan) سیاسی نظریہ کا احیا جب قسطنطین نے مجلس نیکائی کو طلب کر کے اور اس کی صدارت کر کے کیا، تو مخلص عیسائیوں نے اس پر بہت اعتراض کیا۔ اور جو کلیسا کے اس دنیاوی رنگ میں رنگے جانے سے خوفزدہ ہو چکے تھے سماجی زندگی کو ترک کر کے عزلت نشین راہب بن گئے۔ جو عیسائی مذہب اور سیاست دونوں سے تعلق رکھتے تھے اور مذہبی طاقت نے بادشاہ کو جو مطلق العنانہ اختیارات دیدئے تھے اُن سے چوکنے ہو چکے تھے انھوں نے کھُلم کھُلا بغاوت کر دی جیسے بدعات نے اور بھی تقویت پہنچائی۔ گا تھیا کی آریوسیت[1] (یہ نظریہ کہ عشائے ربانی میں حضرت عیسیٰ شراب اور روٹی کے ساتھ خود جسماً موجود نہیں ہوتے) افریقہ کی دوناتیت[2] (Donatism) آرمینیہ کی نسطوریت[3] (نسطور کا مسلک جو ۴۲۸ء میں قسطنطنیہ کا بطریق تھا) اور مصر و شام کی یوتیشیانیت (قسطنطنیہ کے پانچویں صدی کے بطریق یوتیشے کا مسلک کہ تجسیم کے بعد مسیح کی انسانی خصوصیات اس کی ربانی خصوصیات میں مدغم ہو گئیں۔ اور اب مسیح کی فطرت صرف الوہی ہو گئی تھی)۔ قیصریت و پاپائیت کے اتحاد کے خلاف پُرزور قومی تحریکات تھیں۔ اس اتحاد نے تمام قوت، عزت، اقتدار اور طاقت جملہ بنی نوع انسان میں سے صرف قسطنطنیہ میں رہنے والے بادشاہ کو تفویض کر دی تھی اس بادشاہ کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اس نے اپنی تمام دُنیوی و مذہبی ہیبتناک قوت اپنی رعایا سے نہیں بلکہ آسمانی بادشاہ سے حاصل کی ہے۔

مگر راہبوں کے خروج اور قومی بغاوت کے باوجود قیصریت و پاپائیت کا اتحاد (جس کی رو سے دنیوی و مذہبی حاکمیت بادشاہ کے ہاتھوں میں آگئی تھی) سلطنت روما کے مشرقی (یونانی اور ایشیائی) علاقوں میں قائم ہو گیا تھا۔ سینٹ کرائیسوسٹم کی طرح کے بطریقوں نے اس اتحاد کے خلاف احتجاج کیا۔ انھوں نے کلیسا کی آزادی کو دوبارہ قائم کرنے کی کوشش کی مگر انھیں کچل دیا گیا۔ جو اپنے اسقفی عہدوں پر قائم رہنا چاہتے تھے انھیں یا تو مائلیویس کے اسقف آپٹیٹس کی طرح وفادارانہ رویہ اختیار کرنا پڑا جس کی رائے بادشاہ کے متعلق یہ تھی کہ "سوائے خدا کے اس سے کوئی ارفع و اعلیٰ نہیں"۔ یا انھیں آمبروسیاسٹر کی پیروی کرنی پڑی جس کا بادشاہ کے متعلق یہ قول تھا کہ "وہ خدا کا خلیفہ اور نمونہ ہے"۔

لیکن سلطنت کے مغربی (لاطینی اور یورپی) علاقوں میں معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ قسطنطین کی موت کے بعد اطالیہ، افریقہ، ہسپانیہ اور گال کے بڑے بڑے اسقفوں نے دنیوی بادشاہوں کی مذہبی حاکمیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ بادشاہ اکثر بدکردار اور ان کے مذہبی اعتقاد بودے ہوتے تھے۔ چوتھی صدی کے اختتام سے پہلے میلان کے سینٹ آمبروز نے شہنشاہ والن طینئن سوئم (جس نے اُسے ایک آریوسی کو اسقف مقرر کرنے کا حکم دیا تھا) کو کہا "مذہبی معاملات میں اسقف بادشاہوں کی جانچ پڑتال کرتے ہیں، بادشاہ اسقفوں کی نہیں"۔ ایک صدی بعد (۴۹۴ء میں) پاپائے اعظم گیلاسئس نے شہنشاہ اناس طیسس کو قسطنطنیہ میں ایک خط لکھا جس میں اس نے یورپی نظریہ نہایت غیر مبہم الفاظ میں بیان کیا کہ "اس دُنیا پر دو طاقتیں یا دو جلیل القدر شہنشاہ حکمراں ہیں —— یعنی پادریوں کی مقدس طاقت اور شاہی قوت — آسمانی رموز و اسرار کو سمجھنے کیلئے تمہیں بجائے مذہبی افراد پر حکمرانی کرنے کے ان کی اطاعت کرنی چاہیے"۔

یونانی اور لاطینی عیسائیت میں اختلاف کی جو ناقابلِ عبور خلیج حائل ہو گئی تھی اُس کی وجہ نظریات و رسومات کا کوئی خاص اختلاف نہ تھا بلکہ اس کا سبب یہی مسئلہ تھا کہ مذہبی معاملات میں کون سی فیصلہ کن اور قطعی طاقت ہے۔ بزنطینی قیصروں کے مردہ ہاتھوں تلے مشرق کے راسخ الاعتقاد کلیسا میں رجعت پسندانہ جمود پیدا ہو گیا تھا۔ مغرب میں پاپائے روم کی زیر سرکردگی کیتھولک کلیسا کی روحانی آزادی دوبارہ قائم ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی یورپ میں ایک ہزار سال تک آزاد و خود مختار کلیسا اور دُنیوی طاقت کے تعلق کا سوال اہم سیاسی بحثوں کا مرکزی نقطہ بنا رہا۔

اس اہم بحث کا آغاز ہپّو کے سینٹ آغسطین (۳۵۴-۴۳۰ء) کی تصنیفات سے ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آغسطین نے اس مسئلہ کو براہِ راست نہیں چھُوا تھا۔ اس کا مطمح نظر دوناتیوں کے سے معتزلیوں کو کچلنا

---

[1] اسکندریہ کے آریس (چوتھی صدی) کا مسلک۔ [2] چوتھی اور پانچویں صدی میں افریقہ میں عیسائیوں کا ایک ایسا فرقہ موجود تھا جو شہدا کی عزت و احترام معمولی کمی کا بھی روادار نہ تھا۔ مرتدوں سے بہت سخت سلوک کرتا اور کیتھولک عیسائیوں کو از سر نو بپتسمہ دیتا۔ اس فرقہ کے مسلک کو دوناتیت کہا جاتا ہے۔
[3] نسطور مسیح کی انسانیت و الوہیت دونوں کا قائل تھا لیکن وہ اس امر سے انکار کرتا تھا کہ یہ دونوں ایک خود آگاہ شخصیت میں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ اس کے نزدیک ان کا اجتماع محض اخلاقی تھا۔ گویا کہ اس نے مسیح کے دو وجود قرار دئے تھے۔ (مترجم)

پلاگیسیوں (جو چوتھی دیا پانچویں صدی کے راہب پلاگیئس کے پیرو۔ اس نے اس عقیدے سے انکار کیا تھا کہ گناہ آدم کی وجہ سے انسان کی سرشت میں بدی ہے) کی طرح کے بدعتیوں کو راہ راست پر لانا۔ اور وولوسیانس (Volusianus) کی قسم کے غیر اہل کتاب افراد کے خیالات کی تردید اور اُن کو قائل کرنا تھا۔ مگر آغسطین کو اس مسئلہ کا مسلسل سامنا کرنا پڑا۔ دونا تیوں کے خلاف اس نے جو رسالے لکھے ہیں اُن میں بالخصوص اور اپنی مشہور کتاب "مدینۃ اللہ" میں اُس نے اپنی روش کی مکمل وضاحت کی ہے۔ وہ شہنشاہ روما کو مانتا ہے۔ اس کی طاقت کو آسمانی سمجھتا ہے۔ سینٹ پال کے الفاظ میں رعایا پر شاہی احکام کی اطاعت لازمی قرار دیتا ہے۔ اور بادشاہ کی توجہ اس طرف منعطف کراتا ہے کہ وہ کلیسا کی حفاظت کرے، تشتّت و افتراق کو دُور کرے اور بدعات کو کُچل کر رکھدے۔ لیکن وہ ایک لمحہ کیلئے بھی یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے کہ بادشاہ مذہب کے مقدّس دائرہ میں کوئی اختیار رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک اعتقاد و اخلاق کے سوالات صرف کلیسائی مجالس کے مخصوص اسقف ہی حل کر سکتے ہیں۔ وہ پُرزور پیرایہ میں "مدینۃ اللہ" اور "مدینۃ الارض" کا فرق بیان کرتا ہے جسے قسطنطین کی تبدیلیٔ مذہب نے چھُپا دیا تھا۔ قیصر کی چیزیں ایک دفعہ پھر خدا کی چیزوں سے علیحدہ کر دی گئیں۔

اس سوال کا جواب آسان نہیں کہ سینٹ آغسطین کا "مدینۃ اللہ" اور "مدینۃ الارض" سے کیا مطلب ہے۔ اس کا سرگرم حامی شروع میں یا تو عیسائی ہوتا یا غیر اہل کتاب۔ آغسطین یہ ثابت کرتا ہے کہ

(۱) مغربی المانویوں (Visigoths) نے سنہ ۴۱۰ء میں روما کو جو تاخت و تاراج کیا اس کی ذمہ دار عیسائیت نہیں ہے۔

اور (۲) غیر کتابی مذھب نے اپنے عروج و اقتدار کے زمانہ میں روما کو شکست و ادبار سے نہیں بچایا۔

بعد ازاں وہ مرئی کلیسا اور اس کے سلسلۂ مراتب کو مدینۃ اللہ اور کلیسا سے باہر کی دُنیا کو مدینۃ الارض قرار دیتا ہے لیکن بالآخر وہ بالعموم معبدِ مقدس یا برگزیدگانِ حق کی مجلس ہی جس کا مکمل علم صرف خدا کو ہے مدینۃ الارض ہوتی ہے۔ اور اس کے متضاد مقام ناپاک یا راندۂ درگاہ کی مجلس مدینۃ الارض ہے۔ یہ راندۂ درگاہ دراصل فرشتہ تھا جو دُنیا کی پیدائش سے پہلے جنّت سے گر پڑا۔

اِن دو شہروں کی تعبیر خواہ کچھ بھی ہو یہ ایک امر نمایاں ہے کہ سینٹ آغسطین بھی دوسرے بہت سے عیسائی پاپایانِ اعظم کی طرح اس بات سے متأثر ہوا ہے اور اسے مجبوراً یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ سینیکا اور رواقیوں کی طرح اُسے بھی خیال اور حقیقت، خیر اور بد، کلیسا اور دُنیا، روحانی طاقت اور دنیوی طاقت، اور خدا اور مایا کے ابدی و ناقابلِ عبور تضاد و اختلاف کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

(ترجمہ)

پنڈت جواہر لال نہرو

چین جمہوریت کی تیاریوں میں

امریکہ کی مشہور مصنفہ میڈم ایڈگر اسنو نِم ویلز (Nym wales) اپنی کتاب China built for democracy کا ایک ایڈیشن ہندوستان کے لئے شائع کرنے والی ہیں۔ اس کتاب کیلئے پنڈت جواہر لال نہرو نے ذیل کا مقدمہ تحریر کیا ہے۔

۱۹۳۸ء کی گرمیوں کے آخر میں لندن میں ایک انگریز دوست کے یہاں اُن لوگوں سے میری ملاقات ہوئی جو اسی زمانہ میں چین سے وہاں پہنچے تھے۔ ان میں انگریز بھی تھے اور چینی بھی۔ انھوں نے مجھے اس امداد باہمی کی تحریک کا حال بتایا، جس کا مقصد ایک طرف چین میں ان اشیاء کی پیداوار تھا جو وہاں کمیاب تھیں۔ اور دوسری طرف وہاں کے بازاروں میں جاپانی چیزوں کی بھرمار کی روک تھام۔ تحریک خوب تھی لیکن وہ اس
۲۴ کے بچپن کا زمانہ تھا اور مشکل ہی سے یہ تصور میں آ سکتا تھا کہ ترقی کرتے کرتے وہ اتنی بڑھ جائے گی کہ چین کے حالات پر نمایاں اثر ڈال سکے مجھے اس سے دلچسپی تھی۔

ہندوستان آنے کے بعد، ہانگ کانگ اور چنکیانگ سے کتابچے اور اشتہارات میرے پاس آتے رہے جن سے مجھے چین کے صنعتی امداد باہمی کے اداروں کی روزافزوں ترقی کا حال معلوم ہوتا رہا۔ ان سے میری دلچسپی میں اضافہ ہوگیا، چین کے باعث نہیں، بلکہ ہندوستان میں گھریلو صنعتی تحریک کی خاطر۔ اگست ۱۹۳۹ء میں جب میں چین گیا۔ تو ان اداروں کے متعلق زیادہ واقفیت حاصل کرنے اور ممکن ہو تو بعض مراکز دیکھنے کی مجھے بیحد خواہش تھی۔ چنکیانگ میں میں نے کچھ زیادہ معلومات حاصل کیں۔ لیکن یورپ میں جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے مجھے اپنا دورہ مختصر کرنا پڑا۔ اور میں عجلت کے ساتھ وطن لوٹ آیا۔

کتابچوں اور اُن مضامین نے جو امریکہ کے رسائل میں شائع ہوئے مجھے اور زیادہ معلومات بہم پہنچائیں اور میری حیرت بڑھتی گئی۔ اپنی تقریروں اور اخبارات میں اپنے مضامین میں میں نے .... سے اُن اداروں کا حوالہ دیا۔ میرے پاس ایسے بہت سے خطوط آئے جن میں ضروری تفصیلات طلب کی گئی تھیں۔ میں نے یہ تجویز کیا کہ صنعتوں کے بعض ماہرین چین جا کر ضروری واقفیت حاصل کریں اور وہاں کے ماہرین کو ہندوستان آنے کی دعوت دی جائے۔ لیکن جنگ نے نئی مشکلات پیدا کر دیں۔ اور ہماری تمام توجہ ان کی طرف مرکوز ہو گئی میں جیل چلا گیا۔ ۱۹۴۱ء کی گرمیوں میں دہرہ دون جیل ایڈگر سنو کی کتاب ——— . . . . . . مجھ تک میں نے اسے انتہائی شوق سے پڑھا لیکن اس کے کسی حصہ نے مجھے طرف نہیں کھینچا، جتنا اُن ابواب نے جن میں صنعتی اداروں کا ذکر تھا۔

دو تین مہینہ یوں ہی گزر گئے۔ پھر ہانگ کانگ سے مادام سن یاٹ سن کا بھیجا ہوا ایک تحفہ مجھے ملا۔ میری قید میں ان کا اس طرح یاد کرنا میرے لئے کافی خوشی کا باعث ہوا لیکن پیکٹ کھول کر مجھے اور زیادہ مسرت ہوئی۔ اس میں نِم ویلز کی کتاب نکلی۔ میں نے سوچا کہ مجھے جس کتاب کی ضرورت تھی آخر وہ مل گئی۔ اس سے مجھے اس دلکش تجربہ کا سب حال معلوم ہو جائے گا جو کافی کامیاب رہا تھا اور جس سے مستقبل کی اُمیدیں وابستہ تھیں۔

دسمبر میں جب میں جیل سے باہر آیا تو کئی دوستوں سے اس کتاب کا ذکر کیا۔ ہر ایک نے چاہا کہ میں اس کو مستعار دیدوں۔ اس معاملہ میں زیادہ بخیل نہیں ہوں۔ لیکن اس قیمتی تحفہ کو جدا کرنے میں مجھے پس و پیش تھا۔ لیکن اصرار حد سے بڑھ گیا اور وہ ایک سے دوسرے کے پاس منتقل رہی۔ دو ماہ ہوئے کہ مجھے اس کی ایک اور جلد مل گئی، یہ اسی کتاب امریکن ایڈیشن تھا جو نِم ویلز نے بھیجا تھا۔ اس کو بھی دوسروں نے ...

سلہ ... کے امریکن ایڈیشن کا نام تھا۔

— ایشیا۔ ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۲ء

اور ابھی تک مجھے واپس نہیں ملا۔

یہ تو ظاہر ہے کہ ہندوستان میں اس کتاب کی خاص مانگ ہے وجہ یہ ہے کہ ہمیں بھی ویسے ہی مسائل کا سامنا کرنا ہے جیسے کہ چین کو، ان میں کا ایک مسئلہ بڑی صنعت اور چھوٹی صنعت کے تعلق کا ہے جس پر ہندوستان کئی برس سے غور کر رہا ہے، کیا ان میں کوئی پرانا جھگڑا ہے اور ایک کی بقا دوسرے کی فنا پر منحصر ہے؟ کہ ان دونوں کو کسی طرح ایک دوسرے سے منسلک نہیں کیا جا سکتا؟ مجھے خوشی ہے کہ یہ کتاب ہندوستان میں شائع ہو رہی ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ وہ بہتوں کی نظر سے گزریگی۔ چین کا تجربہ ہمارے لئے بے اندازہ قیمت رکھتا ہے اور میرا یقین ہے کہ ہم اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

مدتوں سے میرا خیال ہے کہ ہندوستان کو صنعتی بنانا ضروری ہے تاکہ ہماری پیداوار اور ملکی دولت تیز رفتاری سے بڑھ سکے اور ہماری زندگی کا معیار اونچا ہو۔ اس کے بغیر اور بڑی صنعتوں کی ترقی نہ ہونے پر ہم مفلسی کا مسئلہ حل نہیں کر سکتے۔ جو ملک صنعتی طور پر ترقی یافتہ نہ ہو وہ اقتصادی لحاظ سے آزاد نہیں ہو سکتا۔

اس کے باوجود دیہاتی صنعتوں کی ترقی اور پھیلاؤ کے لئے میں نے کافی کوشش کی ہے، کسی سیاسی نظریہ کے ماتحت نہیں بلکہ ان میں ملکی مفاد کا یقین رکھتے ہوئے، میرے کئی دوستوں۔ نے میری اس دو نظری کو پسند نہیں کیا، اور مجھ پر یہ الزام لگایا کہ میں ان میں سے یا تو اس پر ایمان نہیں رکھتا یا اس پر، اور اس کی کوشش کرتا ہوں کہ جہاں مصالحت ممکن نہیں وہاں صلح کرا دوں، لیکن وہ مجھے مطمئن نہیں کر سکے ہیں اور اب تک میرا نظریہ ہے کہ ہندوستان میں ہمیں بڑی صنعتوں اور دیہاتی صنعتوں کو آگے بڑھانا، اور دونوں کو منسلک کرنا چاہیئے۔ میں مانتا ہوں کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت ایسا آسانی سے نہیں کیا جا سکتا۔ اس نظام ہی کو کیوں نہ بدل ڈالیں۔ حقیقت میں اس جنگ اور اس کے بعد کے اثرات میں وہ خود مٹ جائیگا اور Planned Economy اس کی جگہ لے لیگی۔

دیہی صنعت پر زور دیکر گاندھی جی نے میرے خیال میں ہندوستان کی بڑی خدمت کی ہے۔ ان کے ایسا کرنے سے قبل ہم میں سے سب اس سوال پر ناہمواری سے غور ہی نہیں کر رہے تھے بلکہ ہندوستان کے مخصوص حالات کو بھی نظر انداز کئے دے رہے تھے۔ چین کی طرح ہندوستان میں بھی مردوں کی کافی آبادی ہے اور بہت زیادہ بیکاری۔ اس کا یورپ کے ممالک سے مقابلہ کرنا مناسب نہیں جو اپنی چھوٹی مگر بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ محنتی بن گئے ہیں۔ ہر ایسی اسکیم خراب ہے جو ہماری کام کی طاقت کو ضائع کرتی ہے یا لوگوں کو بیکاری کا شکار بناتی ہے۔ خالص اقتصادی نقطۂ نظر سے انسانی پہلو کا خیال کئے بغیر ہی کام کی طاقت کو (Labour Power.) جو مخصوص مشینری (مشینوں) کے مقابلہ میں زیادہ استعمال کرنا زیادہ فائدہ مند ہے۔ کم آمدنی پر زیادہ لوگوں کو معاش مہیا کرنا اس سے بہتر ہے کہ بیشتر تعداد کو بیکار کیا جائے اس کا بھی امکان ہے کہ گھریلو صنعتوں کی زیادتی سے کل دولت میں اضافہ ہو جائے۔ اس آمدنی کے مقابلہ میں جو چند کارخانوں سے اسی قسم کی چیزیں بنانے میں حاصل ہوتی ہے۔

ہم سب کو ایک مقصد کیلئے جد وجہد کرنا چاہئے کہ زیادہ سے زیادہ پیداوار ہو، مساویانہ تقسیم اور بیکاری بالکل غائب۔ ہندوستان کی کثیر آبادی میں اس کو محض بڑی صنعتوں یا صرف گھریلو صنعتوں کے فروغ سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اوّل الذکر بعض اشیاء کی پیداوار میں اضافہ کا باعث ہو سکے گی لیکن بیکاری اسی طرح باقی رہیگی اور مساویانہ تقسیم مشکل ہوگی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پیداوار ہماری قوتِ کار سے کم ہو کام کی طاقت کے ضائع ہونے کی وجہ سے گھریلو صنعتوں سے مساویانہ تقسیم آسان ہو جائیگی لیکن کل پیداوار کا پلڑا نیچا رہیگا اور اس طرح معیار اونچا نہ ہو سکیگا۔ البتّہ ہندوستان کی موجودہ حالت میں ان کے پھیلاؤ سے موجودہ معیار کسی قدر اونچا ہو سکتا ہے لیکن پھر بھی وہ نیچا ہی رہیگا۔ اس کے علاوہ بعض اور وجوہ بھی ہیں جو کسی ملک کے گھریلو پر منحصر ہو جانے کو ناممکن بنا دیتی ہیں۔ موجودہ دور میں کوئی قوم بعض ضروری اشیاء کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی جو صرف بڑے کارخانوں میں بنائی جا سکتی ہیں ان کا پیدا نہ کرنا غیر ممالک کی برآمد پر منحصر ہو جاتا ہے، اس کا مطلب ہے اقتصادی پھندے میں پھنس جانا اور غالباً سیاسی غلامی۔

اس لئے یہ لازمی ہو جاتا ہے کہ ہندوستان میں دونوں قسم کی صنعتیں ہوں، بڑی اور گھریلو اور اس طرح ان کا انتظام کیا جائے کہ آپس میں ان کا نبھاؤ ہو سکے، بڑی صنعتوں کو امکانی تیزی سے قائم کیا جائے اور فروغ دیا جائے، لیکن ان کے انتخاب میں کافی غور و فکر کر لینا چاہیئے اس کو ایسا ہونا چاہیئے کہ اس پر قوم کی اقتصادی بنیادیں مضبوط ہو سکیں جن پر دوسری صنعتیں کھڑی ہو سکیں۔ بجلی کی ترویج صنعتی فروغ کی پہلی ضرورت ہے مشین، جہاز، کیمیاوی اجزاء، انجن اور موٹر کا بنانا اس کے بعد کی ضرورتیں ہیں، اور ان کی طرح کی دوسری صنعتیں دولت پیدا کرتی اور کام مہیا کرتی ہیں، ان سے بیکاری وجود میں نہیں آتی۔ ہلکی صنعتیں بڑی اعتنا

نہیں، کیونکہ ابتدا میں ہمارا سرمایہ محدود ہے اور بھاری صنعتوں کیلئے اس کی ضرورت ہے، اس کے علاوہ گھریلو صنعتوں کی راہ میں ان کی رکاوٹ بیکاری پھیلا سکتی ہے۔

بدقسمتی سے اس ملک کی صنعتی ترقی ہلکی صنعتوں تک محدود رہی ہماری صنعت کی ترویج کے لئے جو چند کوششیں ہمارے صناعوں نے کیں اُن کو برطانوی حکومت نے بری طرح کچل دیا۔ آنے والی نئی دُنیا کا خیال کرتے ہوئے برطانوی صنّاع مابعد جنگ کے ہندوستان میں اپنے اقتصادی تفوّق کے قیام کی فکر میں اتنے مشغول ہیں کہ ہندوستان میں بنیادی صنعتوں کی ترویج کی اجازت دیکر جنگ جیتنے کا خیال ان کے دماغ میں سما نہیں سکتا۔

ہندوستان میں صنعت کی باقاعدہ ترویج اور بڑی، درمیانی اور گھریلو صنعتوں کا ارتباط بغیر قومی طریق کار کے حاصل نہیں ہو سکتا اور سیاسی و اقتصادی آزادی کے بغیر یہ موثر نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ حکومت کی کافی نگرانی کے بغیر اس کا امکان نہیں۔ بنیادی صنعتیں اور رسل و رسائل کے ذرائع یا تو حکومت کے قبضہ میں ہوں یا ان پر اس کا کلّی اختیار ہو، دوسری چیزوں پر کنٹرول کسی قدر کم ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ
۲۷ ضروری ہے کہ حکومت کی پشت پناہی میں جو گھریلو صنعت فروغ پا رہی ہو اُس سے جو بڑی صنعت مقابلہ میں آئے اُس پر حکومت کو کلّی اختیار ہونا چاہئے۔ اس سے آپس کے جھگڑے نہ ہوں گے اور نباہ آسان ہو جائے گا۔

بجلی کے استعمال نے صنعتی دُنیا کو کافی بدل ڈالا ہے، اور بڑی صنعتوں کو (De Centrating) کرنا ممکن ہو گیا ہے، یہ بات چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کے لئے بڑی مفید ہے۔

لیکن ان مسائل پر طبعی زمانہ میں ہی عمل ہو سکتا ہے۔ پھر بھی جنگ کے حالات نے چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کی قدر بڑھا دی ہے اور اس وقت چین کی مثال ہمارے لئے کافی اہمیت رکھتی ہے۔ ایسے حال میں اور حملہ آور سے مقابلہ کے لئے وہ بے حد موزوں ہے جس بات نے مجھے حیرت میں ڈال دیا ہے وہ ان امداد باہمی کے صنعتی اداروں کی غیر معمولی پیداوار ہے۔ اصل جمع شدہ سرمایہ سے ڈوگنی ان کی ماہانہ پیداوار کی قیمت ہے، ممکن ہے جنگ کے سبب ایسا ہو لیکن پھر بھی ہے تعجب خیز۔

ان اداروں کی جمہوری بنیاد، اور اس دنیا میں اس بنیاد پر ان کی ترویج، اپنے اندر دلچسپی کا سامان اور اہمیت رکھتی ہے، اسی بنیاد پر سیاسی جمہوریت زندہ رہ سکتی ہے۔ کسی دوسری بنیاد پر ایسا ہونے میں شک ہے۔

سرمایہ دارانہ صنعتی ترویج اب نہ ہندوستان میں ہو سکتی ہے نہ چین میں۔ اس کے باوجود ہمیں صنعتی لحاظ سے آگے بڑھنا ہے ورنہ ہماری زندگی ممکن نہیں۔ ہمیں خود ہی ایک راستہ نکالنا ہے اور اپنا توازن قائم رکھنا ہے۔ مستقبل، ممکن ہے ہمدردی اور دوسروں کی ایک متحدہ اشتراکیت باہمی کی طرف رہنمائی کرے، اور اگر دُنیا کو ان جنگوں اور انسانی کشت و خون کی موجودہ تلخیوں سے اُبھرنا ہے تو شاید اسی طرح کے کسی نظام پر اس کی از سرِ نو تنظیم ہو جائے۔!!

اختر الایمان

ادب اور ماحول

ہر ادب اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے، یہ سب جانتے ہیں اور سب کہتے ہیں، اور پھر سب ادب پر بے سر و پا نکتہ چینی شروع کر دیتے ہیں، ہم روزانہ ادب، زندگی، اور ماحول کے متعلق بحث و تمحیص دیکھتے ہیں اور نگاہیں پھیر لیتے ہیں، اور پھر اسی قسم کی تنقید و بحث یا نئی رایوں کا انتظار کرتے ہیں، گویا یہ ایک مسلسل کھیل ہے لامتناہی ایک تماشا ہے جو یوں ہی ہوتا رہا اور جسے یوں ہی ہوتا رہنا چاہیئے۔ نہ اس کی کوئی ابتدا ہو، نہ انتہا، رہے کہنے والے سوان کا یہ عالم ہے کہ جو کچھ کہتے ہیں دبی زبان سے، ان کی رائے ابہام، شک اور خوف سے خالی نہیں۔

سب سے زیادہ مجھے جس پر تعجب ہے وہ ادب برائے ادب، اور ادب برائے زندگی کی بحث ہے، خوب لے دے ہو رہی ہے، جواز تلاش کئے جاتے ہیں، مثالیں پیش کی جاتی ہیں، لڑنے والے لڑتے ہیں، ہنسنے والے ہنستے ہیں، اور پھر دونوں اپنی اپنی جگہ مطمئن ہو کر کسی کیفے یا بار میں وقت دور کرنے کیلئے چلے جاتے ہیں۔ یہ بات سب ہی مانتے ہیں، کہ ادب، زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کا عکس کش ضرور ہوتا ہے لیکن پھر بھی یہ بحث برابر جاری رہتی ہے، ادب برائے ادب کے ماننے والے آجتک اپنے اس مقولہ کی کوئی صحیح تعریف نہ کر سکے کہ اگر وہ صرف حسن و عشق کے معاملات کی روایاتی تعبیر ہی کو ادب مانتے ہیں تو یہ چیز بھی زندگی کے جزئیات میں سے ہے، جنسی بھوک کے کچھ عناصر دب جانے کے بعد محبت مختلف شکلیں اختیار کر لیتی ہے، لیکن اصل وہ اپنی جگہ قائم ہے، اسے کوئی بھی نہ بدل سکا۔

زندگی کے متعلق دنیا کی منضبط اور جاری آرائے انسانی ذہن پر چھا چکی ہیں۔ مارکسٹ نظریہ کے علاوہ کوئی رائے اور کوئی نظریہ نیا نہیں، ایسے بزرگ بھی موجود ہیں جو زندگی کا اصل اصول محض عیش و عشرت ہی کو سمجھتے ہیں، وہ گروہ بھی موجود ہے جو زندگی کو محض فریضہ سمجھتا ہے، اور فرض برائے فرض کا قائل ہے، ان کے علاوہ وہ گروہ بھی ہیں جن میں سے ایک زندگی کو دل اور ضمیر کی آواز کے تابع بھی سمجھتا ہے اور زندگی میں دلیل کو بڑی جگہ بھی دیتا ہے، دوسرا وہ جو اُسے شروع سے ایک تدریجی فعل سمجھ کر اُسے ایک مادی شکل دے دیتا ہے۔

اس آخری گروہ کیلئے انسان کی بقا کا مسئلہ ہی سب سے بڑی چیز ہے، غرضکہ اخلاق کا معیار اور انسانی قدریں آج سے بہت پہلے مقرر ہو چکی ہیں، اور ہمارا ادب ان ہی میں سے کسی نہ کسی کے تحت میں آجاتا ہے، ظاہر ہے کہ ان میں سے ایک نظریہ رکھنے والا دوسرے نظریہ کے ادب اور زندگی سے کبھی متفق نہ ہوگا۔

اکثریت کا خیال ہے کہ یہ دُنیا خردمندوں کی دُنیا ہے، لیکن تعجب یہ ہے کہ لوگ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایک دوسرے سے کبھی متفق نہیں ہو سکتے برسرپیکار ہیں، اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ ہم ماحول کو نظرانداز کر جاتے ہیں، میں اکثر افراد سے ملا ہوں جن کا نظریہ ادب برائے

27 ادب ہے، گفتگو کے دوران میں مغربی ادیبوں میں انھوں نے قدیم و جدید سب ہی کو سراہا، جب ہومر کا تذکرہ آتا ہے، مسکرا مسکرا کر باتیں کرتے ہیں اور ہومر کی خوبیوں میں محو ہو جاتے ہیں، اس کے بعد سیفو کو اور ساتھ ہی وہ پنڈار کو بھی سراہتے ہیں، حالانکہ پنڈار، سیفو اور ہومر دونوں سے مختلف ہے، اس کا موضوع وہی ہے جو اس زمانہ کے شعراء کا خصوصاً کسانوں اور غریبوں سے متعلق، لیکن اگر کوئی آجکل اس معیار کی شاعری خلق کرنے لگے تو لوگ اُسے پسند نہیں کریں گے۔ مغربی ہو یا مشرقی، پُرانی شاعری کے لئے اب ماحول سازگار نہیں کس قدر دلچسپ بات ہے کہ ایک طرف وہ شاعری کو ماحول سے بالکل الگ قرار دیتے ہیں، اور دوسری طرف کہتے ہیں کہ اب ماحول ایسی نظموں کی اجازت نہیں دیتا۔ خود ہی وہ ایک چیز کی تائید کرتے ہیں اور خود ہی تردید۔

اس کے بعد ان کی نظر جاتی ہے بائرن، کیٹس اور شیلے پر، اسی زمرہ میں وہ ورڈز ورتھ اور کالیرج کو بھی شامل کر لیتے ہیں، کالیرج کی نظموں پر سر دھنتے ہیں، ورڈز ورتھ کو ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں، حالانکہ کالیرج اور ورڈز ورتھ، کیٹس اور شیلے سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتے، ہر شخص ان میں سے ایک خاص زاویہ سے سوچنے کا عادی ہے اور ایک خاص لہجہ میں لکھنے کا، پھر بھی یہ سب کو سراہتے ہیں، سب میں فنی خوبیاں

دیکھتے ہیں، اور اپنی زبان میں اس قسم کا ادب پیدا کرنے کے قائل ہیں۔ اس تضاد اور بے تکے طرز عمل کو دیکھ کر سوائے اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ ان معترضین کے خیالات اپنے نہیں، دماغ اپنا نہیں، اور اعتراضات، بس ایک مشغلہ ہے، ایک ضد اور اس کے سوا کچھ نہیں، انھیں ملٹن جیسے مذہبی آدمی بھی پسند ہیں، ٹینی سن بھی، یہ بھی، اور وہ بھی، انھیں ساری دنیا پسند ہے، لیکن اگر کوئی پسند نہیں تو موجودہ "ادب برائے زندگی" کا نظریہ رکھنے والے، حالانکہ نئے ادب والوں کو افادیت کا ایک مفہوم حاصل ہے اور ان میں سے کوئی ماحول کے افادی تقاضوں کے خلاف نہیں۔

ادب ماحول کا پرتو اور زندگی کی ایک گہری تنقید ہے، یہ پرتو اور تنقید زندگی پر غیر محسوس افادی شان سے منعکس ہوتی ہے، ورنہ ادب کی اور کیا قیمت ہے، مانا کہ لطیف جذبات کی عکس کشی بھی ضروری ہے، پیر یکلین کا ریتھ ضربن سکتا ہے لیکن آخری دن کے لئے۔ کیا حسین مجسموں کو ہمیشہ دیکھا جا سکتا ہے، کیا ان سے ہمیشہ دل بہلایا جا سکتا ہے، اور اگر بہلایا بھی جا سکتا ہے تو یہ دل بہلاوہ اس طبقہ تک محدود ہے جو Holmes [illegible] کا قائل ہے، جن کا مقولہ زندگی میں محض عیش و عشرت کی تلاش ہے اور بس، اس کے بعد بھی کچھ طبقات ہیں اور ان طبقوں کی زندگی، ادب اک ہمہ گیری اور ابدیت ہے تو اسے کامل زندگی یعنی انسانی سماج اور ممکن طور پر قدرت کے گہرے اسرار حقائق کا نقاش اور آئینہ دار ہونا چاہئے۔ ہر نسل کو ادب محض اس لئے سونپا جاتا ہے کہ وہ اُس میں کچھ اضافہ کر سکے، لیکن اگر ہر شخص میر اور غالب ہی بننے کی کوشش کرے (حالانکہ یہ بھی ممکن نہ ہو سکا) تو ادب میں کیا اضافہ ہوگا اور پھر یہ بھی مشکل ہے، ہر شخص ان کی تقلید میں فانی نہیں ہو سکتا ان مجسموں کی تشکیل کا تبدیل کرنا بھی تو ضروری ہے، ہم اپنی شاعری کا نیا دور حالی اور آزاد سے شروع کرتے ہیں، لیکن یہ دو۔ ں حسن و عشق سے نہیں کھیلتے، ان میں سے ایک کے دماغ پر بھی عورت سوار نہیں، یعنی ان بزرگوں کی "محنت" کو شاعری سے ماورا، ایک دوسری شے سمجھنا پڑے گا۔ کیا دلچسپ بات ہے کہ "ادب برائے ادب" کے حامی، آزاد اور حالی کو سراہتے ہیں!؟

مغربی تعلیم کی بدولت ہماری زندگی میں چند چیزوں کا اضافہ ہوا جہاں معاشی اور سیاسی نظریئے بدلے وہاں جنسی نظریات میں بھی تغیر ہوا یہ تغیر برابر جاری ہے، اسی لئے جو شے آجکل سب سے زیادہ سطح اور عمق دونوں جگہ کارفرما نظر آ رہی ہے، وہ جنسی تعلیم اور مغربی ادب کے تاثرات ہیں، مخلوط طریقہ تعلیم ہندوستان میں نیا ہے اور مغربی ادب بھی، مغربی ادب کی ایک سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ زندگی کے ساتھ ایک زاویہ قائمہ بناتا ہے، کوئی چیز "۔۔۔۔ جو زندگی سے متعلق ہے وہ ادب سے بچ کر نہیں رہتی، جوں کی توں ادب میں موجود ہے، ہمارے نئے ادیب اس نئی نوعیت سے متاثر ہیں، جنسی بھوک، ہم میں ہمیشہ سے موجود تھی، اور ہمیشہ موجود رہیگی، لیکن اب موجودہ دور میں بیرونی تاثرات نے اس بھوک کو بیدار کر دیا ہے، جس قدر نوجوان اور نو تعمیر ماحول کے نئے تاثرات ہیں وہ براہ راست ادب پر پرتو فگن ہیں؛ اب انھیں کوئی روک نہیں سکتا۔ وہ لوگ بڑی غلطی کرتے ہیں جو انھیں روکنے کی کوشش کرتے ہیں، ہونا یہ چاہئے کہ یا تو ان ضرورتوں کو پورا کیا جائے یا پھر طریقۂ زندگی بدلا جائے طوفان کہیں کچی دیواروں سے بھی رُکا ہے۔

اگرچہ شاعری میں ابھی زیادہ عریانی نہیں آئی، لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ افسانہ نگاری میں دن بدن عریانی بڑھتی چلی جا رہی ہے، ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے افسانے محض فیشن کے طور پر لکھ رہے ہوں، لیکن جو لوگ محض فیشن کے طور پر لکھ سکتے ہیں اُن کی دنیائے ادب میں کوئی جگہ نہیں لیکن وہ لوگ جو اس میدان میں کامیاب سمجھے جاتے ہیں، ان کی دلی آواز ہے اُسے بُرائی پر محمول کرنا زیادتی ہے جدید شعور نے اخلاق کی قدروں کو تبدیل کر دیا ہے اور اب سماج و ماحول ایک نئی تبدیلی چاہتے ہیں، اب فرد وہ چیز چاہتا ہے جس کی اُسے ضرورت ہے، موجودہ نظام نے انسان کو ایک حد تک بے باک کر دیا ہے، فرد کے دل سے خوف تقریباً نکل چکا ہے، زندگی اپنے حقوق علی الاعلان مانگ رہی ہے، اسے لکھنے والوں کی زیادتی اور ماحول و نظام کی خرابی سمجھنا جان بوجھ کر واقعات سے آنکھیں بند کر لینا ہے، میں نے اکثر لوگوں کو کہتے سُنا ہے کہ صاحب جو کچھ نئے افسانہ نگار لکھ رہے ہیں وہ ہے تو درست لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ اُسے منظر عام پر بھی لایا جائے، اور بہو بیٹیوں کو ان باتوں سے روشناس کرایا جائے جن سے اب تک وہ واقف نہیں ہیں، ان کا جواب یہ ہے کہ جو کچھ نئے ادب میں پیش کیا جا رہا ہے وہ ماحول کے ان گوشوں کا پرتو ہے جن پر سے کبھی حجابات نہیں اُٹھے تھے، اگر اس کو غلاظت سے تعبیر کیا جائے تو یہ غلاظت کوئی نئے ادب کی پیداوار نہیں ہے، سماج کا اپنا پُرانا ملغوبہ ہے، موجودہ ادب صرف اتنا کرتا ہے کہ جو غلاظت اب تک نظروں سے اوجھل تھی اس کی طرف اشارہ کرتا ہے اور دوسروں کو ترغیب دیتا ہے کہ اس کو صاف کرو، اب لوگ اُسے صاف کرنے کے بجائے شہرت دیتے پھریں تو یہ ان کا فعل ہے، اور وہ اپنے فعل کے مختار ہیں!؟

نئی تعلیم، نئے ادب، اور نئے طور طریق نے ہمارے لئے نیا ماحول

تیار کیا ہے، ہم اور ہمارے ادیب وہی پیش کر رہے ہیں جو اس ماحول سے تعلق رکھتا ہے، آج سے پہلے کبھی کسی نے اس موضوع پر قلم نہیں اٹھایا تھا ان احساسات اور جذبات کو نہیں چھوا تھا، ان رجحانات کی نمائندگی نہیں کی تھی، اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ پرانے لوگ ان سے واقف تھے اور وہ جان بوجھ کر ان سے کنارہ کرتے تھے بلکہ یہ کہ وہ ان سے اچھی طرح واقف تھے اور ان کی اہمیت سمجھتے تھے، آج سے پہلے ہندوستان کو اپنی غلامی کا اتنا احساس نہ تھا جتنا اب ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ آج سے پہلے اس شے کے ذائقہ سے واقف نہ تھا، اسے آزادی کے لطف اور غلامی کی تکلیف کا تقابل کرنا نہیں آیا تھا۔ اور نہ اس کے سامنے اس کی کوئی مثال تھی؛

میں یہاں کوئی سیاسی بحث نہیں چھیڑنا چاہتا، مگر ہاں جنسی تعلیم کا مسئلہ میرے خیال میں اپنی جگہ نہایت اہم ہے، ہماری سوسائٹی اس مسئلہ سے کتنی ہی بیگانہ و غافل رہی ہو لیکن موجودہ ماحول میں جنسی تعلیم کی زندگی کے لئے اتنی ضروری ہے جتنی اخلاقی تعلیم کی، اس جذبہ کا منبع اک نیا بنتا ہوا سماج ہے اور ماخذ بیرونی ادبیات جنھوں نے ہمارے ذہنوں کی ساخت و پرداخت اور رہبری میں کافی امداد کی ہے؛

ہندوستانی ادیب مغربی خیالات میں جن چیزوں سے سب سے زیادہ متاثر ہوا ہے وہ موجودہ روسی نظریہ ہے، ہمارے اکثر افسانہ نگاروں کا طرز تحریر ٹالسٹائے، چیخوف یا تورگنیف کا سا نہیں، گورکی کا سا ہے، گورکی پہلا روسی مصنف ہے جس کے طرز تحریر میں بے باکی ہے، اسلوب بیان سیدھا سادھا ہونے کے علاوہ لوگ ڈی۔ ایچ۔ لارنس اور موپاساں سے بھی بہت کچھ متاثر ہیں، خاصکر ملک میں "مخلوط تعلیم" کے بعد عورتوں کی بالکل دوسری فضا پیدا ہو گئی ہے، ایک پوری قوم نے جس نے زندگی میں دوش بدوش زندگی نہیں گزاری تھی، وقت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر ایک نئی زندگی کی طرف قدم اٹھایا، مگر جھجک کے ساتھ، مخلوط تعلیم کا مقصد یہ تھا کہ مرد اور عورت بے تکلف کلچرل تعلیم و تہذیب کے فریضہ کی ادائیگی کے لئے ایک مرکز پر مجتمع ہوں، علاوہ جنسی احساسات کے وہ اجتماعی احساسات اور سیاسی ضروریات کو محسوس کر سکیں، ایک دوسرے کی نفسیات سے واقف ہو جائیں، لیکن اس کے برخلاف تجربہ ناقص طور پر کیا گیا یعنی لڑکیوں کو جدا جدا حلقوں میں رکھا گیا، ان پر شدید پابندیاں عائد کی گئیں، اور کسی نوعیت سے اتنی آزادی نہیں دی گئی جو انھیں مسکن کر کے جنسیات سے بلند کر دیتی، مخلوط تعلیم اک مخلوط زندگی کے استحکام اور تکمیل کے بعد کی چیز ہے، جن قوموں میں پردہ ہے اور زندگی پردہ کے پیچھے اُن کی عورتوں کو یا تو مخلوط تعلیم اختیار نہیں کرنی چاہئے یا پھر اس نسل میں پیدا ہونے والے تمام نتائج کو برداشت کرنا چاہئے اگر سماج ایسے نئے اخلاقی مفروضات فرض کرے جو ظاہر ہے کہ قدیم سوسائٹی کے اخلاقی نظریوں سے بالکل مختلف ہوں گے لیکن نئی زندگی کا ساتھ دے سکیں گے تو سماج امن و راحت سے ہمکنار ہو سکتا ہے؛

انھیں اخلاقی نظریوں میں سے ایک "جنسی تعلیم" کا مسئلہ بھی ہے لڑکیوں کا تو ذکر ہی کیا، میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستانی صاحبزادے بھی حیات کے ان "اسرار و رموز" سے اتنے ہی ناواقف ہیں جتنی کہ اس معصوم یا بالفاظ دیگر جاہل ملک کی لڑکیاں؛

اسی بنیادی نظریہ کی بنا پر ہمارے بعض نئے لکھنے والے، جنسی حقائق کے رخ سے پردہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں، دو تین سال کے اندر اندر جنسی مسائل کی بنیاد پر چند افسانے لکھے گئے، یہ ایک ناقص کوشش تھی، ان افسانوں میں تلذذ کا عنصر نمایاں ہے، نتیجہ خیزی کا جذبہ موجود نہیں، لیکن بہرحال ان ناقص کوششوں کے پس منظر میں نئے ارادے جھلکتے ہیں، میری رائے میں ان حضرات کو زیادہ غور و فکر کے بعد بجائے ایک وقتی نشاط و تلذذ کے نتیجہ خیزی کے عنصر کو ادب میں فروغ دینا چاہئے ۔

یہ خام سماج جس کا کوئی حصہ مکمل اور پختہ نہیں ہے، ہر گوشہ میں ہر شخص سے اس کے حصہ کے مطابق تعمیری سامانوں کے لئے ندا دے رہا ہے، اس ندا کو سننا اور سامان فراہم کرنا ہی تعمیری فریضہ کی تکمیل کرنا ہے، اور اس کے لئے سب سے زیادہ اس عہد کے ادیب ذمہ دار ہیں؛

ماہرین تعلیم اگر ایک طرف عقلمندی کا ثبوت دینا چاہتے تھے تو دوسری طرف انھوں نے انتہائی بیوقوفی کا ثبوت بھی دیا، مخلوط تعلیم کو ضروری سمجھا گیا اور اس کی ابتدا کر دی گئی، لیکن اس کے ابتدائی اثرات سے گھبرا کر انھوں نے چند پابندیاں عائد کرنی چاہیں جنھوں نے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کو غلط راستوں پر ڈال دیا اور جس کے نتائج بڑھنے لگے، انھیں حادثات اور تعلقات کا اثر ہمارے ادب پر بھی پڑا، اب یہ اثر اتنا گہرا ہو چلا ہے کہ اگر ان چیزوں اور طریقوں کا رخ نہ بدلا گیا تو وہ دن دور نہیں جب موجودہ نسل سرکشی اور بغاوت پر آمادہ ہو جائے گی، اور یہ سارا ڈھونگ جو موجودہ دور کے نیتاؤں نے رچایا ہے خاک میں مل کر رہ جائے گا؛

جہاں تک شاعری کا تعلق ہے اب موجودہ دور کے شعراء کو یقین

ہو چلا ہے کہ صنفِ شعر کوئی محدود چیز سے وابستہ نہیں بلکہ ہر وہ چیز جس کا زندگی سے تعلق ہے موضوعِ شعر بن سکتی ہے۔ اب شعراء کسانوں پر بھی نظم لکھتے ہیں اور کھیتوں پر بھی، جنسی احساسات پر بھی قلم اُٹھاتے ہیں، جنسی خرابیوں پر بھی۔ جتنا انھیں ایک معشوق کے حنائی رخسار، سیاہ پُتلیاں، عرق آلود جبیں پسند ہے، اتنے ہی انھیں جنگلوں میں شبنم آلود شاخیں، قوسِ قزح کی رنگینی اور شفق کے اُتار چڑھاؤ پسند ہیں، اب ان کی شاعری کا میدان محدود نہیں رہا، ان کے لئے ساری دُنیا موضوعِ شعر بن سکتی ہے، زندگی ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور اسی لئے شعر بھی ساری دُنیا کا احاطہ کرتا جا رہا ہے اور اسے کرنا چاہئے۔

وہ لوگ جو زندگی اور ادب سے واقف ہونے پر بھی ادب برائے ادب کے قائل ہیں غالباً ان کا خیال یہ ہے کہ لایعنی باتوں کو نظم کیا جائے۔ ایسی باتیں کی جائیں جو لطیف احساسات کو اس طرح ابھاریں کہ خود احساسات کو نہ معلوم ہو سکے کہ کیوں اُبھر رہے ہیں، ایسی باتیں کی جائیں جن پر خواہ مخواہ سر دُھنتے رہیں، اور یا پھر باؤلوں کی طرح ہنستے رہیں، ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کچھ ایسی لغو ترکیبیں ہیں کہ جن پر بحث کرنے والوں کو قانوناً سزا دینی چاہئے، یا پھر ان لوگوں کو جو ادب برائے ادب

۳۰ کے نظریہ پر مصر ہیں اُنھیں چاہئے کہ کچھ حدود قائم کریں کہ یہاں سے ادب برائے ادب شروع ہونا چاہئے، اور اس کی واضح تشریح کریں۔ اپنے مفہوم کو خبط کرنے کے بجائے انھیں چاہئے کہ واضح طور پر مفہوم کو بیان کریں اس نظریّہ کے ماننے والے اتنے دلچسپ ہیں کہ ایک طرف تو وہ اپنے اس نظریّہ کی توضیح نہیں کرتے، دوسری طرف جو کچھ وہ پیش کرتے ہیں اس میں وہی ترکیبیں وہی تشبیہیں، وہی استعارے اور وہی بندشیں استعمال کرتے ہیں جو موجودہ ضرورتِ زندگی کی وجہ سے وجود میں آئی ہیں، بالفاظِ دیگر وہ بھی اسی خیال کے قائل ہیں جو آجکل محفوظ و وسیع ہو رہا ہے، لیکن چونکہ وہ اس سے انکار کر چکے ہیں، اب اسے کسی نہ کسی طرح نبھا رہے ہیں۔

کسی نقّاد کا فرض یہ نہیں کہ وہ اصنافِ سخن کی تقسیم کرے، بلکہ یہ کہ جو کچھ کہا گیا ہے اُسے جانچے، دیکھے کہ کہنے والا جو کچھ کہنا چاہتا تھا اس میں کہاں تک کامیاب ہے، ادب خوبصورت جلدیں بندھوا کر الماریوں میں رکھنے کے لئے نہیں ہوتا، بلکہ براہِ راست زندگی سے متعلق ایک حقیقت ہے جو زندگی سے اثر لیتا بھی ہے اور زندگی پر اثر انداز بھی ہوتا ہے۔

آج ہم رُوسو اور والٹیئر کی تحریروں کو اس نظریہ سے نہیں دیکھتے کہ الماری میں رکھی ہوئی ان کی جلدیں کتنی حسین معلوم ہوتی ہیں، بلکہ اس نے پچھلے دور میں لوگوں کی ذہنیت پر کتنا اثر ڈالا ہے، انقلابِ فرانس اس کی بیّن دلیل ہے، وہ انقلاب جسے انقلابِ فرانس سے تعبیر کیا جاتا ہے بڑی حد تک رُوسو اور والٹیئر کی تحریروں کا مرہونِ منت تھا۔

جس چیز سے لوگ چڑتے ہیں وہ غالباً پروپیگنڈا ہے۔ بیشک ادب کو پروپیگنڈے کے رنگ میں پیش نہیں کرنا چاہئے، بیشک اسے دیوار پر چسپاں کرنے والا اشتہار نہیں بنانا چاہئے، لیکن مفہوم کے اعتبار سے وہ ہوگا ہر حال میں پروپیگنڈا ہی، جس طرح دُنیا میں اور دُنیاوی قسم کی چیزوں کی قسمیں ہیں، اسی طرح ادب کی بھی اقسام ہو سکتی ہیں، لیکن ان اقسام کو جدا جدا حدمیں قائم کرنا تنقید نگار کے ذمہ نہیں، تنقید نگار انھیں ایک خاص عینک سے دیکھ کر اس کی کامیابی یا ناکامی کا اعلان کر سکتا ہے۔

فرض کیجئے ایک شخص شیشم کے درخت کی توصیف میں یا اس کے حُسن پر کچھ لکھتا ہے، اب نقاد کا فرض یہ نہیں کہ وہ لکھنے پر لے دے کرے، کہ اس نے اس درخت جیسی چیز پر کیوں قلم اُٹھایا جس کی اس کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں، یہ رویّہ غلط ہے، بلکہ ادب اور تنقید کے میدان میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ نقّاد کا فرض صرف اتنا ہے کہ وہ دیکھے جو کچھ شیشم کے درخت کے بارے میں کہا گیا ہے وہ کہاں تک حقیقت کی کسوٹی پر صحیح اُترتا ہے۔ اس کا کام یہ نہیں کہ لکھنے کے لئے درخت مخصوص کرے اور ان کا انتخاب کرے، بلکہ صرف لکھی ہوئی چیز کو جانچنا ہے، اگر لکھنے والا اپنے بیان میں ہر لحاظ سے کامیاب ہے اُسے اُس پر انگلی اٹھانے کا کوئی حق نہیں اور اگر کامیاب نہیں تو وہ اشارہ کر سکتا ہے کہ لکھنے والا فلاں جگہ ٹھوکر کھا گیا ہے۔

جن چیزوں کی بقا کی دُنیا کو ضرورت نہیں ہوتی چاہے اُنھیں فنا کیا جائے یا نہ کیا جائے وہ خود بخود فنا ہو جاتی ہیں اور جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ اسی طرح اس وقت تک برقرار رہتی ہیں جب تک ان کی ضرورت رہتی ہے۔ اگر ہم دورِ جدید کے مادّی نظریّہ پر یقین رکھیں اور تنازع للبقا کے مسئلہ کو مانیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ بہت سے جانور جن کے وجود کا ثبوت سائنسی دُنیا دیتی ہے، اب ہماری دُنیا میں موجود نہیں، عجیب الخلقت جانور، جسیم اور بے ڈھنگے جانور! میرا مقصد یہ ہے کہ فطرت ایک عظیم آرٹسٹ اور فنکار ہے، جس قدر بے ڈھنگے جانور ہو سکتے تھے انھیں ختم کر دیا گیا، فطرت کے تقاضہ سے خود بخود ختم ہو گئے۔ میں اپنے اس خیال کو کلیّہ قرار دینا نہیں چاہتا، ہاں اتنا ضرور ہے فطرت کے زیرِ تحت اکثر چیزیں خواہ چرند ہوں یا پرند جو فطری زندگی بسر کرتے ہیں اُن میں اکثر حسین ہیں، گو جانور اپنے افعال کے لحاظ سے بھیانک اور خوفناک ہو سکتے ہیں، لیکن ان کے حُسن میں کلام نہیں۔

اسی طرح ہماری دُنیا سے پہلے بھی دُنیا آباد تھی، اور ہم سے پہلے گزرنے والے انسانوں نے بھی اپنے آرام کے لئے کچھ چیزیں ایجاد کی تھیں، ان میں بہت سی ایسی ہیں جن سے ہم واقف نہیں، اور اکثر ایسی ہیں، جو آجتک ہمارے استعمال میں آرہی ہیں، ہوسکتا ہے کوئی کہے کہ جو چیزیں اب مستعمل نہیں وہ ایسی ہیں جو انسان کے قبضۂ قدرت سے باہر نکل گئی تھیں اور کچھ حادثات نے انھیں انسانوں کی نظر سے چھپایا جس سے رفتہ رفتہ وہ بے بہرہ اور ناواقف ہو گئے۔ یہ ایک حدتک درست ہو سکتا ہے اور وہ بھی اس حدتک کہ کچھ نظری حادثات نے انھیں انسان کی نظر سے چھپا دیا، لیکن ایسا کیوں ہے، انسان انھیں رفتہ رفتہ بھول گیا اور پھر کبھی استعمال میں نہ لاسکا، وجہ صاف اور بیّن ہے، حادثات سے بچے ہوئے انسانوں نے محض انھیں چیزوں کو استعمال کیا جو وقت کی ضرورت کے تحت میں آتی تھیں، اور باقی چیزوں کو محض فضولیات سمجھ کر انھیں فراموش کردیا۔

کسی قوم کے مہذب ہونے کے معنی آجتک اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان نے فضولیات میں کافی ترقی کرلی ہو، جہاں تک انسان کی ابتدائی اور بنیادی ضرورتوں کا تعلق ہے وہ ہر طرح پوری ہوتی رہی ہیں، آج سے ایک ہزار برس پہلے کے لوگ بھی اسی طرح زندہ تھے

، لیکن وہ اتنے مہذب نہ تھے جتنے ہم ہیں، یعنی وہ ہماری طرح فضولیات میں نہیں پڑے تھے۔ ہماری تہذیب ہی تو ہے کہ ہم بیجا تکلفات میں اُلجھے ہوئے ہیں، اور انھیں روز بروز بڑھاتے چلے جارہے ہیں، حاصل کلام یہ ہے کہ جن چیزوں کی وقت اور دُنیا کو ضرورت نہیں ہوتی وہ خود بخود فنا ہوجاتی ہیں۔

اُن خطوط اور طریقۂ تحریر ہی کو لیجئے جو کبھی کبھی مصر کی پُرانی عمارتوں چٹانوں اور پُرانے پتھروں پر نظر آجاتی ہیں۔ آج ہیروگلیفی طرز تحریر کی کسے ضرورت ہے اور اس کے علاوہ وہ ذراسی بات کو تصویروں میں نمایاں کرنے اور تصویروں کے ذریعہ بات کرنے کا طریقہ بھی اب ہماری دُنیا میں رائج نہیں۔ وجہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ اب ہمارے پاس اس سے سہل طریقۂ تحریر اظہار مطالب کے لئے آگیا ہے، یا پھر یوں کہئے کہ اب ہمیں ان طریقوں کی ضرورت نہیں رہی، ان تمام چیزوں کو ہم نے جان بوجھ کر نہیں چھوڑا بلکہ زمانے اور وقت نے ہم سے چھڑا دیا اور ہم مجبور ہو گئے کہ اسے خیرباد کہدیں، اور یہی چیز اور مقولہ ہماری اس دنیا میں درست ثابت ہوسکتا ہے اور ہمارے موجودہ رجحانات پر صادق آسکتا ہے موہن جوداڑو کے کھنڈر اور ایلورا اجنتا کے غار ہمارے لئے اب اس سے زیادہ اور کوئی اہمیت نہیں رکھتے کہ وہ ہماری پارینہ داستان کا ایک ورق ہے، اور یہی چیز ادب اور آرٹ سب کے لئے درست ہے، گزشتہ دور کا تمام ادب، تمام فن اور تمام صنّاع اس سے زیادہ ہمیں کیا بتاتے ہیں کہ اس دور کے انسانوں کا مذاقِ زندگی یہ تھا۔

غرضیکہ ہستی کا پورا تنائج ہمیشہ اور ہر وقت اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے، اور اسی کے مطابق وجود میں آتا ہے، ہم نے اکثر بادشاہوں کے بارے میں سُنا ہے کہ وہ اپنے ماحول کی پیداوار نہ تھے یا یہ کہ وہ اپنے وقت سے بہت پہلے پیدا ہو گئے تھے، اور اس واسطے زمانہ نے ان کی قدر نہ کی، نہ صرف بادشاہوں بلکہ شعراء کے بارے میں بھی یہ سُننے میں آیا ہے، غالب اور نظیر دونوں اپنے وقت سے پہلے پیدا ہوئے اور اس واسطے ان کے دور کے لوگوں نے ان کی کوئی اہمیت نہ سمجھی، اور جس طرح ان کے ساتھ برتا ؤ کرنا چاہئے تھا اس طرح نہیں کیا۔

میتھیو آرنلڈ کے خیال کے مطابق ادب "تنقید حیات" ہے وہ ادب جو محض چند احساسات لطیفہ کو ابھار سکے اور اس کے علاوہ اس کا کوئی مصرف نہ ہو، ماحول کی پیداوار نہیں ہوسکتا، اور پھر اگر ایک شخص اس قسم کا ادب پیش کرے تو برداشت کیا جاسکتا ہے لیکن اگر ہر شخص ایسی بے معنی باتیں کرنے لگے تو اسے کہاں تک برداشت کیا جاسکتا ہے۔

دورِ جدید کے ادب سے ہماری مراد وہ ادب نہیں جو تفریحاً لکھا جارہا ہے یا ایسا ادب جس کا تخریبی پہلو ہے لیکن بے معنی۔ اس میں شک نہیں کہ ہر وہ ادب جو کسی نئی دنیا کا پیغام لیکر آئے ایک حد تک یا ابتدا میں تخریبی ہوتا ہے لیکن اپنے مقاصد کے لحاظ سے ہمیشہ تعمیری ہوتا ہے، کچھ لوگ یا موجودہ ادب کے نمائندے محض تقلید میں ایسی چیزیں پیش کرتے ہیں جن میں عریانی ہوتی ہے لیکن بے معنی عریانی جیسا کہ میں نے شروع میں کہا نئے ادب میں محض اس لئے آئی کہ ہم نے اپنے لکھنے والوں کے احساسات کو بیدار ضرور کیا لیکن انھیں خاطر خواہ طریقہ پر تسلّی نہ دے سکے، ہم نے انسانی احساسات کو جگایا ضرور لیکن اس بات کا احساس نہیں کیا کہ اس کے نتائج کیا ہونے والے ہیں، اور یہی وجہ ہے اب ہم ایسی چیزیں اپنے ادب میں دیکھ رہے ہیں جن کی ہمیں کبھی توقع نہ تھی۔

ادب کے لئے کوئی عنوان مقرر کرنا اور ادیب سے توقع رکھنا کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور موضوع کی طرف جا ہی نہیں سکتا صریحاً زیادتی ہے

شاعر اور ادیب دونوں کی نظر میں پوری کائنات ہے اور اس کائنات میں انہیں پوری آزادی حاصل ہے کہ موضوع سخن کیلئے وہ چاہے جو شعبہ چھانٹ لیں لیکن اتنے پر بھی یہ دونوں شخصیتیں عوام سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکتیں، شاعر اور ادیب دونوں عوام کی ملکیت ہوتی ہیں، اگر کلیتاً نہیں تو ایک حد تک ضرور، اس لحاظ سے انھیں عوام کے مذاق کا خیال بھی رکھنا پڑ گیا۔ عوام زندگی کی نفاست پر بھی غور کرتے ہیں، اس کے علاوہ یہ کہ زندگی کی مشکلات کیا ہیں کوئی بھی منظر عام پر گالی دینا پسند نہیں کرے گا، یا کوئی بھی یہ نہیں چاہیگا کہ کہیں ایسی جگہ کھڑے ہو کر جہاں سے سب دیکھ سکتے ہوں اور سن سکتے ہوں رقص عریاں شروع کر دے، اس حالت میں اگر ادبی میدان میں آکر زندگی کی نفاست کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ ایک زیادتی ہے جسے کوئی بھی برداشت نہیں کریگا۔

ادب کے متعلق جس نظریہ کا قائل ایک فہیم آدمی کو ہونا چاہیئے وہ یہ ہے کہ جو بات بھی کہی جائے چاہے وہ زندگی کی رکیک سے رکیک حرکت سے متعلق ہو وہ نہایت حسین اور دلکش پیرایہ میں ہو، بقول شخصے اگر گالی بھی دیجائے تو وہ خوبصورت طریقے پر دی جائے۔

اس چیز سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسانی نظریے کبھی ایک

مقام پر آکر متفق نہیں ہو سکتے، لیکن ہاں طریقہ کار ایسا اختیار کیا جا سکتا ہے جہاں یہ محسوس ہو کہ کسی کی دل آزاری نہیں ہو رہی، وہ لوگ جو ادب برائے ادب کے شدت کے ساتھ قائل ہیں وہ بھی ایک منزل ایسی آتی ہے جہاں حیات کے لئے کشمکش کرنے لگتے ہیں اور مجبور ہوتے ہیں کہ اس کے سوا کچھ اور نہ کہہ سکیں یا یہ کہ اور کچھ کہہ ہی نہیں سکتے آسکر وائلڈ ایک ایسا شخص جو اعلانیہ ادب برائے ادب کا قائل تھا وہ بھی زندگی کی حدود سے نکل کر نہیں جا سکا، اگر آسکر وائلڈ ہی کے نظریہ سے دیکھا جائے اور اس کو مثال بنایا جائے تو ادب برائے ادب کے (Hedonist.) نظریہ ہوا، اس کا (Dorian Gray) کا ایک بہت بڑا کردار اگر کوئی تلقین کرتا ہے تو وہی کہ زندگی عیش و عشرت ہی کا نام ہے، لیکن وائلڈ کا یہ نظریہ کچھ زیادہ مقبول نہ ہو سکا اور اس کے (De Profundes.) پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وائلڈ اپنے اس نظریہ پر خود بھی نادم ہے، بہرکیف جو کچھ بھی ہو ادب کے منہ میں ایک لگام ہونی چاہیئے، ادب کو اخلاق کے معیار سے نہیں گرنا چاہیئے، یہاں تک کہ اگر وہ مذموم انسانی حرکتوں کی تصویر کشی بھی کرتا ہے تو ایک خاص دائرہ کے اندر رہ کر، ایک خاص انداز کے ساتھ کہ انسانی قباحتیں بھی حسن میں تبدیل ہو جائیں اور انسان کے دل میں کچھ کے دیں۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ وہ چیزیں جن کی انسان کو ضرورت نہیں ہوتی خود بخود ختم ہو جاتی ہیں، ان پر وقت صرف کرنے کی اور انھیں مٹانے کے لئے کوشش کرنے کی سر توڑ کوشش قطعاً بیکار ہے، زمانہ ان چیزوں کو خود مٹا دیتا ہے۔

ہر زمانہ کا ادب اسی کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے لیکن اپنے دور کی یاد دلانے کے لئے اس کا ہونا ضروری ہے، آج کسی کو ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ فردوسی کی طرح قلم لیکر بیٹھے اور ۳۵ سال صرف ایک شاہنامہ پر صرف کر دے لیکن اتنے پر بھی نہ فردوسی کو موت آئی اور نہ شاہنامہ کی اہمیت ختم ہوئی، اگرچہ اب کوئی اس کی تقلید نہیں کرتا، نقاد کے قلم کو غیر جانبدار اور تعصب سے پاک ہونا چاہیئے اور جس کا جتنا حصہ ہو اتنا اسے پہنچا دینا چاہیئے، ورنہ دنیا خود اس کا حق اسے پہنچا دیگی۔

نیا راگ

تعداد میں کمی معیار میں اضافہ

ایشیا میں سیاسی عنصر پہلے سے کہیں اہمیت کے ساتھ ہوگا لیکن تنقیدی ادب اور سیاسی عنصر کی مقدار ہم وزن کردی جائیگی۔ شاعری لاکھ بیکار سہی، پھر بھی بیکار شئے نہیں، اسکے اثرات ذہن ہی پر نہیں، روح پر بھی ہوتے ہیں، یہ انسان کی جمالیاتی حس کی مشاطہ ہے، اور تمدنی زندگی میں ترتیب و حسن کے احساس کو بیدار کرتی ہے، مگر مجھے ماننا پڑیگا کہ اُردو شاعری بہ چند شعرا، کو محفوظ کرکے کوئی بھی اعلیٰ تخلیق کا فریضہ ادا نہیں کرتا، فضامیں مجموعی ترقی تو محسوس ہوتی ہے یعنی مقدار کی کمی تو نہیں مگر اعلیٰ نوعیت مفقود ہے۔ "نظم معریٰ" ہی کو لیجئے اس کی تقلید میں جو کچھ اس شروع ہوئی ہے تو ہر رسالہ مہملات کی پوٹ معلوم ہوتا ہے کسی کو محنت تو کرنی نہیں پڑتی، جو جی چاہا بکا اور چھپنے کے لئے بھیج دیا۔ تعجب تو یہ ہے کہ ادبی دُنیا جیسے معقول رسالے میں یہ مزخرافات ۷۵ فی صدی چھپنے لگے ہیں۔

شاید کسی زبان میں ادب ایسے عبوری دور سے نہ گذرا ہوگا! ایک طرف ادب کے حقیقی ترقی خواہوں کو رجعت پسند ادیبوں سے اُلجھنا پڑ رہا ہے۔ دوسری طرف نام نہاد ترقی پسندوں سے۔ موجودہ ادب میں "ترقی پسندی" کی ترکیب کی جو درگت ہوئی ہے کبھی اور کسی زبان میں نہوئی ہوگی
۴۴ ہر ابہام، ہر عریانی، ہر بیتُکا پن، ترقی پسند ادب ہے۔ جسے دیکھئے وہ گورکی، بوزن کو برین اور فرائڈ کا ہمسر ہے۔

جس ناموزوں طبع کو دیکھئے ایک نظم معریٰ کہہ کر جوش واقبال کو رجعت پسندی کی تہمت دیتا ہے اور خود کو میکفیلڈ وغیرہ کا اُستاد سمجھتا ہے، ان "اُستادوں" کی پونجی کیا ہے؟ صرف تین چار نظمیں جن کو پڑھنے کے بعد ذہن کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتا۔

ان کے علاوہ ایک گروہ اور بھی ہے جو ترقی پسندی کے مفہوم کو وسیع معنی میں استعمال کرتا ہے، اسکی ضرور خواہش ہے کہ پیہم جد و جہد کے بعد نئے ادب کی تنقیحات قائم کی جائیں، تاکہ اُردو ادب کو ایک صاف راستہ مل جائے۔ یہ گروہ حقیقی تعمیر و تخلیق کے اعلیٰ اور صحیح خطوط بنانے کے لئے کوشاں ہے اس لئے اسے آج بھی ادب کے نئے اور پرانے ماحولوں پر کنٹرول حاصل ہے اور کل مزید قابو حاصل ہو جائیگا۔

بہر حال جہاں تک نظم کا تعلق ہے، لوگوں کا خیال درست ہے، اسے کم ہونا چاہئے، کم نظمیں چھپیں مگر وہ تخلیقی نمونے اور کلاسیکل ہوں، نہ مل سکیں تو نہ چھپیں، اس باب سے جو صفحات بچائے جائینگے وہ تنقید میں استعمال ہونگے۔

موجودہ نمبر ستمبر و اکتوبر نمبر ہے۔ اس میں کسی قسم کے حجم کا اضافہ نہیں کیا گیا ہے، لیکن نومبر اور دسمبر میں اسکی تلافی کی جائیگی۔ نومبر اور دسمبر دونوں نمبر اپنے مقررہ حجم سے زیادہ صفحات پر شائع کرنے کی سعی کی جائیگی۔ اگر محض ستمبر نمبر شائع کیا جاتا تو مسلسل تاخیر ہو جانے کا خدشہ تھا۔ اب کم از کم نومبر نمبر اپنے وقت پر شائع ہوگا۔ امید ہے کہ آپ ہنگامی مجبوریوں کے پیش نظر اس فروگذاشت کو بھی معاف فرمادیں گے۔

ساغر

جوش ملیح آبادی

حرفِ آخر کا ایک اور ورق

خدا - مشاطۂ بہشتی - اور حورانِ بہشتی

(حضرت جوش ملیح آبادی کے مشہور ڈرامے حرفِ آخر کا یہ وہ منظر ہے جس میں خدا کے سامنے مشاطۂ حورانِ بہشتی احتجاج کر رہی ہے اور پروردگارِ عالم اسے اطمینان دلا رہا ہے کہ حورانِ بہشتی گنہگار انسان کے سپرد نہیں کی جائینگی - اور ظالم انسانیت ان کا بال بیکا بھی نہ کر سکے گی۔ مشاطہ یہ سن کر حوروں کو ساتھ لیکر چلی جاتی ہے - حوریں اپنے خیمہ میں پہنچکر نوحہ کرتی ہیں)

(خدا عرش کے حجرہ میں بیٹھا ہوا ہے کہ اتنے میں جبریل دبے پاؤں حاضر ہو کر عرض کرتے ہیں)

جبریل حاضرِ درِ دولت پہ ہیں حورانِ دل آرا

خدا آنے دو --- اس انسان کے اعمال نے مارا

(کہ حوریں اپنی گھبرائی ہوئی مشاطہ کے پیچھے سہمی سمٹی اور سروں پر حریر کے پلّو ڈالے حاضر ہوتی ہیں اور خدا مشاطہ سے نرمی و متانت کے ساتھ دریافت کرتا ہے)

خدا کیوں ہے اتنی کشمکش کُھل کر کہو آئی ہو کیوں!؟ ان بناتِ کوثر و تسنیم کو لائی ہو کیوں؟!

مشاطہ داورا کچھ عرض کرنا چاہتی ہے یہ کنیز

خدا یہ کہ کرنا چاہتی ہو حق و باطل میں تمیز!؟

(یہ کہتے ہی خدا سر جُھکا لیتا ہے چہرہ پر خود رحمی برسنے لگتی ہے اور پھر دبی زبان سے کہتا ہے)

خدا افسوس کہ انسان نے سب کھیل بگاڑا

(اور پھر مشاطہ کی طرف دیکھ کر)

جس بات کا ہے تم کو قلق مجھ سے بتاؤ ہاں صاف کہو، کُھل کے کہو، خوف نہ کھاؤ

(مشاطہ اس ہمت افزائی کے بعد)

کیا یہ میری بیٹیاں انسان کو دی جائینگی یہ شرابیں خونیوں کے جام میں پی جائینگی

مَس کرینگے ان مری موجوں کو کیا وہ زشت خو کردگارا، جن کے مُنہ سے خون کی آتی ہے بو

خون میں لتھڑی ہوئی مٹی کی قرباں گاہ پہ کیا چڑھائے جائیں گے یہ خلد کے لعل و گہر

اے خدا، جنت کو کیا دوزخ میں جھونکا جائے گا آگ کو تسنیم کے پانی سے داغا جائے گا

کیا ڈھکیلا جائے گا عصمت کو عصیاں کی طرف
گل ہنکائے جائیں گے خارِ مغیلاں کی طرف

کیا انہیں پتھر سے ٹکرانے کا ہے تجھ کو خیال
خندۂ گل سے بھی پڑ جاتے ہیں جن شیشوں میں بال

کیا نگل لیں گی انہیں تاریکیاں انسان کی
جن کے مکھڑوں کی جھلک سے خلد میں ہے چاندنی

آئیں گی قبضہ میں کیا وہ قاتلانِ فرش کے
جوت سے جن کی دمکتے ہیں منارے عرش کے

سونپ دے گا نفس کو یہ دولتِ ماہِ تمام
یہ رموزِ سینۂ جنت، یہ اسرارِ خیام

جن کے ہاتھوں لوٹیاں حوا کی ہیں گرم فغاں
ان کو دی جائیں گی یہ شبنم کی نازک بیٹیاں

ان کو انساں کے سفینے سے کریگا کیا نڈھال؟
نرم رو کوثر کی جو لہریں ہیں اے ربِّ جمال؟

کیا تری رحمت یہ چاہے گی کہ اُڑ جائیں حواس
پھول جنت کا بنے دوزخ کے کانٹوں کا لباس؟

آہنی تاروں میں کیا اے پاسباں تنظیم کے
گوندھے جائیں گے یہ موتی کوثر و تسنیم کے

اُن کے دل ہوں گے الٰہی قربِ انساں سے دونیم
چھو سکی ہے آج تک جن کو نہ جنت کی نسیم

معدلت کی یہ ادائے حق پناہی ہائے ہائے
یہ سزائیں اور یہ جرم بے گناہی ہائے ہائے

ان کے رُخ کی چھوٹ کانپے اور فرشِ خاک پر
جن کی ضو ہو شمسۂ ایوانِ ہفت افلاک پر

خونیوں کے پہلوؤں میں جذب ہو ان کا شباب
سانس سے جن کی فضائے خلد پیتی ہے شراب

آدمی کی دھوپ کا کیونکر اُٹھا سکتی ہیں بار
جلتی پھرتی چاندنی راتیں ہیں یہ تو کردگار

دوزخی انسان اور یہ دولتِ خُلدِ بریں
اے خدائے حُسن و برنائی، نہیں، ہرگز نہیں

نوعِ انسانی کا جھولا الحفیظ و الاماں
ٹوٹ جائینگی یہ طوبیٰ کی لچکتی ڈالیاں

اف زمیں کے ذی نفس مرّیخ کی قہاریاں
اے خدا گھُٹ گھُٹ کے مرجائینگی میری کنواریاں

(تمام حوروں کے آہستہ آہستہ ہچکیاں لینے کی آوازوں سے الوہیت کا خلوت کدہ گونج اُٹھتا ہے اور خدا جلدی جلدی یہ ارشاد فرماتا ہوا چلا جاتا ہے)

خدا:۔ تڑپتی کیوں ہو، حق رسوا نہ ہوگا
کسی کا بال بھی بیکا نہ ہوگا

(پردہ گرجاتا ہے)

نوحۂ حورانِ بہشتی

اپنے کو باغِ خلد میں رسوا کریگا کون
اب کھُل کے آدمی کی تمنا کریگا کون

اک بُت کے اشتیاق کو لاکر زبان پر
قہرِ خدائے پاک گوارا کریگا کون

اب حسبِ مدعا و بقدرِ جنونِ شوق
اظہارِ آرزوئے تماشا کریگا کون

مشّاطہ کے حضور سرِ فرشِ خوابِ ناز ۔۔۔ اب ذکرِ نسلِ آدم و حوّا کرے گا کون
اب چشمِ شوق و جنبشِ مژگاں سے بے دریغ ۔۔۔ اک جانِ آرزو کا تقاضہ کرے گا کون
امروز کے دریچۂ حسرت فروش سے ۔۔۔ اب انتظارِ خندۂ فردا کرے گا کون
ناپختگانِ فرش پہ ہے عرش کا عتاب ۔۔۔ اس آتشِ عتاب کو ٹھنڈا کرے گا کون
تھا کتنے دن سے مقدمِ جاناں کا غلغلہ ۔۔۔ اب اس کا ساحلوں پہ اعادہ کریگا کون
کوثر پہ گھر کے آئینگی جب سُرخ بدلیاں ۔۔۔ پیاسی زمین کی سمت اشارہ کریگا کون
چھٹکی ہے یہ جو پھول سے مکھڑوں کی چاندنی ۔۔۔ اس چاندنی کو آ کے سہانا کرے گا کون
جس سے ہے خود ہی صاحبِ پیماں کو انحراف ۔۔۔ ایسے فسردہ عہد کو ایفا کرے گا کون
"بیکا نہ ہوگا بال بھی" اللہ ری بے کسی ۔۔۔ اب پائمالِ رنجشِ بیجا کرے گا کون
اس خیمۂ سکوت کو گلبانگِ کیف سے ۔۔۔ رشکِ خروشِ گنبدِ مینا کرے گا کون
اب رہگذارِ جلوہ و بازارِ حُسن میں ۔۔۔ نرخِ متاعِ ناز کو بالا کرے گا کون
درمانِ لاعلاج سے تنگ آ چکا ہے دل ۔۔۔ اب ساز و برگِ درد مہیّا کرے گا کون
سُن ہو گیا ہے سینہ ہجومِ ثبات سے ۔۔۔ اس جانِ زار کو تہ و بالا کرے گا کون
طوبیٰ کے زیرِ سایہ گھٹاؤں کی گونج ہیں ۔۔۔ اب اہتمامِ ساغر و مینا کرے گا کون

(کہ اتنے میں مشّاطہ جو آڑ سے اس نوحہ کو سُن رہی تھی برافروختہ ہو کر یکایک سامنے آ جاتی ہے اور تمام حوروں کو تلخی اور طنز کے ساتھ دیکھ کر کہنا شروع کرتی ہے)۔

مشّاطہ

افسوس اس خرابۂ عصمت کے سایہ میں ۔۔۔ گلکاریاں گناہ کی پیدا کرے گا کون!؟
جنّت میں دیگا کون فرشتوں کو سولیاں ۔۔۔ کوثر کو آ کے خون کا دریا کریگا کون!؟
معزول کر کے دختِ شرابِ طہور کو ۔۔۔ اعلانِ تاجپوشیٔ دُنیا کرے گا کون!؟

(یہ سُن کر حوریانِ بہشتی اپنے خیمہ سے شرما کر بھاگ جاتی ہیں پردہ گرتا ہے)

جاں نثار اختر

ابھی نہیں

ابھی تو خود ہی سینۂ چمن میں آگ ہے نہاں   بہار ہے تو کیا حرام ہے نشاطِ گلستاں
یہ جشنِ گُل ابھی نہیں! یہ رنگ و بو ابھی نہیں

ابھی تو وقت کے لبوں پہ شعلہ بار راگ ہے   ابھی تو پرفشاں دلِ بشر میں غم کی آگ ہے
نوائے ساز و مطربانِ خوش گلو ابھی نہیں

ابھی تو بجلیوں کی زد پہ خرمنِ وجود ہے   ابھی تو چرخِ زندگی پہ ظلمتوں کا دود ہے
نظارہ سوزِ مہ وشوں کی آرزو ابھی نہیں

ابھی سفینۂ بشر ہے ظلمتوں کی موج پر   ابھی تلاطمِ حیات ہے کمالِ اوج پر
چراغِ ماہتاب و سیرِ آب جو ابھی نہیں

ابھی تو بحث گرم ہے مسائلِ حیات کی   ابھی تو غیر معتبر ہے شرحِ کائنات کی
نیاز و ناز کی لطیف گفتگو ابھی نہیں

ابھی تو جامِ ارض سے ہے ایک موجِ خوں بلند   ابھی تو دورِ نو ہے غرقِ شورِ ناوک و کمند
مئے کہن ابھی نہیں! خم و سبو ابھی نہیں

ہم اپنے ملک و قوم کو رکھیں گے کیا سدا غلام   جھکا وہ فرقِ آسماں اُٹھی وہ تیغِ بے نیام
جوانیوں کا سرد اس قدر لہو ابھی نہیں

ایشیا ۔ ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۲ء

ادا بدایونی

تعمیرِ نو

شرمندگیٔ کوششِ ناکام کہانتک
محرومیٔ تقدیر کا الزام کہانتک

دُنیا کو ضرورت ہے ترے عزمِ جواں کی
سرگشتہ رہیگا صفتِ جام کہانتک

کبتک ترے ہونٹوں پہ حدیثِ رُخِ تاباں
سر میں ترے سودائے لبِ بام کہانتک

گیسوئے سیہ تاب و رُخِ صاعقہ پرور
یہ مرگ و حیاتِ سحر و شام کہانتک

لیلائے حقیقت سے بھی ہو جا کبھی دوچار
خوابوں کی حسیں چھاؤں میں آرام کہانتک

رُخ گردشِ دوراں کا پلٹ سکتا ہے تو خود
ناداں! گلۂ گردشِ ایام کہانتک

کبتک ترے سینہ میں خلش تیرِ مژہ کی
یادِ لبِ میگوں سحر و شام کہانتک

اے ذرۂ ناچیز! خجل مہر کو کردے
افتادہ و تفتیدہ و گمنام کہانتک

جز وہم نہیں قیدِ رہ و رسمِ زمانہ
اے طائرِ آزاد! تہِ دام کہانتک

صفیہ شمیم ملیح آبادی

مرے لئے

آراستہ ہے صحنِ گلستاں مرے لئے
نغمہ سرا ہیں مرغِ خوش الحاں مرے لئے

روشن ہے میرے واسطے قندیلِ مہر و ماہ
تارے ہیں اوجِ چرخ پہ رقصاں مرے لئے

چلتی ہے سرد بادِ صبا میرے واسطے
آتا ہے روز ابرِ بہاراں مرے لئے

کھلتے ہیں میرے واسطے گلہائے نو بہ نو
شاداب ہے فضائے گلستاں مرے لئے

کھلتی ہے میرے واسطے شفّاف چاندنی
انوار بار ہے مہِ تاباں مرے لئے

رخسارِ گل پہ میرے لئے مضطرب ہے رنگ
روئے گہر پہ آب ہے غلطاں مرے لئے

آتی ہے میرے واسطے گلزار میں بہار
لاتا ہے ابر عیش کا ساماں مرے لئے

کرتی ہے نذر اوس کے موتی خموش رات
گلشن کا عطر بیز ہے داماں مرے لئے

ہر شاخِ گل ہے جام بکف میرے واسطے
ہر باغ ہے بہار بداماں مرے لئے

ہوتا ہے دن کا چہرہ مری خاطر آشکار
رہتی ہے شب کی زلف پریشاں مرے لئے

ساری ہے ایک روحِ بقا کائنات میں
جاری ہیں لاکھ چشمۂ حیواں مرے لئے

میرے لئے وجود میں آیا ہے کُل جہاں
پیدا ہے میرے واسطے، پنہاں مرے لئے

سروش عسکری طباطبائی

نیا جہان

اُٹھ اکہ پھر تاریکیِ شب سے سحر پیدا کریں
موت کے سینے سے ہستی کے شرر پیدا کریں

تلخیوں میں لذّتِ شہد و شکر پیدا کریں
زہر میں پھر آبِ حیواں کا اثر پیدا کریں

پھر خس و خاشاک سے گلہائے تر پیدا کریں
خاکِ بے مایہ سے پھر لعل و گہر پیدا کریں

طبعِ شاہان و مزاجِ مہوشاں کی کیا بساط
قلبِ یزداں میں در آئے وہ نظر پیدا کریں

جسکی ضو سے جگمگا اُٹھے شبِ تارِ حیات
وہ ہجومِ اخترِ تابندہ تر پیدا کریں

جو ہو بے تعیینِ منزل جو ہو بے قیدِ حیات
کارواں میں وہ نئی روحِ سفر پیدا کریں

کوہ ٹکرا دیں جو حائل ہوں کشودِ کار میں
اس طلسمی گنبدِ بے در میں در پیدا کریں

نرم اور سنگین راہوں سے گزرنے کیلئے
آنکھ شبنم کی تو ہیرے کا جگر پیدا کریں

لوچ میں موجِ نسیم اور کاٹ میں تیغِ اصیل
مکتبِ نو سے وہ طفلِ باخبر پیدا کریں

دے سکے انساں کو انساں کی غلامی سے نجات
دُھن کی پکّی ایسی اک نوعِ بشر پیدا کریں

زندگانی کی مسلسل چلچلاتی دھوپ میں
نزہت و رنگینیِ موجِ گہر پیدا کریں

دم میں یہ سارا طلسمِ عہدِ حاضر ٹوٹ جائے
پنجۂ فولاد و ضربِ کارگر پیدا کریں

سُست بُنیادوں کو ڈھا کر اس جہانِ خام کی
اک جہانِ دیگر و پائندہ تر پیدا کریں

ایشیا۔ ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۲ء

راحت سعید

سمندر کی ریتی پہ اک روز میں نے!

سمندر کی ریتی پہ اک روز میں نے
یونہی بیٹھے بیٹھے لکھا نام اس کا
مگر چند موجوں نے ساحل پہ آکر
بہایا مری زندگی کا سہارا!
پھر اک بار ہمّت سے کچھ کام لے کر
اسی طرح میں نے وہی نام لکھا
مگر اضطرابِ تموّج نے فوراً
مٹا ڈالا میری محبت کا ثمرا!

۱۲۲

کہا اُس نے "ناکام کوشش سے حاصل
بھلا کس نے فانی کو باقی بنایا
مجھے خود عدم کو بسانا پڑے گا
میں چاہوں گی خود نام اپنا مٹانا"!

"بقا مادیت کو ہے اس جہاں میں
ترا نام تو شہرہ آفاق ہو گا
میں اوراقِ ہفت آسماں پر لکھوں گا
ترے حُسنِ سیرت کا نادر قصیدا
کہیں جب قضا حکمرانی کرے گی   ہماری محبت ہی باقی رہے گی"!   (ای۔ اسپینسر)

ایشیا۔ ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۲ء

اخترالایمان

تنہائی

میرے شانوں پہ ترا سر تھا نگاہیں نمناک
اب تو اک یاد سی باقی ہے تو وہ بھی کیا ہے!!
ذہن پر چھا گیا الجھی ہوئی آہوں کا غبار
سر ہتھیلی پہ دھرے سوچ رہا ہوں بیٹھا
کاش اس وقت کوئی پیر خمیدہ آکر
کسی آزردہ طبیعت کا فسانہ کہتا
کاش اس وقت کوئی مجھ کو سہارا دیتا!
اک دھندلکا سا ہے دم توڑ چکا ہے سورج
دن کے بستر پہ بچھا دیتے سے ریاکاری کے
اور مغرب کی فناگاہ میں پھیلا ہوا خون
دبتا جاتا ہے سیاہی کی تہوں کے نیچے
دور تالاب کے نزدیک وہ سوکھی سی ببول
چند ٹوٹے ہوئے ویران مکانوں کے پرے
ہاتھ پھیلائے برہنہ سی کھڑی ہے خاموش
جیسے غربت میں مسافر کو سہارا نہ ملے
اس کے پیچھے سے سسکتا ہوا اک گول سا چاند
ابھرا بے نور شعاعوں کے سفینے کو لئے

میں ابھی سوچ رہا ہوں کہ اگر تو مل جائے
زندگی گو ہے گرانبار پہ اتنی نہ رہے
ایسے لاکھوں ہیں جو برگشتہ مقدر بھی نہیں
پھر بھی جینے کی تمنا میں مرے جاتے ہیں
میں اگر جی بھی رہا ہوں تو تعجب کیا ہے
مجھ سے لاکھوں ہیں جو بے سود جئے جاتے ہیں
کوئی مرکز ہی نہیں میرے تخیل کے لئے
اس سے کیا فائدہ جیتے رہے اور جی نہ سکے
یوں تو ویران سے ڈھیروں کے سہارے اکثر
جن کا مونس کوئی آنسو ہے نہ بتی نہ دیا
جن کے ملتے ہیں آثار نفس، سنگ مزار
جن کو اکتا کے یہاں جیسے کوئی چھوڑ گیا
پھول ہر رنگ میں کھلتے ہی رہا کرتے ہیں
ایسی بے کیف کشاکش سے مگر حاصل کیا
کون کرتا ہے حمائل انہیں باہوں کی جگہ
خود ہی گرتے ہیں، سنورتے ہیں بکھر جاتے ہیں
اب ارادہ ہے کہ پتھر کے صنم پوجوں گا
تاکہ گھبراؤں تو ٹکرا بھی سکوں مر بھی سکوں

ایسے انسانوں سے پتھر کے صنم اچھے ہیں
ان کے قدموں پہ مچلنے لگے بیتاب سا خوں
اور وہ میری محبت پہ کبھی ہنس نہ سکیں!
میں بھی بے رنگ نگاہوں کی شکایت نہ کروں

سوچتا ہوں کہ اُلجھتا ہوا تاریکی سے
بربریت کے کسی دور میں گم ہو جاؤں
یا کسی گوشۂ اہرام کے سناٹے میں
جا کے خوابیدہ فراعین سے اتنا پوچھوں
ہر زمانے میں کئی تھے کہ خدا ایک ہی تھا
اب تو اتنے ہیں کہ حیراں ہوں کس کو پوجوں
پھر کوئی تازہ کرے آ کے روایاتِ قدیم
۴۴
سو گئے مصر کے معبود خدا جانے کہاں

اب تو مغرب کی فناگاہ میں وہ لوگ نہیں
عکسِ تحریر ہے اک رات کا ہلکا ہلکا
اور پُرسوز دُھندلکے سے وہی گول سا چاند
اپنی بے نور شعاعوں کا سفینہ کھیتا
اُبھرا غمناک نگاہوں سے مجھے تکتا ہوا
جیسے گھل کر مرے آنسو میں بدل جائیگا
ہاتھ پھیلائے ادھر دیکھ رہی ہے، وہ ببول
سوچتی ہوگی کوئی مجھ سا ہے یہ بھی تنہا
آئینہ بن کے شب و روز تکا کرتا ہے
کیسا تالاب ہے جو اس کو ہرا کر نہ سکا

یوں گزارے سے گزر جائینگے دن اپنے بھی
پر یہ حسرت ہی رہیگی کہ گزارے نہ گئے
خون پی پی کے پلا کرتی ہے انگور کی بیل
گر یہی رنگ تمنا ہے تو اب یوں بھی سہی
خون پیتی رہی بڑھتی رہی کونپل کونپل
چھاؤں تاروں کی شگوفوں کو نمو دیتی رہی
نرم شاخوں کو تھپکتے رہے ایام کے ہاتھ
شمعِ اوقات پگھلتی رہی لَو دیتی رہی جلتی رہی

اب مگر یاد نہیں کیا تھا مآلِ امید
اس گزرگاہ پہ اب نقشِ کفِ پا بھی نہیں
ایک تحریر ہے ہلکی سی لہو کی باقی
خوشہ چیں ہاتھ بھیانک سی تنومند نظر
دھندلے اوراق پہ ماضی کے اگر کچھ ہے یہی
بیل پھلتی ہے تو کانٹوں کو چھپا لیتی ہے
زندگی اپنی پریشاں تھی پریشاں ہی رہی

چاہتا یہ تھا مرے زخم کے انگور بندھیں
یہ نہ چاہا تھا مرا جام تہی رہ جائے
ہاتھ پھیلائے ادھر دیکھ رہی ہے، وہ ببول
سوچتی ہوگی کوئی مجھ سا ہے یہ بھی تنہا
ذہن پر چھا گیا الجھی ہوئی آہوں کا غبار
کیسا تالاب ہے جو اس کو ہرا کر نہ سکا
کاش اس وقت کوئی پیرِ خمیدہ آ کر
میرے شانوں کو تھپکتا غمِ تنہائی میں

ایشیا۔ ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۳ء

مسلم ضیائی ایم-اے

یاد

تمہارے مسکرانے سے زمانہ مسکراتا تھا — ہر اک ذرّہ زمین و آسماں کا جھوم جاتا تھا
ہوا مستانہ چلتی تھی ستارے لڑکھڑاتے تھے — پرندے دیکھ کر ہم کو سریلے گیت گاتے تھے
فلک پر بجلیاں آپس میں تھیں سرگوشیاں کرتی — شفق کی چادرِ رنگیں میں تھیں اٹھکھیلیاں کرتی
ضیا بارِ مسرّت ماہتاب عشق پرور تھا — مرا دل اک طلاطم خیز الفت کا سمندر تھا
یہ کیا معلوم تھا قسمت مری وہ دن بھی لائیگی — شکایت آپ کی میری زباں پر جبکہ آئے گی

ابھی بھولا نہ ہوگا تم نے جو افسانہ لکھا تھا — وہی افسانہ جس کا خاتمہ اس طرح ہونا تھا ۴۵
مکمّل ہو چکا افسانہ جی چاہے تو سُن لیجے — گلِ افسردہ بکھرے ہیں جو جی چاہے تو چن لیجے
وہ صبحیں یاد آتی ہیں وہ شامیں یاد آتی ہیں — وہ جلسے یاد آتے ہیں وہ باتیں یاد آتی ہیں
وہ پُل پر بیٹھنا ندّی میں جانا یاد آتا ہے — وہ پانی کھیلنا چھینٹیں اُڑانا یاد آتا ہے
وہ پرویں اور احمد کا جھگڑنا یاد آتا ہے — تمہارے واسطے جگنو پکڑنا یاد آتا ہے
وہ خسرو باغ میں کشتی کا کھینا یاد آتا ہے — وہ اک ننّھا سا رنگیں پھول دینا یاد آتا ہے
وہ ہنسنا کھیلنا اور مسکرانا یاد آتا ہے — جگر کے شعر گھنٹوں گنگنانا یاد آتا ہے

بُھلاؤں کس طرح وہ نظم جو خود میں نے لکھی ہے
مٹاؤں کیسے وہ تصویر جو تم نے بنائی ہے

ساغرؔ نظامی

عید

عید آئی ہے لیکن اے مطرب اللہ بتا کس دُنیا میں!؟ یہ بادۂ کہنہ چھلکا ہے کس ساغر میں کس مینا میں
یہ موجِ مسرّت اُٹھی ہے کس ارمانوں کے دریا میں یہ روحِ لطافت دوڑی ہے، کس گلشن میں کس صحرا میں

یہ نغمۂ عشرت گونجا ہے کس بربط میں کس نَے نائیں!؟

عید آئی ہے لیکن اے مطرب اللہ بتا کس دُنیا میں

۲۴ انسانیّت کے ماتھے سے فوّارۂ خونیں جاری ہے، تہذیب کی نیّا ڈگمگ ہے غرقابی کی تیاری ہے،
رفتارِ تمدّن مبہم ہے تہذیب و عمل کی خواری ہے شیطان کا فسوں افسانہ ہوا آدم کے جنوں کی باری ہے

مجروح و مسافر دُنیا پر اب سانس بھی لینا بھاری ہے

عید آئی ہے لیکن اے مطرب اللہ بتا کس دُنیا میں!؟

بستی لرزاں، جنگل لرزاں، فردوسِ بہاراں لرزاں ہے قلبِ مومن تھرّاتا ہے، احساسِ ایماں لرزاں ہے،
مغرب لرزاں مشرق لرزاں ایران و توران لرزاں ہے اک فتنۂ نو کی ہیبت سے کُل عالمِ امکاں لرزاں ہے

انسانیّت کی چھاتی پر اک گہرا زخم نمایاں ہے

عید آئی ہے لیکن اے مطرب اللہ بتا کس دُنیا میں!؟

——— ایشیا۔ ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۲ء

یاں آج بھی لاکھوں دیوانے، تقدیر کا رونا روتے ہیں
یاں آج بھی لاکھوں اشکوں سے آنکھوں کا کاجل دھوتے ہیں

یاں آج بھی لاکھوں طاقت پر عزت کی دولت کھوتے ہیں
موہوم مسرت کی دھن میں امید کی کھیتی بوتے ہیں

یاں آج بھی پیاسے جاگے ہیں، یاں آج بھی بھوکے سوتے ہیں

عید آئی ہے لیکن اے مطرب بتا کس دنیا میں!؟

چہروں کی دمک پر چھائیں ہے آئینۂ چشم حیراں کی
مخمور نگاہوں کے پیچھے تاریخ ہے سوز پنہاں کی

رنگین لباسوں کے نیچے اک آگ دبی ہے حرماں کی
سینوں کے گدازوں کی تہ میں تربت ہے جہان ارماں کی

آلام کے شعلوں سے ابتک دوزخ ہے یہ جنت انساں کی

عید آئی ہے لیکن اے مطرب بتا کس دنیا میں!؟

نغمے ہیں گراں اس بستی میں مجبور کی آہیں ارزاں ہیں
اٹھنے کا امکاں کمتر ہے، گرنے کی راہیں ارزاں ہیں

مسرور نگاہیں مہنگی ہیں مجبور نگاہیں ارزاں ہیں
مظلوم وطن سے باہر ہیں، ظالم کی پناہیں ارزاں ہیں

خوں ریز ابھی تک مقتل ہے آباد ابھی تک زنداں ہے

عید آئی ہے لیکن اے مطرب بتا کس دنیا میں!؟

اس دنیا میں جو مقتل ہے کمزوروں کا مقہوروں کا؟
اس دنیا میں جو دوزخ ہے معصوموں کا معذوروں کا

اس دنیا میں جو مسکن ہے ہل والوں کا مزدوروں کا
اس دنیا میں جو مرکز ہے بیواؤں کا مجبوروں کا

اس دنیا میں!؟ اس دنیا میں!! جو زنداں ہے مجبوروں کا!!!؟

عید آئی ہے لیکن اے مطرب بتا کس دنیا میں!؟

ایشیا۔ ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۷ء

مزدور کی کٹیا میں تو نہیں اس عید کے جلووں کا پرتو اُجڑی ہوئی دُنیا میں تو نہیں اس عید کے جلووں کا پرتو

دُنیائے تمنّا میں تو نہیں اس عید کے جلووں کا پرتو ناداں من کی نگریا میں تو نہیں اس عید کے جلووں کا پرتو

دکھیاری جنتا میں تو نہیں اس عید کے جلووں کا پرتو

عید آئی ہے لیکن اے مطرب للہ بتا کس دُنیا میں!؟

افلاس کی گہری تاریکی میں سڑنے والے سڑتے ہیں! دولت کی سنگین چوکھٹ پر صبح و شام رگڑتے ہیں

ہر موڑ پہ مدفن بنتا ہے، ہر گام پہ زندہ گڑتے ہیں طاقت کے نشے میں متوالے غم کے ماروں سے اکڑتے ہیں

سطوت کی جبیں پر نخوت کے بل اب بھی گہرے پڑتے ہیں

عید آئی ہے لیکن اے مطرب للہ بتا کس دُنیا میں؟

جو جبر نے ہم پر طاری کی نفرت ہے، وہی غفلت ہے، وہی جو قہر نے ہم پر ساری کی دب جانے کی لعنت ہے، وہی

جو بار ہے انسانیت پر انسانوں میں نفرت ہے وہی اس دُنیا میں نکبت ہے، وہی کلفت ہے، وہی غربت ہے، وہی

تقدیر وہی مزدور کی ہے دہقانوں کی قسمت ہے وہی

عید آئی ہے لیکن اے مطرب للہ بتا کس دُنیا میں!؟

تاریک و مسلسل تنہائی غم خانے کی رکھوالی ہے امید کا فرقِ غمگیں ہے اور مرقدِ غم کی جالی ہے

نومیدی ہے بے رنگی ہے، بے کیفی ہے بے حالی ہے گلشن مرجھانے کو ہے مگر مالن ہے نہ کوئی مالی ہے

آغوش جو خالی تھا میرا وہ اور بھی خالی خالی ہے

عید آئی ہے لیکن اے مطرب للہ بتا کس دُنیا میں!؟

ایشیا ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۲ء

نئی کہانی

سیاست و ادب

اس وقت تک ایشیا میں زندگی کے جملہ عنوانات پر مضامین شائع ہوتے رہے، خاص کر پولیٹکل سائنس اور سیاست کی تاریخ پر اس نے ہمیشہ زور دیا، میرا خیال ہے کہ اب زندگی کا کوئی گوشہ سیاسی اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا، ہندوستان ہی کو لیجیے، ہندو قوم میں نیشلزم ابھی تک روایاتی قیدوں سے آزاد نہیں، نئے ہندوستان کا تخیل ہندو جنتا میں رام اور کرشن کے "بھارت ورش" کے ہم مفہوم ہے، مسلم عوام میں اس وقت تک رجعت پسند اور کھوکھلی تحریکیں محض فرسودگیوں اور جہالت ہی کی وجہ سے کامیاب ہوتی رہیں، مسلمانوں میں نام کو بھی سیاسی شعور نہیں، ایامِ جاہلیت کی طرح ان تحریکوں کو "کفر و اسلام" کے نام پر اعلیٰ طبقوں نے دکھاوے کیلئے کامیاب بنا کر ظاہر کیا، بے چارے مسلم عوام غافل اور جاہل تھے، رَو میں بہ گئے۔ جس طرح عام انتخابات کے موقع پر فرقہ پرستی، شیعہ سُنی سید افغان، اور مختلف اغراض و مقاصد کا لاسہ دے کر ووٹروں کو احمق بنایا جاتا ہے کچھ ایسے ہی طریقے مسلم اعلیٰ طبقے نے سیاست کے میدان میں اختیار کئے نہ کوئی تنظیم ہے، نہ کوئی مقصد ہے نہ کوئی پروگرام ہے اور سب کچھ ہے۔

عوام میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کیلئے بہت بڑے پیمانے کی ضرورت ہے آج کل اس کا امکان نہیں، پھر بھی کچھ نہ کچھ ہونا چاہیئے، اور دُنیا ۵۰
کے تمام سیاسی بحران سے عوام کو (عشرت پسند خواص کو بھی) آشنا کرنے کیلئے سیاسی ادب کی اشاعت ضروری ہے۔

"حیاتیات" پر مرزا ارشاد بیگ کے مقالوں کو علمی حلقوں میں بڑی اہمیت دی گئی ہے، کیوں نہ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے اپنے نقطۂ نگاہ سے بھی اظہارِ خیال کریں تاکہ ناظرین ہر پہلو سے آنے والی دُنیا کے خطوط کو زیادہ سمجھ سکیں۔ انگریزی میں ویلز ہی اس مسئلہ پر نہیں لکھتا، ہیرلڈ لاسکی اور دوسرے لوگ بھی لکھتے رہتے ہیں، غور کیا جائے تو یہ مسائل بہت اہم ہیں، اور راس بدلتی ہوئی ارتقا پذیر دُنیا میں بڑی ضرورت ہے کہ علمی طور پر "آج" و "کل" کا اندازہ کیا جائے۔

ساغر

ل۔ احمد اکبرآبادی

ایک عاشق کے نفسیات

یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ہمارے لکھنے والے سوویٹ روس کے ادب اور سماج کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ یہ توجہ ہمارے ادب میں اضافے اور ترقی کا باعث ہوگی۔

سیاسی اسباب کی بنا پر سوویٹ روس کے خلاف جو پروپگنڈا ہوتا رہا اس نے دُنیا کو یہ یقین دلایا کہ وہاں ادب حسب الحکم وجود میں آتا ہے اور سوویٹ لکھنے والے ایک وردی پہننے والی فوج سے زیادہ نہیں۔ اور اب اگرچہ سیاسی اسباب ہی نے سوویٹ روس کو دُنیا کے سامنے اصلی رنگ روپ میں پیش کر دیا ہے، لیکن ادب صناعت کے باب میں اہلِ نظر اس پروپگنڈے سے کبھی متاثر نہیں ہوئے۔ گورکی کے بعد شولاخوف وغیرہ کی تصانیف کو جھٹلایا نہ جا سکتا تھا۔

اس وقت جو "مختار" آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے یہ YURI OLYESHA کے ایک فسانہ (مطالعہ) سے لیا گیا ہے اور غرض یہ ہے کہ اس "مطالعہ" کو پڑھ کر ہم اندازہ کر سکیں کہ جس زبان کے دوسری اور تیسری صف کے لکھنے والے ایسا کچھ لکھ سکتے ہوں اس ادب کی عظمت و اہمیت کیا ہے!

میرے خیال میں یہ فسانہ تخئیلی ادب کا بہترین کارنامہ اور اس بات کی شہادت ہے کہ سوویٹ روس نے دُنیا کو جو نیا کلچر دیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اُسی ادب کی عظمت و اہمیت کے تصور سے میں حقیقتاً کانپنے لگتا ہوں۔ یوری اولیشا کی عمر اس وقت بیالیس سال کی ہے۔ وہ کم لکھتا ہے لیکن ایک نہایت اچھوتے پرواز اور نرالے اندازِ بیان کا مالک ہے۔ (ل۔ احمد)

جمالی، سائنس کی آخری ڈگری کا طالب علم، پارک میں شیریں کا انتظار کر رہا تھا۔ دن کافی چڑھ چکا تھا اور گرمی بھی ہو گئی تھی۔

ایک گرگٹ آیا اور پتھر کے اوپر چڑھ گیا۔ جمالی اسے دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا کہ پتھر پر بیٹھا ہوا گرگٹ کتنا غیر محفوظ ہے۔ کتنی آسانی سے مارا جا سکتا ہے! پھر اُسے گرگٹ کی غداری اور چوری کا خیال آیا پھر گرگٹ کو مار دینے سے ثواب ملنے کی طرف دھیان جانا ہی تھا۔

ان خیالات سے وہ کچھ جھنجھلا گیا اور اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اس کے اندر کسی پر حملہ کر دینے کا جذبہ ابھر آیا تھا وہ خود ہی کہنے لگا:۔

"لاحول ولا قوۃ! گرگٹ کی غداری اور اسے مار ڈالنے سے ثواب کا خیال مجھے آیا ہی کیوں؟ گرگٹ بھی بہت سے بیکار کیڑوں کی طرح ایک ہے، اور میرے یہ خیالات ...."

وہ بیٹھ کر ایک گرے ہوئے درخت کے تنے پر جا بیٹھا۔

اس جگہ گھاس میں کیڑے مکوڑے بہت تھے جو جمالی کے پہنچنے سے اُٹھنے پھدکنے لگے۔ ان کیڑوں کی اڑان سے جو خط اور لکیریں کھنچیں

وہ جمالی کی نظر میں عمارتوں کے نقشے معلوم ہوئے۔ دروازے اور دیواریں، طاق اور محرابیں بنتی دکھائی دیں۔

پھر اسے خیال آیا کہ یہ کیڑے مکوڑے تو اسکے ذہن و خیال پر چھا گئے ہیں۔ وہ خود ہی کہنے لگا:۔

"میرے خیال کی فضا کیڑوں سے بھر گئی ہے۔ مگر یہ کیا چیز ہے جو کیڑوں سے بھر گئی ہے۔ مگر یہ کیا چیز ہے جو مجھ پر چھائے جا رہی ہے؟ میں وہ چیزیں دیکھ رہا ہوں جن کا وجود نہیں!"

شیریں ابھی تک نہ آئی تھی اور جمالی دیر ہونے کے سبب سے گھبرانے لگا تھا۔ وہ پھر ٹہلنے لگا۔ لیکن اتنی سی دیر میں اس کو کیڑوں کی کئی قسموں کا عین الیقین ہو گیا تھا! اس نے ایک کیڑے کو اُٹھا کر ہتیلی پر رکھا تو اس کا چمکیلا ہٹ نظر آیا۔ جمالی سوچنے لگا:۔

"توبہ ہے اگر یہی حال رہا تو میں تھوڑی دیر کے اندر علم الحیات کا ماہر بن جاؤں گا۔" اس کا مزاج ابھی تک بگڑا ہوا تھا۔

پھر اسکی نظر گھاس کے فرش پر پڑی تو معلوم ہوا کہ گھاس کی بھی

قسمیں ہوتی ہیں۔ دوب کے علاوہ لانبی پتیوں والی اور چرچٹے جو رسی کی طرح بل کھائے ہوتی ہے۔ گھاس پر سے نظر ہٹی تو پھولوں کی نیرنگی نے حیران کر دیا۔ اُس نے سوچا :۔

"میں علوم فطرت کا ماہر بننا نہیں چاہتا، مجھے اس مشاہدے کی کوئی ضرورت نہیں ہے!"

شیریں کا ہو۔بہانہ تھا۔ انتظار میں مبتلا جمالی بے جانے تعداد وشمار میں مصروف ہوگیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ پارک میں نکونی پتیوں والے درختوں کی تعداد زیادہ ہے۔ انتظار سے گھبرا کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ اچانک شیریں کے بدلے ایک اجنبی نمودار ہوگیا۔ یہ دیکھ کر جمالی کو بہت غصہ آیا۔

اجنبی سامنے والی بینچ پر بیٹھ گیا اور دونوں ہات گھٹنوں پہ رکھ لئے۔ وہ جوان تھا مگر نہایت خوش قسم کا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ "رنگندھا" (رنگ اندھا) تھا۔ اس نے دھیمی آواز میں جمالی سے کہا :۔

"مجھے تم پر رشک آتا ہے۔ تمہیں پیڑ پتے ہرے دکھائی دیتے ہیں ــــ مجھے تو کیریاں بھی نیلی نظر آتی ہیں۔"

"کیریاں نیلی ہوتیں تو لوگ آم کھا ہی نہ سکتے۔" جمالی نے بے سوچے سمجھے کہا۔

"ہاں، پر میں تو اکثر نیلے ہی آم کھاتا ہوں!" اجنبی نے افسردہ لہجے میں بتایا۔

جمالی کے بدن میں ہمدردی کی پھریری دوڑ گئی۔ پھر اسنے پوچھا:۔
"یہ بتاؤ کہ ابابیلیں اُڑتی ہیں تو تمہیں مکان بنتا دکھائی دیتا ہے؟"
"نہیں مجھے ایسا تو کبھی محسوس نہیں ہوا!"

اسکے جواب کی تشریح کے لئے جمالی نے ایک اور سوال کیا۔
"یعنی تمہیں ہر چیز ویسی ہی نظر آتی ہے جیسی اور آدمیوں کو؟"
"ہاں، دو چار رنگوں کے سوا ہر چیز!" پھر اس نے جمالی کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا "تمہیں کہیں محبت تو نہیں ہوگئی ہے؟"
"ہو تو گئی ہے!" جمالی کو قبولنا پڑا۔

"ہوں! مجھے بعض رنگ صحیح دکھائی نہیں دیتے باقی ہر چیز دوسرے آدمیوں کی طرح دیکھ سکتا ہوں۔"

آخری جملہ کہتے وقت اسکے چہرے پر بشاشت سی تھی۔
"لیکن نیلے آم کھانا ــــ اف!" جمالی نے مسکرا کر کہا۔
دور سے شیریں آتی دکھائی دی جمالی فوراً کھڑا ہوگیا، جیسے کہ اُچک پڑا ہو۔ رنگندھا اپنی ٹوپی اٹھا کر چلنے لگا۔ جمالی نے خوشی کے لہجے میں کہا :۔

"تم بیلا بجا لیتے ہو؟"
"مگر اب میرا وجود باطل ہے۔ اب بیلا ہے نہ میں ہوں اور کوئی!"
"پر تمہارا ڈھنگ ہے تو بیلا نوازوں کا سا!"

رنگندھے نے جمالی کی بات کو نظر انداز کر کے کہا :۔
"ہوگا، مگر تمہارا راستہ ہے پُرخطر!"

شیریں تیز قدمی سے آرہی تھی۔ جمالی اس طرف کو بڑھا۔ نکونی پتیوں کے نقاب میں کلیاں ہلکی ہوا سے جھوم رہی تھیں اور رنگندھا سوچ رہا تھا:۔
"طوفانی موسم سر پر ہے!"

پھر اسکی نظر ایک درخت پر پڑی : دوسرے تمام پتوں کی طرح کا ایک پتا ہوا میں ہل رہا تھا ــــ نیلے رنگ کا درخت ادھر سے اُدھر جھونکے کھا رہا تھا۔ لیکن جمالی کو ہر درخت ہرا دکھائی دے رہا تھا اور وہ پتوں کے متعلق مسلسل نظریئے بنا رہا تھا وہ سوچ رہا تھا:۔
"ہرے بھرے درخت شیریں کا خیر مقدم کر رہے ہیں!"

رنگندھا یقیناً غلط خیالی میں مبتلا تھا مگر جمالی اس سے بڑی غلطی کا مرتکب ہو رہا تھا۔ جمالی کو پھر کچھ خیال آیا اور آپ ہی آپ کہنے لگا :۔

"لاحول ولاقوۃ! میں وہ چیزیں دیکھ رہا ہوں جن کا وجود نہیں ہے!"

اتنے میں شیریں قریب آگئی تھی۔ اسکے ایک ہاتھ میں کاغذی تھیلے میں خوبانیاں تھیں، دوسرا ہاتھ جمالی کی طرف بڑھا کر بولی :۔
"منہ کیوں بنائے ہوئے ہو؟"
"میری نظر کچھ موٹی ہوگئی ہے!"

شیریں نے ایک خوبانی لی اور انگلیوں میں دبا کر اس کی گٹھلی نکالدی گٹھلی ذرا فاصلے پر جا پڑی۔ جمالی اسے بڑے غور سے دیکھا کیا : جہاں گٹھلی گری تھی وہاں ایک درخت کھڑا ہوگیا ــــ ایک نوخیز چمکیلا پودا، ایک خوبصورت سبز چھتری۔ پھر وہ شیریں سے کہنے لگا :۔

"کیا حماقت ہے ــــ میں شکلوں میں سوچنے لگا ہوں! گویا میری فکر اور خیال کے لئے قدرت کے سب قانون ختم یا معطل ہوگئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ پانچ سال میں اس جگہ خوبانی کا ایک درخت کھڑا ہو، یہ فطرت کا قانون ہوگا۔ لیکن اسکے خلاف مجھے وہ درخت

قدرتی نشوونما سے پہلے ہی نظر آرہا ہے۔ اسے تم حماقت نہ کہو گی تو کیا ہو گی! میں شاید ایک معلمی، ایک آئیڈیالسٹ ہوا جارہا ہوں!"

خوبانی کا رس چوستے ہوئے شیریں نے جواب دیا:۔

"محبت کی جادوگری مشہور ہے!"

پردہ بدل جاتا ہے۔ شیریں پلنگ کے تکیوں پر بیٹھی جمالی کی منتظر تھی۔ جمالی کمرے میں داخل ہوا تو شیریں اس سے لپٹ گئی۔ دونوں کے چھوٹے سنہری بالے پڑے ہوئے تھے، شب خوابی کے کپڑوں میں شیریں کتنی نازک اور کتنی لذیذ معلوم ہوتی تھی! ان کی پہلی ہم آغوشی ایک طوفان تھا! شیریں کے گلے کا لاکٹ اسکے بالوں میں جا الجھا۔ پھر جب وہ نرم تکیوں کے سہارے لیٹ گئی تو معلوم ہوتا تھا کہ دم توڑ رہی ہے! جمالی کا سر آہستہ آہستہ جھکنے لگا۔

"بتی گل کردو" شیریں نے دھیمی آواز میں کہا۔

جمالی دروازے کے رخ لیٹا ہوا تھا۔ دروازہ بڑھ کر جمالی کے قریب آگیا۔ وہ سوچنے لگا:۔

"پردے کے چھاپوں کے دو مختلف وجود ہیں لیکن اس بات کی طرف کسی کا دھیان نہیں جاتا۔ یہ چھاپے بھی معمولی قسم کے مگر رات میں ان کی ہستی دوسری ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھید نیند آجانے کے دو چار ہی منٹ پہلے کھلتا ہے! غور سے دیکھئے یہ چھاپے اچانک بڑے بڑے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز ابھر آتی اور پھر صورت بدلتی رہتی ہے!

جمالی کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور نیند کی اس حالت میں وہ اپنے بچپن کے بعض جوش انگیز واقعات کے دھیان میں کھو گیا۔ یہ واقعات بھی جن کے دھیان میں جمالی الجھا ہوا تھا، شکلیں بدلنے لگے اور اس حالت و کیفیت میں جمالی نے اگر کوئی چیخ نہ ماری تو اس کا سبب صرف یہ تھا کہ ایک چیز جو شکل بھی اختیار کر رہی تھی، وہ بھی جانی پہچانی ضرور ہوتی تھی۔ گویا یہ تبدیلی کسی قطعی قانون کے تحت ہو رہی تھی! کیونکہ جو شکلیں سامنے آرہی تھیں وہ ایک دوسرے سے متعلق ہوتی تھیں۔ یا پھر اسکے چیخ نہ مارنے کی وجہ یہ ہو گی کہ پردوں کے چھاپے جو ہار گجھوں کی شکل کے تھے بھیڑ بکریوں کی صورت اور کبھی کھانا پکانے والی ماما کی شکل اختیار کر رہے تھے۔ اس تغیر نے شاید اسے بالکل بھوچکا کر دیا ہو!

آنکھیں بند کئے ہوئے شیریں نے کروٹ لی اور باہیں جمالی کی گردن میں ڈالتی ہوئی بولی:۔

"تمہارے بیلے کا گز!"

اسکے جواب میں جمالی نے اسے اپنی طرف گھسیٹ لیا اور نیند سے بھاری آواز میں کہنے لگا:۔

"اور یہ گرگٹ!"

بہت سویرے جب آنکھ کھلی اور جمالی نے ادھر ادھر نظر ڈالی تو چیخ پڑا، یا یوں کہئے کہ اسکے گلے سے ایک زوردار الاپ جاری ہو گئی۔

جمالی اور شیریں کی ملاقات ہونے کے بعد سے دنیا میں ایک تبدیلی آگئی تھی جو اس رات کو مکمل ہو گئی۔ چنانچہ جمالی جاگا تو دنیا ہی دوسری تھی۔ صبح کا سورج جگمگا رہا تھا۔ کھڑکی کی دہلیز پر جو گملا رکھا تھا اس میں رنگ رنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے۔

شیریں ابھی تک جمالی کی طرف پیٹھ کئے ہوئے، پاؤں سکیڑے کمان بنی سو رہی تھی۔ جمالی کی نظر اسکی ریڑھ پر پڑی تو وہ سوچ میں پڑ گیا کہ اسے چھوٹی بوئی کا گنا کہے یا للا کا بید۔

اس بدلی ہوئی دنیا کی ہر چیز جمالی کو اکسائے دے رہی تھی، ہر شے ایک جال اور پھندا بن گئی تھی۔ وہ اٹھا، کپڑے پہنے مگر
۵۳ اسکے قدم زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ وہ زمین کی کشش کے اندر رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیونکہ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اسکے اندر سے وہ بوجھ غائب ہے جس سے وہ زمین پر قائم رہ سکتا ہے اور چونکہ وہ اس بدلی ہوئی دنیا کے قانون سمجھتا نہ تھا اس لئے اسے پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ڈر رہا تھا کہ اگر ذرا بھی غلطی ہو گئی تو لو لو بولا دیا جائیگا، تالی پٹ جائیگی اسے خوف تھا کہ کسی چیز کو چھوا چھیڑا تو نہ معلوم کیا خطرہ سامنے آجائے! اسے ڈر تھا کہ کمرے میں شیر نہ گھس آئے اور وہ ایسے خیال کو دور کرنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔

اچانک اسکی نظر دروازے کی طرف اٹھ گئی اور ایک بھڑ لال پیلی لکیروں والی خونی بھڑ اندر آتی دکھائی دی۔ جمالی چیخ پڑا:۔

"شیریں، شیریں، شیر!"

شیریں چونک پڑی، گھبرا کر پلنگ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بھڑ سنگار میز کے آئینے سے جا چمٹی تھی اور وہاں سے شیریں کی طرف لپکی۔ شیریں نے بدحواس ہو کر اسے جھاڑا۔ بھڑ اور شیریں کے بندے فرش پر بکھر گئے۔ جمالی نے ایک بندے کو اپنے جوتے سے دبا کر خوب زور سے کچل ڈالا۔ شیریں نے اصلی بھڑ کے اوپر تکیہ ڈال دیا۔

حب جمالی شیریں سے رخصت ہوا اور ایک نے دوسرے سے خدا حافظ کہا تو ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ لیکن جس عالم میں یہ کلمے وہ جھونکا طوفان کا مترادف تھا۔ ہوا سے باہر کا دروازہ کھل گیا اور اس سے جو آواز پیدا ہوئی وہ کچھ دھونوں کے گانے سے ملتی جلتی معلوم ہوئی کمرے کے اندر ہوا نے اس تکیے کو اُلٹ دیا جسکے نیچے شیریں نے بھڑ کو دبا دیا تھا۔ ہوا کی سرسراہٹ میں ہنسی کا سا انداز محسوس ہوا اور شیریں کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ پھر ہوا سے شیریں کی ساری اُلٹ کر اس کے سر اور مُنہ سے لپٹ گئی۔

خدا حافظ پھر کہا اور سُنا گیا۔ جمالی زینے سے اُترا تو اتنا خوش و خرم کہ زینہ اُترنے کا احساس بھی نہ ہوا۔ البتہ سڑک پر پہنچکر اسے خیال ہوا کہ یہ سب کچھ نظر یا حواس کا دھوکا نہ تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ اس وقت بھی ہوا میں اُڑ رہا ہے، محبت کے پروں سے اُڑ رہا ہے! ایک مکان کے اندر کوئی کہہ رہا تھا:۔

"وہ اُڑ رہا تھا اور اس کی کمیز تتلی کی طرح چکر کھا رہی تھی۔ اسکے ہونٹوں پر بخار کی پپڑی جمگئی تھی اور وہ ہر چیز کو حقیر دیکھ رہا تھا...."

دوپہر ہوئی تو جمالی پھر پارک کے اندر ٹہل رہا تھا۔ شیریں کی محبت
54 اور اس محبت کی مسرت نے شاید اسے خستہ کر دیا تھا۔ جب وہ ایک بینچ پر لیٹا تو نیند آگئی۔ دھوپ کی تیزی سے اسکے چہرے پر پسینہ نمودار ہوگیا مگر وہ سوتا ہی رہا۔

پھر جب آنکھ کھلی تو سامنے ایک اجنبی آتا دکھائی دیا۔ اسکا لباس پادریوں کا سا تھا۔ سر پر کالا ہیٹ تھا اور آنکھوں پر نیلا چشمہ گردن ایک طرف کو جھکی ہوئی تھی۔ وہ آیا اور سامنے والی بینچ پر بیٹھ گیا اور پھر ذرا ٹھہر کر جمالی سے مخاطب ہوا:۔

"میرا نام آئزک نیوٹن ہے!" نیلے رنگ کی عینک میں سے دُنیا اسے نیلگوں دکھائی دے رہی تھی۔ ایسی نیلگوں جیسی فوٹو کی تصویریں بنائی جاتی ہیں۔ جمالی نے نیوٹن کا نام سُنتے ہی بڑے ادب سے سلام کیا۔ ظاہر ہے کہ سلام انگریزی یعنی "گڈ مارننگ" تھا۔

مشہور سائنسداں اس طرح اُکھڑا اُکھڑا بیٹھا تھا جیسے کیلوں کے اوپر بیٹھا ہو۔ اسکی ساری توجہ جمالی پر صرف ہو رہی تھی اور رہ رہ کر اس کا کان بھی پھڑک رہا تھا۔ پھر وہ اُنگلی سے اس طرح اشارے کرنے لگا جیسے کسی غیبی بینڈ باجے کی ماسٹری کر رہا ہو۔ اس وقت فطرت بھی سانس روکے ہوئے محسوس ہوتی تھی اور معزز سائنسداں فطرت کی اس خموشی کو سُنتا معلوم ہوتا تھا۔ جمالی نے زمین کی طرف دیکھا تو اسے کنکروں میں سے باجے کی آواز سُنائی دی۔ نیوٹن نے اچانک کہا:۔

"وہ دیکھو ۔۔ کچھ سُن رہے ہو؟" پھر جمالی کی کمر میں ہاتھ ڈالدیا اور یہ دونوں گھاس کے فرش پر ٹہلنے لگے۔ نرم گھاس پر نیوٹن کے لانبے بوٹوں کے نشان بن رہے تھے۔ ان دونوں کے آگے آگے ایک گرگٹ دوڑا جا رہا تھا۔ جب وہ ایک کنج کے بیچ میں سے گزر کر نکلے تو نیوٹن کی عینک کے کناروں پر سارس کے پروں کا غبار جما دکھائی دیا۔ جمالی نے اس درخت کو پہچان لیا جسے اس نے برسوں دیکھا تھا اور بیساختہ کہہ اُٹھا:۔

"خوبانی کا پیڑ!"

"نہیں، سیب کا!" نیوٹن نے سخت لہجے میں کہا۔ اور پھر کمر کو ہاتھ کا سہارا دیکر پیچھے کی طرف جُھکا تاکہ ریڑھ کو ذرا آرام ملے۔ اسکے ہاتھ میں ایک سیب تھا۔ وہ جمالی کو دکھا کر کہنے لگا "سمجھے اس کا مطلب کیا ہے؟"

جب جمالی نے کوئی جواب نہ دیا تو نیوٹن نے ٹھنڈی سانس بھری اور رغنا لہجے میں سوال کیا:۔

"بتا سکتے ہو کہ لوگ گر کیوں پڑتے ہیں ۔۔ ان کے گر جانے کا کیا سبب ہے؟"

جمالی چپ رہا اور نیوٹن کے ہاتھ میں اس سیب کو دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر انتظار کر کے نیوٹن نے پھر پوچھا:۔

"صاحبزادے، سُنا ہے آج تم اُڑ رہے تھے!" نیوٹن کی بھویں تن گئی تھیں "تم تو مارکس کے ہیرو ہو؟ اور تم اُڑ رہے تھے!"

بھورے سے رنگ کا ایک بھونرا نیوٹن کی انگلی پر سے رینگتا ہوا سیب کے اوپر چڑھ گیا۔ نیوٹن کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ بھونرا اس کو نیلے رنگ کا دکھائی دے رہا تھا۔ پھر نیوٹن کی شکل ٹیڑھی دکھائی دینے لگی بھونرے نے پر کھول دیے جنہیں وہ دُم کے نیچے دبائے ہوئے تھا۔

"ہوں تو آج تم اُڑے تھے!" نیوٹن نے پھر دوہرایا مگر جمالی پھر بھی چُپ رہا۔

"گدھا!" نیوٹن نے جھلا کر کہا۔

جمالی کی آنکھ کھل گئی۔

"گدھا!" شیریں کہہ رہی تھی اور بھونرے کے فولادی پیٹ کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

"لاحول ولا قوۃ!" آنکھ کھلتے ہی جمالی نے کہا "اوہو!

میں اُسے بس ایک بھونرا سمجھتا تھا! پھر کہنے لگا جب سے ہم ملے ہیں میری نظر کو کچھ ہوگیا ہے — آم نیلے دکھائی دیتے ہیں۔"

شیریں اس سے چمٹ جانا چاہتی تھی۔

"الگ! چھوڑو! مجھے چھوڑ دو! میں تنگ آگیا ہوں..."

یہ کہتا ہوا جمالی وہاں سے اس طرح بھاگا جیسے اپنی پرچھائیں سے ڈر رہا ہو۔

جب سانس چڑھ گئی اور وہ رُکا تو شیریں کا دور دور پتا نہ تھا۔ اب اسے یہ احساس ہوا کہ جو دُنیا ہاتھ سے نکل گئی ہے سب کچھ دے کر بھی اسے حاصل کر لے۔ مگر دل کہہ رہا تھا کہ وہ دُنیا اب نہ مل سکے گی۔ دل ہی میں اس نے شیریں کو "خدا حافظ" کہہ لیا۔ اور خستہ و مایوس ایک ڈھلوان جگہ پہ بیٹھ گیا۔ دور تک کا منظر سامنے تھا۔ چھوٹے چھوٹے مکان ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے نگینے جڑے ہوں۔ سڑک پر شربت فالودے والا ٹھیلہ لئے کھڑا تھا۔ بوتلوں کے لال پیلے اور ہرے رنگ جمالی کی حالت اور کیفیت سے مشابہ تھے۔ وہ اپنے آپ سے کہنے لگا:—

"میں جنّت میں جی رہا ہوں!"

اچانک پیچھے سے آواز آئی:—

"کیا سچ مچ تم مارکس کے پیرو ہو؟"

یہ آواز اسی رنگندھے کی تھی۔ وہ آکر جمالی کے برابر بیٹھ گیا۔

"ہاں میں مارکسی ہوں!" جمالی نے جواب دیا۔

"ایک مارکسی اور جنّت!"

"دُنیا ہی جنّت بن گئی ہے۔ اسکو کوئی کیا کریگا!"

رنگندھے نے سیٹی بجائی اور ہاتھ میں جو ٹہنی تھی اس سے کان کھجانے لگا۔

جمالی کہتا رہا:—

جانتے ہو آج میں نے کیا کیا؟ میں آج اُڑ تا رہا ہوں!"

ان کے سروں پر ایک پتنگ سرسرانے لگی تھی۔ جمالی نے اسکی طرف اشارہ کر کے کہا:—

"میں وہاں پہنچ سکتا ہوں — دکھاؤں اپنا اُڑنا؟"

"شکریہ مگر مجھے گوارا نہیں تم سے سنجیدہ آدمی کی لُو لُو بولی جائے!"

جمالی نے کہا:—

"سچ مچ؟"

"ہاں چند رنگوں کے سوا تمہاری دنیا میں ہر چیز مقرّر اور قائم ہے —

پر تم جنّت کی زندگی سے بھی تو بے بہرہ ہو! دُنیا تمہیں چھوڑ نہیں سکتی۔ رہی میری حالت سو تم مجھے مادہ پرست سمجھتے ہی ہو — لیکن اکثر میری آنکھیں فطرت کے خلاف، سائنسی اصول کے خلاف، اینڈی بینڈی چیزیں دیکھنے لگتی ہیں!"

"بات تو اچھی نہیں — مگر کیا کیا جائے تمہیں محبّت ہوگئی ہے!"

جمالی نے جوش میں رنگندھے کا ہاتھ پکڑ کر خوب دبایا اور کہنے لگا:—

"ہاں صحیح! لیکن سُنو۔ تم اپنی قرار واقعی دُنیا مجھے دیدو اور بدلے میں میری محبّت لے لو!"

رنگندھا اُٹھ کر چلنے لگا اور جاتے جاتے بولا:—

"مجھے افسوس ہے، مگر ایک ضروری کام یاد آگیا، خدا حافظ — اپنی جنّت میں جیتے جاؤ!"

وہ ڈھال پر سے اُترنے لگا تو پاؤں پھسلا اور گر گیا گرنے میں اسکی ٹانگیں قینچی کے پھلوں کی طرح کھل گئیں۔ وہ اُٹھا اور پھر چلا۔ وہ خوشی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے اپنی انگلیوں کو چوم کر وہ بوسہ جمالی کی طرف پھینکا اور کہنے لگا:—

"اپنی جنّت سے میرا سلام کہنا!"

رنگندھے [illegible] بعد جمالی نے باغ کا کونا کونا ڈھونڈ ڈالا کہ کہیں شیریں مل جائے۔ وہ علوم فطرت کا ماہر تو تھا نہیں کہ درختوں کی پہچان کرتا، وہ تو بس ان کے نیچے سے نکلتا پھر رہا تھا۔

شیریں اپنے کمرے میں سُرخ رنگ کے فرغل میں لپٹی سو رہی تھی۔ جمالی اس کی سانسوں کی آواز سُن رہا تھا۔ وہ بھی لیٹ گیا اور سر کو شیریں کے سینے پر رکھ دیا۔ پھر اسے شیریں کی سانسیں بھی سُنائی نہ دیں۔

اچانک ایک جھاڑی کے اندر سے رنگندھا پھر نمودار ہوگیا اور جمالی سے بولا:—

"سُنتے ہو ــــ"

"نہیں، نہیں، یاں نہ آنا ــــ اُلو کہیں کا!"

جمالی نے غصے سے کہا ۔

"سُنو تو! مجھے منظور ہے! میری ماڈی اور سٹڈی ہوئی دُنیا تم لے لو اور اپنی محبت مجھے دیدو!"

"جاؤ، اور کہیں بیٹھ کر نیلے آم چوسو! آیا ہے کہیں سے!" جمالی نے جواب میں کہا ۔

(مختار)

(بقیہ مضمون صفحہ ۷۲)

حفاظت ایک لازمی اور ازلی فرض ہے تو تم سے یہ چوک کیوں ہوتی؟

بیٹوں کی شدید جھڑکی پر ماؤں کا ضمیر اُن سے کہہ رہا تھا اور مائیں اپنی اپنی جگہ ساکت تھیں، بیٹے نے پھر اپنے گھونگریالے بالوں کو ایک جھٹکا دیا اور بولا

ایک وہ دیویاں تھیں اور ــــــــ

"شانتی" ماؤں نے آگے بڑھ کر کہا۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ دیس کی محبت اور اسکی چنگاری تمہارے سینے ہی کو پھونک رہی ہے۔ نوجوان بہادر! اگر ایک لمحے کیلئے تم کو ماں بنا دیا جائے تو تم بھی ایسے ہی ہو جاؤ جیسے کہ ہم تھے۔ لیکن اب ہم نے اپنی کمزوریوں پر فتح پالی ہے اور تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہم راجپوتوں، افغانوں، عربوں اور مغلوں ہی کے پیٹ سے پیدا ہیں۔

پیارے جگر کے ٹکڑو! دھن باد ہو، رحمت ہو تم پر۔ موت تمہارے

۵۶ گھوڑوں کے سموں کے نیچے دبی ہوئی سسک رہی ہے اور زندگی تمہاری رکاب بردار ہے، دیکھو ہمارے جوڑے سنور گئے۔ دیکھو گزرے ہوئے زمانوں کی یاد نے ہمیں پھر جوان کر دیا ۔

(۴)

تھوڑی دیر کے بعد مجاہدین کی بہنیں نوجوان بھائیوں کو سامانِ جنگ اُٹھا کر دے رہی تھیں۔ . . . .

. . . . . . ماؤں نے پُرجوش انداز میں کہا گھوڑوں کو تیار کرو ــــــ

تیرے ابا کی تلوار کہاں ہے؟ میری کمر پر باندھ، تیرے چچا کا نیزہ کدھر ہے مجھے لا، خون رگوں سے اُچھلا پڑتا ہے۔ ہم اپنے باغ سے کسی کو پتی بھی نہ لیجانے دینگے اور باغ پر ڈاکہ ڈالنے والے قزاقوں کو نکالکر دم لیں گے ہم خاموشی سے موت کی نیند سو جائینگے لیکن موجودہ زندگی کو گوارا نہیں کرینگے آہ اپنے چمن کی تباہی ہم سے نہ دیکھی جائیگی۔ ہاتھوں میں نظر نہ آنے والی ہتکڑیاں، پاؤں میں دکھائی نہ دینے والی بیڑیاں ــــــ یہ ہم نہیں پہنیں گے ــــــ مر جائینگے مگر نہیں پہنیں گے۔

جوشیلی ماؤں نے تلوار اور رائفل اُٹھالیں اور دروازے کی طرف بڑھیں، نوجوان بیٹے بڑھے اور قدموں پر گر پڑے۔

اے مقدس ماؤ! تم پر تمہارے بیٹوں کی جانیں نثار! ہمارے کبھی اپنی ماؤں کو میدانِ جنگ میں آگے نہیں دیکھتے: نیستی کے سمندر میں سب سے پہلے ہم کود دینگے۔ ہمارے گھوڑے بحرِ ہستی کی موجوں کو اپنے سینے کے جوان رگ پٹھوں کی تیار قوت سے دھکا دینگے اور جب ہمارے آسودہ ساحل ہونے کی خبر تم تک پہنچے تو ہنستی ہوئی تم آنا۔ میدان میں تمہارے گھوڑوں کی ٹاپوں سے اُڑی ہوئی خاک دیکھ کر ہم سمجھ جائینگے کہ مجاہد مائیں آ رہی ہیں اور آنے کے بعد تو تم زخموں سے چور اجسام کو خود ہی دیکھ لوگی ــــ مگر ہوا! تم ہمارے چہرے کو خاک و خون میں آلودہ ہونے پر بھی پہچان لوگی؟ تم ہماری بے گور و کفن لاش کو بھی پہچان لوگی؟

مجاہدین نے ہنس کر کہا بس نعروں کو بلند کرو، اور رنگا رنگ جھنڈے کو لہرا دو۔ ماؤں نے بیٹوں کو کلیجے سے لگایا بہنوں نے ٹیکا دیا۔ اور کہا خدا کے سپرد۔ جاؤ کھیتوں کی مینڈوں پر شاما الوداعی گیت گا رہی ہے۔

تلواریں میان سے نکال لو ــــــ لڑکیو دروازہ بند کر لو ۔

مجاہد بیٹوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور قلعہ سے باہر ہو گئے جھروکے سے گردنیں نکال کر ماؤں نے کہا :۔

سُنو بیٹو! اس دروازے کا کھلنا اس وقت تک ناممکن ہے جبتک یہ باغ آزاد اور محفوظ نہ ہو جائے۔ شراب اور دودھ تم پر اس وقت تک حرام ہے جبتک ایک ایک پھول ظالم صیاد کے ہاتھوں سے آزاد نہ ہو جائے۔ اگر راجپوتوں، افغانوں، عربوں اور مغلوں کے نام لیوا ہو تو زندہ واپس نہ آنا ورنہ یہاں سوائے راکھ کے تم کو کچھ نہیں ملے گا ۔

مجاہد بیٹوں نے چمکتی ہوئی تلواریں بلند کیں اور "بغاوت کی جے" کا نعرہ لگاتے ہوئے ریتلے ٹیلوں کے سلسلے میں غائب ہو گئے مائیں سینہ دبا کر بیٹھ گئیں۔

آخری سلام قبول ہو چکا تھا۔ گھوڑوں کی ٹاپوں سے اُڑی ہوئی خاک بھی شبنم نے دبا دی تھی۔

("شاں")

رام پرتاب بہادر ایم۔ اے

کوڑھی کی موت

آدمی کی خوشی کی دو منزلیں ہوتی ہیں۔ پہلی منزل وہ جبکہ انسان اپنی خوشی کا موضوع پاکر کہیں بھی اور کسی بھی حالت میں خوش ہولے اُسکے بعد اُسے دُنیا کی مختلف پوشاکیں پہنا کر اُس سے خوشی حاصل کرنا چاہتا ہے۔

شادی ہونے کے بعد کچھ دنوں تک گویا میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ میں کہاں ہوں اور مجھے کیا چاہیئے بلکہ یہ کہیئے کہ میں اپنی خوشی سے اتنا خوش تھا اور اُس میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ دُنیا اور اُس کی نعمتوں کی ضرورت ہی نہیں محسوس کرتا تھا۔ لیکن وہ اچھے دن کچھ ہی دنوں تک رہے۔

اُسکے بعد میں اپنی بیوی کے ہمراہ اکثر سینما دیکھنے جانے لگا۔ کبھی کبھی شہر کے باہر دور تک اُن کے ساتھ تفریح کی خاطر چلا جاتا۔ ایک دو بار دریا کی طرف بھی سیر کرنے گیا۔ غرضکہ اپنی خوشی کا "بینک بیلنس" تیزی کے ساتھ گھٹتا دیکھ کر ایسی نقلی چیزوں سے مدد لینے لگا جیسے گراموفون، ہارمونیم، آئس کریم وغیرہ وغیرہ دوستوں کی صحبت میں تاش کھیلنا ہنسی مذاق کرنا تو عام تفریح تھی مختصر یہ کہ ازدواجی زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے کیا کچھ میں نے نہیں کیا۔

لیکن وہ ایک ایسی عارضی خوشی تھی جو باوجود میری ساری کوششوں کے آئے دن دم توڑ رہی تھی۔ کبھی کبھی تو میرا جی بالکل اُچٹ جاتا اور میں بے چین ہونے لگتا۔ گھر والے پہلے ہی گاؤں جانے کو کہہ رہے تھے۔ اب میں نے بھی اُن کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے طبیعت بدلنے کے خیال سے گاؤں جانا طے کیا۔ چنانچہ ایک دو روز بعد شہر سے آرام اور آسائش کی چیزوں کا ایک انبار اکٹھا کرکے دیہات کے لئے ہم لوگ روانہ ہوئے۔ جبتک ریل گاڑی سوار رہے تب تک تو شہر سے کوئی ایسا تعلق نہیں ٹوٹا لیکن جب گاڑی سے اُترنے کے بعد میرا سارا شہری لاؤ لشکر گاؤں کیلئے بیل گاڑی پر لدنے لگا تو وہ منظر مجھے کسی قدر بے تُکا سا نظر آیا۔ اور جب بیل گاڑیوں پر لدے پھندے ہم لوگ جنگل کے راستے سے ہوکر گزرنے لگے تو میرے اندر اک ناقابلِ برداشت ہنسنے کا جذبہ سا پیدا ہونے لگا۔ لیکن دراصل اپنی چھاؤنی کے مکان پر پہنچکر میں نے مکمل طور پر اپنے کو دیہات میں محسوس کیا۔ گراموفون بجتے بجتے جب خاموش ہوجاتا تو بیلوں بکریوں اور گنواروں کی آوازوں سے میرے کان بجنے لگتے۔

دوپہر کے وقت برآمدے میں میں اکیلا آرام کرسی پر پیر پھیلائے بیٹھا تھا۔ سامنے دروازے پر بائیں طرف غلّہ رکھنے والے مکان کے سامنے دو چار مزدور اپنی مزدوری لے رہے تھے۔ اُسی مکان کے برآمدے میں بڑے بھائی صاحب ننگے بدن کھرّی چارپائی پہ بیٹھے مزدوروں کا حساب کرنے میں مشغول تھے۔ میرے داہنی طرف صحن کے مشرقی حصّے میں مویشیوں کے واسطے "چرن" بنی ہوئی تھی جہاں تقریبًا ۲۰ پچیس بیل، گائیں اور بھینسیں کھڑی نادوں میں سانی کھا رہی تھیں۔ اُن کے سانی کھانے سے فضا میں ایک عجیب بھدّی قسم کی بھنبھناہٹ تیر رہی تھی جس میں نادوں کے آس پاس اُڑنے والی مکھیوں کی آواز بھی شامل تھی۔ بیلوں کی کالی کالی لمبی پونچھوں کی مستقل حرکت کی وجہ سے مکھیاں بیلوں کے نادوں سے سڑی ہوئی کھلی کی بدبو اپنے ساتھ لئے ہوئے ہوا میں چکر کاٹ رہی تھیں۔ اینٹ کے چبوترے پر بُڑھیا ہلواہن ہلیوں کے نیچے سے گوبر ہٹا رہی تھی۔ بھوسا رکھنے کی لمبی کوٹھری اور بیلوں کے چرن کے درمیان کے تنگ اندھیرے برآمدے میں ہلواہا کسی کے ساتھ گانجے کا دم لگا رہا تھا اور باتیں کر رہا تھا اور سلسلے کے اُس طرف کھیتوں کی لامحدود ہریالی کی خاموش دُنیا ڈھلتے ہوئے سورج کی آخری شعاعوں میں سے زندگی کا رس کھینچ رہی تھی۔

ایک منگتا بھیک مانگتا ہوا دروازے پر آنکلا۔ مزدوروں

کے پاس اپنی جھولی اور ڈنڈا رکھ کر اُس نے بھائی صاحب کے اوپر دُعاؤں کی جھڑی لگا دی اور پھر اُسی وقت خاموش ہوا جب اُسے تسلّی ہوگئی کہ اُسے بھیک ضرور مل جائیگی۔ جاڑے کا موسم عام طور سے دیہات میں لوگوں کے واسطے بیکاری کا وقت ہوتا ہے۔ زیادہ تر لوگ زمینداروں کے ہاں مزدوری کرکے پیٹ پالتے ہیں جن کو یہ بھی نہیں میسّر ہوتا وہ لوگ کھیتوں سے ساگ پات نوچ کھسوٹ کر کھاتے اور جیتے ہیں لیکن ان کے علاوہ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایسی عجیب و غریب ترکیبوں سے روزی کماتے ہیں جو ہم متوسط طبقہ کے بیکاروں کو سوجھ ہی نہیں سکتیں بہت سے بھیک مانگنے کی غرض سے سادھو فقیر بن جاتے ہیں۔ لیکن ان سے بھی زیادہ تعداد میں وہ ہوتے ہیں جو بھیک مانگنے کے لئے اپنی بھوک اور غریبی سے بہتر کوئی اور سند نہیں سمجھتے۔

چنانچہ وہ ایک عجیب منظر ہوتا ہے جہاں ہم غریبوں کو اس قلّاش دُنیا میں بھیک مانگتے دیکھتے ہیں۔ پُرانے زمانے میں موسیقی اور دوسرے فنون راج درباروں کی چیزیں ہوتی تھیں۔ فنون لطیفہ کے ماہر اُن دولت والوں کے سامنے اپنے ہُنر کی نمائش کرکے اپنا پیٹ بھرتے تھے۔ لیکن آج ان بُرے دنوں میں، جبکہ نہ وہ دربار رہے اور نہ فنون لطیفہ کے وہ ماہر، اُن فنون اور کھیل تماشوں کی اگر کوئی نشانی باقی رہ گئی ہے تو دیہاتوں ہی میں اُس کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ بھیک مانگنے والے دیہاتیوں کی مفلسی کے دربار میں اپنا پیٹ پالنے کے لئے اُن فنون کی نمائش کرتے ہیں۔ وہ بھوکے پیاسے منگتے آخر کس محویت کے ساتھ موسیقی کی دیوی کی پوجا کرتے ہیں! اور اُن سے بھی زیادہ اپنے کو بھلا کر غریبی کے مارے دیہاتی اُن کے ہنر کی داد دیتے ہیں اُن دیہاتی گویوں کے مقابلے میں شہر میں رہنے والے علم موسیقی کے اُستاد مجھے ہمیشہ گٹھیا کے مریضوں جیسے لگتے ہیں۔ لیکن میں بار بار سوچتا ہوں کہ آخر ہمارے مٹتے ہوئے قدیم فنون کو بھی پناہ ان غریبی کے ٹمٹماتے ہوئے چراغوں ہی کے نیچے ملی۔

ابھی وہ بھیک مانگنے والا دروازے پر بیٹھا ہی تھا کہ بغل کی گلی سے ایک مداری ڈمرو بجاتا ہوا ایک بندر اور بندرن لئے آ نکلا۔ دروازے پر پہنچ کر وہ نہایت ہی سرگرمی سے اپنی پوری طاقت لگا کر زور زور سے ڈمرو بجانے لگا۔ ڈمرو کی تیز آواز فضا میں کچھ اس طرح گونجی کہ جیسے اُس کی کڑک سے اغل بغل کے کچے مکانوں کی دیواریں کانپ رہی تھیں۔ غرضکہ پوری فضا ڈمرو کی آواز سے کانپ رہی تھی۔ میں بیٹھا بیٹھا ایسا محسوس کرنے لگا کہ جیسے قیامت آگئی۔ ڈاڑھی والے شیوشنکر غصّے میں آکر ڈمرو بجا رہے تھے۔ سارے مویشی کان کھڑے کرکے چونک چونک کر مداری کی طرف دیکھ رہے تھے۔ گاؤں کے سارے بچّے اکٹھے ہوگئے تھے۔ بوکھلائے ہوئے کُتّے بھونک بھونک کر آسمان پھاڑے ڈالتے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے شیوشنکر کا محشر خیز ناچ شروع ہی ہونے کو ہے۔ پوری فضا بے چینی سے کانپ رہی تھی۔ اتنے میں بھائی صاحب کی کڑکتی ہوئی آواز مغربی برآمدے سے آئی۔ ڈمرو ایک دم خاموش ہوگیا۔

لیکن جب بچے اکٹھا ہو چکے تھے تو بندر کا ناچ ہو کر رہتا چنانچہ ناچ شروع ہوا۔ ڈاڑھی والا مداری گاتا ہوا بندروں کو تماشہ کرنے کے لئے اشارہ کر رہا تھا۔ بندریا ایک طرف چھپ کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ سُسرال جانے کو راضی نہیں تھی۔ اس وجہ سے کہ اُس کا شوہر اُسکی آرائش کے واسطے اپنے ساتھ کوئی چیز نہیں لایا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے خاوند سے ناراض تھی۔ لیکن جب مداری نے اس ناراضگی کی بات بندر کے کان میں ڈالدی تو بندر غصّہ سے بے اختیار ہوگیا۔ وہ ڈنڈا ہاتھ میں لیکر کھڑا ہوگیا اور اگر مداری نے بیچ بچاؤ نہ کردیا ہوتا تو بندرن پٹ کر رہتی۔ خیر پھر کسی صورت سے رخصتی ہوئی۔ آگے آگے بندر صاحب کندھے پر ڈنڈا لئے چلے اور پیچھے لہنگا پہنے اوڑھنی اوڑھے اُن کی منکوحہ چلیں۔ اُس بندرن کو دیکھ کر مجھے اپنے ملک کی عورتوں کا سُسرال جانا یاد آیا۔ بالکل وہی پہناوا، وہی چال، وہی خوشی یا رنج اور وہی مجبوری! اگر کوئی فرق تھا تو صرف یہ کہ بندرن چار پیروں سے چل رہی تھی۔

لیکن دراصل اگر کسی بات پر مجھے حیرت ہو رہی تھی تو اس پر کہ آدمی نے جانور کو کچھ سکھایا بھی تو وہ بھی اپنی متاہل زندگی! اور اس سے بھی زیادہ تعجب اس پر ہو رہا تھا کہ آدمی عورتیں اور بچّے کس خوشی سے اس تماشے کو دیکھ رہے تھے۔ وہی کام ہم ہر روز کرتے ہیں لیکن اُس دن بندروں کو اس طرح اپنی زندگی کی نقل کرتے دیکھ کر میں پریشان ہوگیا۔ زیادہ خیال مجھے آتا تھا اُن بندروں کا۔ وہ کیا سوچتے ہونگے؟ شاید وہ ایسا سوچتے ہوں کہ آدمی کو خوش کرنے کیلئے انھیں کی زندگی کی انہیں نقل کرنا پڑ رہی ہے۔ یہ سوچ کر میں اور بھی زیادہ شرمندہ ہوا۔ بندروں

کے ہاتھوں اپنی زندگی کا مذاق اُڑتے دیکھ کر غصّہ بھی آ رہا تھا اور شرم بھی۔ لیکن اُسی وقت مجھے اُس بڑی سچائی یا حقیقت کا خیال آیا جس کے ماتحت ہم نے یہ جاننا سیکھا تھا کہ ہم بندروں سے ترقی کر کے آدمی ہوئے ہیں۔ اگر اُس سچائی کو قبول کرتے ہوئے مجھے کوئی دقّت ہوتی تھی تو اس وجہ سے کہ اپنے اور بندروں کے درمیان تمدّن کی ایک بہت لمبی چوڑی کھائی مجھے ہمیشہ نظر آتی تھی۔ لیکن آج اُن شائستہ بندروں کو اپنی انسانی تہذیب کی نقل اُتارتے دیکھ کر میں نے قطعی قبول کر لیا کہ وہ ضرور ہمارے بُزرگ رہے ہوں گے۔

بندر کا ناچ ختم ہو چکا تھا لیکن اُس کا زیادہ اہم حصّہ اب شروع ہونے کو تھا۔ مداری کا پھٹا ہوا انگوچھا زمین پر بچھ گیا ڈمرو پھر بجنے لگا۔ بچّے اور عورتیں مختلف قسم کے اناج لا کر اُس پھیلے ہوئے کپڑے پر ڈال رہی تھیں۔ مداری للکار للکار کر بھیک مانگ رہا تھا۔ اور میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ بیکاری دور کرنے کی یہ بھی ایک عجیب و غریب ترکیب ہے۔ چونکہ یہ ایک انسانی فطرت ہے کہ تماشہ ہر کسی کو اچھا لگتا ہے اس لئے مداری دیہات کے غریبوں کے درمیان بھی بندر نچا کر اپنا پیٹ بھر لیتا ہے۔ دفعتہً عورتوں کو شرما کر بھاگتے اور بچّوں کو تالیاں پیٹ کر ہنستے دیکھ کر میری نظر بندروں کی طرف گئی۔ میں نے دیکھا بندر اور بندرن یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ ہماری شادی سے تعلّق رکھنے والی رسموں کے قائل نہیں۔ بندروں کو اُس حالت میں دیکھ کر میں نے اس کا اندازہ لگایا کہ ہمارے اجداد کی جنسی زندگی کس قسم کی رہی ہو گی۔

یوں تو سورج نظر نہیں آ رہا تھا لیکن ابھی شام ہونے میں کافی دیر تھی۔ اصل میں جاڑے کی شام ایسی ہوتی ہی ہے ہر اُسی کُرسی پر پڑا کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ میری بی بی کے آجانے سے میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ میری نظر صحن میں پڑے ہوئے گوبر پر سے اُٹھ کر اُن کے اوورکوٹ کے سمور پر گئی اپنا اوورکوٹ اُن کے ہاتھ میں دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ اُن کا ارادہ ٹہلنے جانے کا تھا۔ میں برآمدے سے اُتر کر چلنے ہی کو تھا کہ گھر میں سے اور لڑکیاں اور بچّے جاڑے کے کپڑے پہنے نکل پڑے۔ اُن سب کو ساتھ لیکر میں ٹہلنے چلا۔ کھلیان سے آگے نکل کر میں کھیتوں کی مینڈ پر ہو کر چلنے لگا۔ بچّے آگے دوڑتے ہوئے چلے جا رہے تھے

میری بی بی میرے پیچھے اور لڑکیوں کے ساتھ تھیں۔ میں ہریالی پر نظر دوڑاتا ہوا اِدھر اُدھر کی باتیں سوچتا چلا جا رہا تھا۔ سرسوں کے پیلے پیلے پھول آپس میں گھل مل کر ایسے جھوم رہے تھے جیسے گیت گا رہے ہوں۔ مجھے اپنی بی بی کا صبح کو بھیروں گانا یاد آیا مٹر کی کھیتی چھیموں کے گھمنڈ سے پھولی نہیں سماتی تھی۔ گیہوں اور جَو کے پودے اپنے تیز ٹونٹوں سے اپنی حفاظت کر رہے تھے۔

چلتا چلتا میں اپنے فارم پر پہنچا۔ گنّے کی اونچی فصل کھڑی تھی۔ اتنی اونچی کہ ہاتھی بھی اُس میں کھو جائے۔ لیکن بیچ بیچ کی کیاریوں سے ہو کر آدمی بہ آسانی آر پار آجا سکتا تھا۔ بچّے ہنستے اور شور و غل مچاتے ہوئے منع کرنے کے باوجود گنّے کے کھیت میں غائب ہو گئے۔ بچّوں کا ساتھ دینے کی غرض سے ہمیں بھی اُنہیں گھنی کیاریوں سے ہو کر چلنا پڑا۔ بچّے بھاگتے ہوئے دُور آگے نکل گئے تھے۔ حالانکہ گنّے کی گھنی تیز پتّیوں سے بچتے ہوئے جھک جھک کر میں چل رہا تھا لیکن بار بار جی یہی چاہتا تھا کہ بچّوں کے ساتھ میں بھی بھاگ نکلوں۔ اگر بھاگنے سے کوئی روکتا تھا تو وہ میری بی بی کی موجودگی تھی جن کا شہر کی شائستگی میں گزرا ہوا ماضی اس قسم کی دوڑ دھوپ کی اجازت نہیں دے سکتا تھا لیکن شاداب قدرت کی گرفت میں آکر اُن کی بھی طبیعت کسی قدر ہری ہو رہی تھی۔ تیز چلتی ہوئی مجھ سے پہلے ہی وہ بیچ فارم میں پہنچیں۔ بچّے وہاں پہلے سے موجود تھے۔ لیکن وہاں پہنچ کر اُن سب کو مایوسی ہوئی ..... فارم کی چھاؤنی بند ہو چکی تھی۔ کام کرنے والے مزدور اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ پتھر کی حوض میں پانی خاموش آسمان کو آئینہ دکھا رہا تھا۔ پانی کا انجن چُپ چاپ انجن گھر میں آرام کر رہا تھا۔

پھر بچّے آنکھ مچولی کھیلنے پر آمادہ ہو گئے۔ میری بی بی نے بھی کھیل میں حصّہ لینے کی خواہش ظاہر کی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بچّوں کی صحبت میں اُن کا سویا ہوا لڑکپن جاگ اُٹھا ہو۔ میرا جی تو کبھی سے دوڑنے بھاگنے کو چاہ رہا تھا لیکن جب بھی دوڑنا چاہتا تو ایسا محسوس کرتا جیسے ایک پیر سے لنگڑا ہو چکا ہوں دراصل اپنی شادی کے بعد میں ہمیشہ ایسا محسوس کرتا تھا جیسے میں ہمیشہ ایک پیر اپنی بی بی کے دوسرے پیر سے باندھ کر زندگی میں مستقل وہ دوڑ دوڑ رہا ہوں جو پڑھائی کے زمانے میں

بارہ دسمبر کے کھیل کود کے دن کبھی کسی لڑکے کے ساتھ اپنا ایک پیر رومال سے باندھ کر دوڑا تھا۔ لیکن آغوشِ قدرت میں اپنی بی بی کی روح کی کلی کو کھلتے دیکھ کر میں نے ایسا محسوس کیا جیسے میرے دونوں پیر یک بیک آزاد ہو گئے ہوں۔ پھر بچّوں کے ساتھ کھیل میں ہم دونوں ایسے گھل مل گئے کہ بچے بھی ہمیں اپنے سے الگ نہیں سمجھتے تھے حالانکہ حقیقت میں ہم دونوں بچّوں کے درمیان الگ ہی ایک کھیل کھیل رہے تھے جسے بچّے ہرگز نہیں سمجھ سکتے تھے۔

اب روشنی بالکل باقی نہیں رہی تھی۔ شام ہو چکی تھی۔ اندھیرا ہونے کو آیا۔ بچّے تھکے ہوئے بھیڑوں بکریوں کے جُھنڈ کی طرح شام ہوتے ہوتے پر کچی سڑک پکڑے لوٹ رہے تھے۔ سڑک چوڑی تھی لیکن برسات میں بیل گاڑیوں نے اسکی ایسی گت بنا دی تھی کہ اب سیر چلنا دشوار تھا۔ جگہ جگہ گڈھے تھے اور راستہ نہایت ہی ناہموار تھا۔ اس لئے ہم لوگ اصل سڑک چھوڑ کر کنارے کنارے کھیتوں کی مینڈ پکڑے لوٹ رہے تھے۔ حسب عادت بچّے اب بھی آگے ہی آگے بھاگتے دوڑتے چل رہے تھے۔ ہم دونوں کچھ آپس کی بات چیت میں مشغول تھے کہ اتنے میں میں نے دیکھا۔ بچّے میری طرف واپس لوٹے آرہے ہیں۔ اُن میں سے ایک نے پہلے ہنچکر ہانپتے ہوئے سہمی آواز میں بتایا کہ آگے سڑک کے کنارے ایک جوڑی چپّل پڑی ہے اور کوئی آدمی کھیت میں سویا ہوا ہے۔ لڑکے کی زبان سے یہ بات سنتے ہی میرے کان کھڑے ہوئے۔ اس جاڑے کے موسم میں شام کے وقت کھیت میں کون سویا ہوا ہو سکتا ہے! بچّوں کے علاوہ اپنی بی بی کے واسطے مجھے زیادہ تشویش پیدا ہوئی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ نہایت کمزور دل کی عورت ہیں' اپنا سایہ دیکھ کر تو ڈرتی ہیں۔ آخر ان کے اوپر کیا بیتے گی! بچّوں کو اُنگلیاں پکڑائے سب کو ہمراہ لئے نظریں نیچی کئے میں دھیرے دھیرے سڑک پر چل رہا تھا۔

بچّوں سے نظر پوشی کرتے ہوئے آہستہ سے میں نے داہنے طرف دیکھا' موٹر کے ٹائر کے دو پھٹے پُرانے ٹکڑے پڑے تھے۔ چمڑے کی جگہ اُس میں پُرانی رسّیاں لگی تھیں اور رسّیوں میں چیتھڑے لپٹے تھے۔ کوڑھی کی چپّل! میرا دماغ چیخ اُٹھا۔ اتنا زور زور سے میں سوچ رہا تھا کہ اپنی باتیں کانوں میں سُنائی پڑ رہی تھیں۔ دماغ سے گزرتے ہوئے خیالات کو اپنے کانوں سے سُن کر میں خود ڈرنے لگا۔ کھیت میں ایک آدمی سویا ہوا تھا۔ اُسکے سرہانے ایک پُرانا گھڑا پڑا تھا۔ خوابیدہ پاسبان اُس گھڑے کی کس نامعلوم ...... کی حفاظت کر رہا تھا؟ میں نے پھر اپنے دماغ کو سوچتے ہوئے سُنا۔ ہری فصل کھیت کے حاشیہ پر جہاں قلیل ہو جاتی تھی وہیں وہ راہی کچھ ننھّے ننھّے پودوں کی سیج پر سو گیا تھا۔ لیکن کیا وہ آخری نیند تھی؟ اپنے دونوں بازوؤں پر رونگٹوں کو کھڑا ہوتے میں نے محسوس کیا۔ راہی موٹر کے ٹائر کی چپّلوں پر چلتا چلتا آخر یہاں کیسے تھک کر سو گیا! ربڑ کا ٹائر تو ابھی نہیں گھسا تھا۔ مجھے خیال آیا فورڈ کمپنی کا جہاں وہ ٹائر بن کر تیار ہوا ہو گا۔ پھر مجھے وہ پُرانی سڑتی گلتی موٹر یاد آئی جو میرے محلّے میں گندے پانی کے نالے کے کنارے ایک گڈھے میں ایک نامعلوم مدّت سے پڑی ہوئی ہے۔ اُس کے بعد مجھے اپنے اُس انجن کا خیال آیا جسے شام کو میں نے انجن گھر میں سوتا پایا تھا غرضکہ ذراسی دیر میں میں ہر طرف خَلا میں خاموش مشینیں دیکھنے لگا۔ ہر طرف مشینیں بگڑی پڑی دکھائی دے رہی تھیں۔ ربڑ کے ٹائر کی چپّل بھی کیسی خاموش پڑی تھی! وہ ضرور کوئی کوڑھی ہو گا۔ لیکن پھر یہ سوچا کہ بدبخت کوڑھی کو دن دھاڑے کون اس طرح مار کر کھیت میں ڈال سکتا ہے۔ دیہاتی مثل ہے' بندر مارے ہاتھ کالے' تو ضرور کوڑھی راہی زندگی کی شاہراہ پر ربڑ ٹائر کی چپّل پر چلتا چلتا تھک کر ہمیشہ کیلئے اپنی زندگی کی شام دیکھ کر سو گیا ہے۔ مرنے اور جینے میں زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا لیکن مُردہ کو زندہ سے تمیز کرنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ جیتے جاگتے آدمی کو دیکھ کر آدمی کی ہمّت بڑھتی ہے۔ مرے آدمی سے ہمّت چھوٹ جاتی ہے۔

اندھیرے میں ڈرتے کانپتے ہم چلے جا رہے تھے۔ ہر شخص کچھ نہ کچھ سوچتا رہا ہو گا لیکن ظاہراً سب خاموش تھے۔ اب سامنے والے ٹولے پر ہم لوگ پہنچ چکے تھے۔ اُس ٹولے کا مُکھیا ہمیں راستہ ہی پر کھڑا تھا۔ اُس نے مجھے پہچانتے ہی سلام کیا اور ہم لوگوں کو سلام کیا اور ہم لوگوں کو اُس وقت اُس حالت میں دیکھ کر اُسے تعجّب ہوا۔ اُسی کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ آدمی جنوب کی جانب سے آیا تھا۔ چینی کے مل سے ایک گھڑا جوٹا لیکر لوٹ رہا تھا۔ راستے میں بھر پیٹ جوٹا پی لینےکا یہ نتیجہ تھا کہ زہریلے جوٹے نے اُسے جوٹے کا بوجھ ڈھونے سے نجات دلا کر ہمیشہ کیلئے زندگی ہی سے نجات دلا دی۔
یہ دردناک کہانی سُن کر دیہاتی زندگی کی پوری تصویر میری آنکھوں کے سامنے آگئی۔ جنوب میں گنّا اس وجہ سے نہیں بویا جاتا کہ اُس طرف ریلوے لائن نہونے سے چینی کی ملیں نہیں ہیں۔ جاڑے کے موسم میں

جب دکھن والے کھانے کی چیزوں کی ...... کمی کی وجہ سے بھوکوں مرنے لگتے ہیں تو اس طرف آکر چینی کی ملوں پر سے گھڑوں چوٹا خرید کر لیجاتے ہیں۔ چینی کی مل میں سے بہکر گندے سڑے ہوئے چوٹے کا ایک سوتا مل کی ساری گندگی اپنے ساتھ لئے ہوئے گندے پانی کے اُس بڑے تالاب میں جاتا ہے جس کی تیز بدبو سے چھوٹی لائن کی ٹرین پر سفر کرتے ہوئے بڑے آدمیوں کو اکثر قے ہوگئی ہے۔ جب مل مالکوں کو یہ بات معلوم ہوئی کہ مل کی وہ گندگی بھی آدمی کے کام آسکتی ہے تو اُنہوں نے اُس پر قیمت لگادی کھلے دم ایک آنہ گھڑا وہ چوٹا اب بھی بکتا ہے اور دکھن سے آنے والے اب بھی وہ چوٹا خرید کر پیتے اور مرتے ہیں یا موت کے نزدیک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اُس رات مجھے نیند نہیں آئی۔ میں تو کم لیکن میری بی بی زیادہ ڈر سے کانپتی رہیں۔ اُن کی نیند بار بار اُچٹ جانے سے مجھے تشویش ہوتی تھی کہ کہیں وہ بیمار نہ پڑ جائیں۔ ادھر اُدھر کی باتیں کرکے اُنہیں میں بچّوں کی طرح بہلا کر سُلانے کی کوشش کرتا تھا دور دور سے جنگل اور ارہر کے کھیتوں میں سے گیدڑوں اور لومڑیوں کے رونے کی آواز سُنائی پڑتی تھی۔ بار بار مجھے اُس مردے کا خیال آتا تھا۔ یہی سوچتا کہ گیدڑ اور دوسرے جانور اکٹھا ہوکر اُس کی لاش کو نوچتے نہ ہوں۔ میری بی بی بار بار یہ کہتی تھیں کہ کوئی جانور اُس کی آنکھ نہ نکال لیجائے۔ کیوں نہیں گانوں والے اُس مُردے کو وہاں سے اُٹھا لاتے؟ لیکن بغیر تھانیدار صاحب کی اجازت کے وہاں سے لاش کیسے اُٹھ سکتی تھی! ان خیالات میں کھوئے ہوئے خوف زدہ ہم لوگ کبھی کبھی گھنٹوں خاموش پلنگ پر پڑے رہتے۔ جب میں اپنی بی بی کی طرف دیکھتا تو ایسا محسوس کرتا کہ جیسے ہم لوگ جنگل کے بیچ میں پڑے ہوں۔

رات کا جاگا ہوا آدمی صبح کو سو ہی جاتا ہے۔ ویسے اس طرح کے سونے کو بھی سونا ہی کہا جاتا ہے ورنہ اُس سونے میں میں جتنا جاگتا رہا اتنا زندگی میں کم جاگا ہوں۔ اُس نیند کی حالت میں کہاں کہاں گیا اور کیا کیا کیا، سب تو یاد نہیں لیکن خواب کی حالت میں اُس اندھیری رات میں نامعلوم لاش کے پاس میں کتنی بار گیا۔ اُسکے بعد کی باتیں یاد ہیں۔ چاروں طرف مشینیں سرگرمی سے چل رہی تھیں، گرم انجنوں کے چمکتے ہوئے پُرزے تیزی سے بھاگ رہے تھے۔ ہزاروں لاکھوں کوڑھی! بہت سے کوڑھی مر چکے تھے، اُن سے بھی زیادہ مر رہے تھے۔ مشینیں چل رہی تھیں اور کوڑھی مر رہے تھے۔

میں کانپ کر جاگ اُٹھا۔ آنکھ کھُلتے ہی دیکھا سویرا ہو چکا تھا۔ کمرے میں کافی روشنی آچکی تھی۔ میری بی بی پلنگ سے لپٹی پڑی تھیں۔ میں نے سوچا آج انہوں نے ہارمونیم پر بھیرویں نہیں گائی!!

برجستہ کسی کی ڈانٹ کی آواز باہر سے آئی۔ ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کا دروازہ کھول کر دیکھا تو داروغہ صاحب بگڑ رہے تھے
دروازے پر تھانے کے سپاہی کچھ بیگار پکڑ لائے تھے۔ گنواروں کی مزدوری چھوڑ کر مجبوری کی حالت میں ہلکے ہاتھوں اپنے سروں پر پگڑیاں باندھ رہے تھے۔ پوسٹ مارٹم کے واسطے لاش شہر جانے والی تھی۔ بیگاروں کو دیکھ کر مجھے اسپین کے اُن بیچارے سیاسی قیدیوں کا خیال آیا جن سے قبریں کھُدوا کر اُنہیں اُنہیں قبروں میں گولی مار دی جاتی تھی۔

ایمان

جانم

اچھی خاصی گرمی تھی، مکھیاں لوٹ ٹوٹ پڑتی تھیں اور برابر تکلیف دے رہی تھیں۔ اس وقت شام کا تصوّر ہی بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ مشرقی افق پر کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے اور انکے ہمراہ ہوا میں ایک ہلکی سی نمی پھیل رہی تھی۔ اولنکا اپنے مکان کے بیرونی حصّہ میں بیٹھی ہوئی تھی اور اپنے خیالات میں کھوئی تھی۔ اس کا باپ ایک کالج کا مشیر تھا جو اب اپنی خدمات سے سبکدوش کر دیا گیا تھا۔

کوکن، ایک کھلی چھت کے تھیٹر کا منیجر تھا جسے لوگ ٹیوولی کہتے تھے باغ کے بیچوں بیچ کھڑا ہوا آسمان کو دیکھ رہا تھا، وہ قریب ہی ایک معمولی سے مکان میں رہتا تھا۔

"پھر..... بارش ہونے والی ہے! پھر بارش ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مجھے ڈبو کر چھوڑے گی، مجھے خودکشی کرنی پڑے گی، نقصان، ہر روز نقصان، اف دیوالہ" اس نے نہایت پریشانی کے عالم میں کہا۔

"دیکھا آپ نے یہ ہے آپ کی زندگی مس اولنگا، آدمی روئے نہ تو کیا کرے، آدمی کام کرتا ہے، اپنی انتہائی کوشش کرتا ہے۔ تھک کر چور چور ہو جاتا ہے، راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے اور بہتری کی صورت نکالنے کے لئے اپنا دماغ کھپاتا ہے اور پھر ہوتا کیا ہے؟

آپ نہیں سمجھیں گی! عوام ناواقف ہیں، جاہل ہیں، میں ان کیلئے بہترین اوپیرا کا انتظام کرتا ہوں، بہترین فن کار اُن کے سامنے پیش کرتا ہوں سرود و نغمہ ان کے لئے مہیا کرتا ہوں لیکن کیا آپ سمجھتی ہیں یہ سب کچھ آپ کے مذاق کے مطابق ہوتا ہے؟ وہ اسے بالکل پسند نہیں کرتے۔ ان کی نظر میں اسکی کوئی وقعت نہیں! انہیں تو چاہئیں مسخرے، بدتمیزی اور بیہودگی! اور پھر ادھر موسم کو دیکھئے ہر روز شام کو بارش ہو رہی ہے۔ دس مئی سے بارش ہونی شروع ہوئی تھی اور اب مئی اور جون دونوں گزر گئے۔ اُف! تماشائی نہیں آتے لیکن مجھے ہر چیز کا کرایہ اسی طرح ادا کرنا پڑ رہا ہے۔

کل پھر اسی طرح بادل چھا جائینگے اور کوکن ہسٹریا کے مریض کی طرح پھر چیخنے لگے گا "ہاں، برسو، برسو، اس باغ کو طوفان بن کر بہا لیجاؤ مجھے غرق کر دو، میری دین دُنیا دونوں کو غرق کر دو! اور آرٹسٹ انہیں بھی کہو کہ مجھے پکڑ لے جائیں۔ مجھے جیل بھیج دیں، سائبیریا بھجوا دیں! ہا ہا ہا!"

اور اگلے روز پھر وہی بارش!

اولنکا خاموشی سے کوکن کی باتیں سُنتی رہی۔ کبھی کبھی آنسو اسکی آنکھوں میں بھر آتے تھے۔ اس کی بدبختی سے اسے اتنی محبت ہو گئی تھی کہ وہ اسے چاہنے لگی تھی۔ اسے اس پر رحم آنے لگا تھا۔ کوکن ایک پتلا دُبلا سا آدمی تھا۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور کنگھے سے پیدا کردہ زلفیں اس کی پیشانی پر پڑی رہتیں وہ بہت مہین اور نسوانی آواز میں گفتگو کیا کرتا تھا اور جب وہ بولتا تھا تو اس کا مُنہ ایک طرف ایک زاویہ سا بنا لیتا تھا۔ اسکے چہرے پر ہمیشہ ایک غم برستا رہتا تھا اور اسی چیز نے اولنکا کے دل میں اسکے لئے ہمدردی اور محبت پیدا کر دی اولنکا کی فطرت کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بغیر محبت کے زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔

اپنے ابتدائی دنوں میں اسے اپنے باپ سے محبت تھی جو اب ایک اندھیرے کمرے میں پڑا رہتا تھا اور مشکل سے سانس لے سکتا تھا۔ اسے اپنی خالہ سے محبت تھی جو ہر دوسرے سال برنسک سے ملنے آیا کرتی تھی۔ اور اس سے پہلے جب وہ سکول میں تھی تو اسے اپنے فرانسیسی اُستاد سے محبت تھی۔ وہ ایک نرم و نازک دُبلی پتلی لڑکی تھی جس کا دل کسی کے دُکھ پر پگھلنے کیلئے تیار رہتا تھا۔ اسکی آنکھیں سبک اور شفاف تھیں اور صحت قابل رشک۔ جب کوئی اسکے گلابی رخساروں اور ہاتھی دانت کی سی سفید گردن کو دیکھتا تھا۔ اس وقت جب وہ کسی بات پر یا کسی کی گفتگو پر مسکرا رہی ہو اور اسکے پتلے پتلے پھول سے ہونٹ ایک طرف کو خمیدہ ہوں تو اسکی زبان سے بیساختہ نکل جاتا تھا "بُری نہیں" اور ساتھ ہی مُسکرا بھی پڑتا تھا۔ اور لڑکیاں .... لڑکیاں تو بات کرتے میں اس سے لپٹ جایا کرتی تھیں اور بات کرتے میں اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پیار سے کہا کرتی تھیں "جانم"۔

وہ مکان جس میں وہ اپنی پیدائش سے لیکر ابتک رہی تھی شہر کے ایک کونے پر تھا مگر ٹیسولی سے دور نہ تھا۔ شام کے وقت وہ تھیٹر کا بینڈ نہایت آسانی سے سُن سکتی تھی اور جب رات کو تماشے کے وقت پٹاخے چھوٹتے تھے اور آگ کی گرج پیدا ہوتی تھی تو اسے محسوس ہوتا تھا جیسے کوکن اپنی تقدیر سے نبرد آزمائی کر رہا ہے۔ عوام کی بے توجہی سے لڑ رہا ہے اور دشمن ماحول کو زیر کر رہا ہے۔

اس وقت اسکے دل میں ایک میٹھا سا درد ہونے لگتا تھا، اسکے بدن میں ایک کیف انگیز جھرجھری سی پیدا ہوتی تھی اور سونے کی خواہش یک قلم مفقود ہوجاتی تھی اور جب دن نکلے وہ گھر لوٹتا تھا تو وہ اپنے بستر کے قریب والی کھڑکی کو ہولے سے کھٹکھٹاتی تھی اور اسے صرف اپنا چہرہ اور ایک شانہ دکھا کر پردہ کو جنبش دیتی تھی اس کو دیکھتی تھی اور ایک دلکش تبسم اسکے ہونٹوں پر کھیل جاتا تھا۔

کوکن نے تجویز پیش کی اور ان دونوں کی شادی ہوگئی۔ اور جب اس نے قریب سے اسکے شانوں کی دلکشی کو اچانک دیکھا تو ''جانم''، کہہ کر ایک دم اسکے گلے میں ہاتھ ڈالدئے۔

''جانم، تم کتنی پیاری ہو!''

وہ خوش تھا لیکن چونکہ اس کی شادی کے روز بھی بارش ہو رہی تھی اس لئے اسکے چہرے پر غم کے آثار تھے۔

وہ یونہی ہنسی خوشی دن بسر کرتے رہے۔ اولنکا دفتر میں بیٹھی رہتی تھی اور ٹیسولی میں چیزوں کی دیکھ بھال کیا کرتی تھی۔ آمد و خرچ لکھا کرتی تھی۔ حساب رکھتی تھی اور لوگوں کی تنخواہیں دیا کرتی تھی اسکے وہ گلابی رخسار اور دلکش اور شہانی مسکراہٹ ایک عجیب انداز لئے ہوئے تھی، ابھی دفتر میں ہے، ابھی تھیٹر میں پردوں کے پیچھے ہے اور ابھی کیفے میں۔ اب وہ اپنے جاننے پوچھنے والوں سے تھیٹر کا تذکرہ کیا کرتی تھی کہ تھیٹر زندگی کے لئے نہایت ضروری چیز ہے۔ اب وہ کہا کرتی تھی کہ تھیٹر ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ آدمی مہذب ہونے کے علاوہ دلچسپی بھی حاصل کر سکتا ہے انسانیت کی توسیع صرف تھیٹر ہی کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔

''لیکن کیا تمہارے خیال میں عوام اسے سمجھتے ہیں؟'' وہ کہا کرتی تھی ''وہ چاہتے ہیں مسخرے! کل ہم نے فاؤسٹ پیش کیا تھا اور تقریباً تمام بکس خالی تھے، لیکن اگر ہم کوئی بیہودہ چیز پیش کرتی تو دیکھا ہوتا تمام بکس پر ہوتے۔ کل میں اور ونیکا ''جہنم میں رقص'' پیش کر رہے ہیں، ضرور آنا!''

اور جو کچھ کوکن تھیٹر اور ایکٹروں کے بارے میں کہتا تھا، وہ اسی کو دُہرا دیتی تھی، اُسی کی طرح وہ عوام کی بے توجہی شکایت کیا کرتی تھی رونا روتی تھی کہ لوگ اس فن میں دلچسپی نہیں لیتے، وہ ریہرسل میں حصہ لیا کرتی تھی، ایکٹروں کو ہدایات دیتی تھی، اور سازندوں کے اخلاق و عادات پر گہری نگاہ رکھتی تھی، اور جب کبھی مقامی اخبار میں ان کے تھیٹر کے خلاف کچھ لکھا جاتا تھا تو وہ رونے لگتی تھی، اور خود جا کر معاملات ٹھیک کر لیتی تھی۔

ایکٹر اس کے دلدادہ تھے اور اسے ''ونیکا اور مین'' کے نام سے پکارا کرتے تھے، اور کبھی کبھی ''جانم'' بھی کہہ دیا کرتے تھے، وہ ان کی ہر تکلیف پر کڑھتی تھی، اور کبھی کبھی تھوڑے بہت پیسے بھی اُدھار دیدیا کرتی تھی، اور اگر وہ واپس نہیں کرتے تھے اور دھوکا دے جاتے تھے تو تنہائی میں دو چار آنسو بہا لیا کرتی تھی، مگر کبھی شوہر سے شکایت نہیں کرتی تھی۔

اس مرتبہ وہ سردیوں میں بھی بہت اچھی حالت میں رہے، انھوں نے پوری سردیوں کے لئے شہر میں ایک تھیٹر کرایہ پر لے لیا اور کچھ تھوڑے بہت لین دین پر کبھی تو کسی روسی کمپنی کو دیدیتے تھے اور کبھی کسی مداری کو یا کبھی کسی ڈرامیٹک کلب کو، اولنکا کافی جسیّت و چالاک ہوتی گئی، اور اس کے چہرے پر اطمینان کی شعاعیں لہرانے لگیں، لیکن کوکن کمزور اور زرد ہوتا چلا گیا، اور ہمیشہ اپنے نقصانات کا تذکرہ کرنے لگا، اگرچہ ان سردیوں میں اس کی آمدنی کچھ بُری نہیں رہی تھی، وہ راتوں کو کھانستا رہتا تھا، اور وہ اُسے کبھی تو گرم رس بھری کی چائے دیتی تھی، اور کبھی چونے کے پانی سے غسل کراتی تھی، اور ایک گرم شال میں لپیٹ دیتی تھی۔

''تم کتنے اچھے ہو!'' وہ ہمیشہ خلوص نیت کے ساتھ کہا کرتی تھی۔ ''تم کتنے پیارے ہو!''

کچھ نئے آدمیوں کی تلاش میں کوکن کو ماسکو جانا پڑ گیا، اور وہ اس کی عدم موجودگی میں سو نہ سکی، اور تمام رات کھڑکی میں بیٹھی ہوئی ستاروں کو دیکھتی رہی، اور وہ اپنے آپ کو مرغیوں سے تشبیہ دینے لگی جو اگر ڈربہ میں مُرغا نہ ہو تو تمام رات جاگتی رہتی ہیں اور بے چین ہو جاتی ہیں، کوکن کو ماسکو میں روک لیا گیا، اور اس کا خط آیا کہ وہ ایسٹر سے پہلے نہ آسکے گا، اس کے علاوہ خط میں ٹیسولی کے بارے میں کچھ ہدایات لکھی تھیں، لیکن اتوار کے روز ایسٹر سے پہلے ہی دروازہ پر ایک خوفناک گرج سی پیدا ہوئی، اور کسی نے دستک دی، شام

ہو چلی تھی، دھم ..... دھم ..... دھم !
باورچی اونگھتا ہوا ننگے پاؤں اُٹھکر بھاگا،

"مہربانی کر کے ذرا جلدی سے دروازہ کھولئے"، کسی نے باہر سے کہا۔" آپ کا تار آیا ہے"۔

اس سے پہلے بھی شوہر کا اسے ایک تار مل چکا تھا، لیکن اس مرتبہ نہ معلوم کیوں ایک خنک سا خوف اس پر غالب آگیا، کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے تار کھولا اور پڑھا :۔

"پیٹر وویچ آج اچانک انتقال فرما گئے، تجہیز و تکفین کیلئے فوری ہدایات کا انتظار ہے"۔

سٹیشن منیجر نے تار پر دستخط کئے۔ اولنکا کی آنکھوں میں تاریکی سی ناچنے لگی" وینیکا میرے پیارے، کیوں ملی میں تم سے، کیوں تم سے محبت کی! اب تمہاری دل شکستہ غریب اولنکا دنیا میں تنہا رہ گئی ہے"!

اور آنسو اس کی آنکھوں سے برساتی نالوں کی طرح بہنے لگے۔

منگل کے روز ماسکو میں کو کن کی تجہیز و تکفین ہوئی اور بدھ کے روز اولنکا واپس لوٹ آئی، اور جونہی وہ کمرے میں داخل ہوئی بیدم ہو کر
۶۴ بستر پر گر پڑی، اور اتنے زور زور سے روئی کہ اس کی آواز ہمسائے کے علاوہ گلی تک میں سُنی جا سکتی تھی۔

"بے چاری جانم" ہمسایوں نے کہا جب وہ وہاں سے گزرے "اولنکا جانم، اب بیچاری کس طرح دن گزاریگی"

اس واقعہ کو تین مہینے گزر گئے، اولنکا گرجا سے واپس لوٹ رہی تھی، اور ایک جانکاہ الم اس کے چہرے کا حلقہ کئے ہوئے معلوم ہوتا تھا، اتفاق ایسا ہوا کہ اس کا ایک ہمسایہ وسیلی بھی گرجا سے اس کے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا، وہ ایک شہتیر فروش کے یہاں منیجر تھا اس نے ایک تنکوں کی ٹوپی، سفید واسکٹ پہن رکھی تھی، اور واسکٹ کے اوپر سونے کی زنجیر لگا رکھی تھی، اور وہ اس لباس میں ایک بیوپاری کی نسبت ایک دیہاتی رئیس زیادہ جچ رہا تھا

"ہر بات جیسے لکھا ہوا ہے ویسے ہی ہوتی ہے اولنکا"! اس نے سنجیدگی سے کہا" اگر ہمارا کوئی عزیز مرنے والا ہے تو اسے مرجانا چاہیئے کیونکہ یہ خدا کی مرضی ہے، ہمیں اس کی رضا کے سامنے سر جھکا دینا چاہیئے"۔

اس نے نہایت ہمدردانہ اور غم بھرے لہجہ میں کہا، اور اسے اس کے دروازہ تک چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ تمام دن وہ اسکی غم رُبا مردانہ آواز سنتی رہی، اور جب بھی اس نے آنکھیں بند کیں اس کی نگاہوں کے سامنے کالی داڑھی سے بھرا بھرا چہرہ پھر جاتا تھا۔ وہ اسے بہت زیادہ پسند کرنے لگی۔ اور اسی طرح اس نے بھی وسیلی پر اثرات چھوڑے تھے، کیونکہ تھوڑے ہی دنوں بعد ایک معمر خاتون جس کے ساتھ اس کی کچھ زیادہ جان پہچان نہ تھی، اس کے ساتھ چائے پینے آئی، اور جوں ہی وہ آن کر بیٹھی اور ذرا دم لیا تو وسیلی کے بارے میں باتیں کرنے لگی کہنے لگی وہ بہت ہی اچھا آدمی ہے، اور آمدنی کے لحاظ سے بھی آدمی اس پر بھروسہ کر سکتا ہے، اور یہ کہ کوئی لڑکی بھی اس سے شادی کرنے پر رضامند ہو جائے گی۔ کوئی تیسرے روز وسیلی خود آیا، وہ کچھ زیادہ دیر نہیں ٹھہرا، کوئی دس منٹ کے بعد واپس چلا گیا، اور یہ کہ جتنی دیر وہ بیٹھا رہا اس نے کوئی خاص بات نہیں کی، لیکن اس کے بعد اولنکا نے محسوس کیا کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے، اتنی شدید محبت کہ وہ رات کو سو بھی نہ سکی۔ اگلے روز اس نے اس معمر خاتون کو بلایا، بات طے ہو گئی اور اولنکا کی پھر شادی ہو گئی۔

وسیلی اور اولنکا شادی کے بعد بہت اچھی طرح رہنے لگے؛

عموماً کھانے کے وقت تک وہ دفتر میں بیٹھا کرتا تھا، اور کھانے کے بعد جب وہ کاروبار کے سلسلے میں باہر چلا جاتا تھا تو اولنکا آجاتی تھی، اور شام تک دفتر میں بیٹھتی تھی اور بیٹھی بیٹھی آرڈر اور حساب ترتیب دیتی رہتی تھی۔

"ہر روز شہتیر مہنگے ہوتے جا رہے ہیں، قیمتیں بیس فیصدی تک بڑھ گئی ہیں"!

وہ اپنے دوستوں اور خریداروں سے کہا کرتی تھی" اب تک ہم مقامی شہتیر فروخت کیا کرتے تھے اور اب وسیلی کو ضلع موگیلو جانا پڑتا ہے، حالانکہ اس میں اتنا خطرہ ہے، خطرہ!" اور یہ کہکر وہ اپنے رخساروں کو دونوں ہاتھوں سے چھپا لیتی تھی۔

اسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ برسوں سے ان شہتیروں کی تجارت میں لگی ہوئی ہے، اور یہ کہ زندگی میں سب سے زیادہ ضروری چیز صرف شہتیر ہی ہیں، اور اسے تختے، کڑیاں، لاٹھیاں، چھتیں، اور اسی قسم کی الفاظ میں، اور ان کی آواز میں ایک دلکشی سی محسوس ہوتی تھی۔

ایک رات جب وہ سو رہی تھی تو اس نے خواب میں بہت سے شہتیر، تختے اور لکڑیوں کی گاڑیاں دیکھی تھیں جو ان تمام چیزوں کو کھینچے لئے چلی جا رہی تھیں، وہ برابر خواب دیکھ رہی تھی کہ چھ انچ چوڑے اور

چالیس فیٹ لمبے برگوں کی ایک فوج اپنے آخری سروں پر کھڑی ہوئی ہال کے صحن میں قواعد کر رہی ہے اور یہ کہ ہزاروں تختے، برگے، کڑیاں ایک دوسرے کے اوپر دعائیں دعائیں گر رہے ہیں، اٹھ رہے ہیں اور پھر گر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ڈر کر چونک پڑی اور وسیلی نے آنکھیں کھول کر کہا:۔ "اولنکا! کیا بات ہے جانم، کیا بات ہے کروٹ بدلو!"

اس کے خاوند کے خیالات اسکے خیالات تھے۔ اگر وہ خیال کرتا تھا کہ کمرہ گرم ہے یا یہ کہ تجارت آج کل مندی ہے تو وہ بھی ایسا ہی محسوس کرتی تھی۔ اس کا خاوند تفریحات کو پسند نہیں کرتا تھا اور اتوار کی شام کو گھر ہی پر رہتا تھا۔ وہ بھی ایسا ہی کرتی تھی۔

"تم ہمیشہ یا تو گھر میں رہتی ہو یا دفتر میں" اسکے دوست اس سے کہا کرتے تھے۔

"کبھی کبھی تھیٹر یا سرکس چلی جایا کرو جانم"

"وسیلی کے اور میرے پاس تھیٹر جانے کے لئے وقت نہیں"۔ وہ جواب دیتی:۔ "ہمارے پاس بیہودگیوں کیلئے وقت نہیں تھیٹر کی آخر زندگی میں ضرورت ہی کیا ہے"۔

ہفتہ کے روز وہ شام کو گرجا جایا کرتے تھے اور چھٹی کے روز صبح کے وقت۔ اور جب وہ برابر چلتے ہوئے گھر لوٹتے تھے تو انکے چہروں پر ایک قسم کی نرمی سی برسا کرتی تھی۔ ان دونوں کے گرد ایک خوشبو سی اڑتی رہتی تھی اور اولنکا کا ریشمی لباس اسکے ملائم جسم پر لہراتا رہتا تھا۔ گھر آ کر وہ چائے پیتے تھے۔ مکھن روٹی اور جام اور اسکے علاوہ مختلف قسم کی چیزیں ان کی غذا ہوتی تھیں۔ اوسان تمام کے بعد چائے۔

بارہ بجے کے بعد اکثر ان کے صحن سے بطخ، مچھلی یا کسی اور گوشت کی ایسی خوشبو آیا کرتی تھی کہ راہگیروں کو بھی بھوک محسوس ہونے لگتی تھی۔ دفتر میں بھی چولھا جلتا رہتا تھا اور خریداروں کی چائے وغیرہ سے تواضع کی جاتی تھی۔ ہفتہ میں ایک مرتبہ وہ نہانے کے لئے حمام جایا کرتے تھے اور جب نہا کر ساتھ لوٹا کرتے تھے تو ان کے چہروں پر ایک گلابی سی برسا کرتی تھی۔

"احسان ہے خداوند کریم کا ہمیں کسی چیز کی حاجت نہیں" وہ اپنے خریداروں سے کہا کرتی تھی "یہ میری دعا ہے خدا سب کو ہمارے جیسی زندگی عطا فرمائے"۔

جب وسیلی خرید و فروخت کے سلسلہ میں کہیں باہر چلا جاتا تھا تو وہ اسکی کمی بُری طرح محسوس کیا کرتی تھی۔ تنہا لیٹی ہوئی جاگتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی شام کے وقت سمرنن آ جاتا تھا۔ وہ حیوانوں کے ہسپتال میں ڈاکٹر تھا۔ جوان اور خوش وضع آدمی تھا اور اولنکا ہی کے مکانوں میں سے ایک میں رہتا تھا۔ وہ اسکے ساتھ آن کر تاش کھیلا کرتا تھا اور دلچسپ باتیں کیا کرتا تھا اور اپنے خاوند کی غیر موجودگی میں اس کی آمد سے اسکی کافی حد تک دلبستگی ہو جایا کرتی تھی، جب وہ اسے اپنی گھریلو زندگی کے بارہ میں بتایا کرتا تھا تو وہ کافی دلچسپی لیا کرتی تھی۔ وہ شادی شدہ تھا، اور اس ایک لڑکا بھی تھا آجکل اس نے اپنی بیوی سے علیحدگی اختیار کر رکھی تھی، کیونکہ اس کے خیال میں اس کی بیوی نے وفاداری کا ثبوت نہیں دیا تھا، اور اب وہ اس سے نفرت کرتا تھا، اور محض اپنے لڑکے کے اخراجات کے لئے چالیس روپیہ ماہوار بھیجا کرتا تھا، یہ سُنکر اولنکا گردن ہلا کر ٹھنڈی سانس لیا کرتی تھی، اسے اس سے بہت ہمدردی تھی،

"خدا تمہاری حفاظت کرے"

وہ اس سے کہا کرتی تھی جب وہ اس سے رخصت ہو کر جایا کرتا تھا، اور وہ اسے زینہ تک روشنی دکھانے آیا کرتی تھی۔

"راہ نمائی کا شکریہ" وہ کہا کرتا تھا۔ "خدا تمہیں تندرستی عنایت فرمائے"۔

وہ یہ سب کچھ کہتے وقت بالکل اپنے شوہر کی نقل کیا کرتی تھی وہی انداز، وہی الفاظ کی نشست و برخاست، اور وہی بزرگانہ مشورہ اور جب ڈاکٹر بیرونی دروازہ کے نیچے غائب ہونے لگتا تو وہ کہا کرتی

"ڈاکٹر بہتر یہی ہے کہ تم اپنی بیوی سے مصالحت کر لو، اُسے معاف کر دو، اپنے بچہ کی خاطر ہی سہی، تمہیں ایسا کر لینا چاہیئے"۔

اور جب وسیلی واپس آیا تو اس نے اُسے نہایت نرم آواز میں ڈاکٹر اور اس کی خانگی زندگی کے بارے میں بتایا، دونوں کو اس بیچارے پر رحم آنے لگا، اور سر ہلا ہلا کر اس کے لڑکے کے بارے میں باتیں کرنے لگے، یقیناً وہ اپنے باپ کی کمی محسوس کر رہا ہوگا، اور پھر ایک عجیب و غریب جذبہ کے ماتحت وہ دونوں اٹھ کر مریم کی مورتی کے سامنے جھک گئے، اور دعا مانگنے لگے کہ خدا انھیں بھی کوئی بچہ عطا فرمائے۔

اور اس طرح وسیلی اور اولنکا چھ سال تک نہایت امن کی زندگی بسر کرتے رہے، لیکن ایک دن ...... ایک دن وسیلی سردیوں میں شام کی چائے کے بعد ننگے سر اٹھ کر ایک کام سے باہر

چلاگیا، اسے کچھ شہتیر کہیں بھجوانے تھے اور اس میں ذراسی بے احتیاطی سے اسے ٹھنڈ لگ گئی اور وہ بیمار ہوگیا۔ اگرچہ شہر کے بہترین ڈاکٹر اسکے علاج میں مصروف تھے لیکن اسکی حالت دن بدن خراب ہوتی چلی گئی اور چار مہینے کی طویل علالت کے بعد عازم ملک بقا ہوا۔ اور اولنکا ایک مرتبہ پھر بیوہ ہوگئی۔

"اب میرا کوئی بھی اس دُنیا میں نہیں میرے پیارے۔" وہ اپنے خاوند کی میّت پر سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی "میں اس دُکھ بھری دُنیا میں تمہارے بغیر کیونکر رہ سکتی ہوں؟ لوگو مجھ پر رحم کھاؤ میں اس وسیع دُنیا میں تنہا رہ گئی ہوں!"

اسکے بعد اس نے بیوگی کا لباس پہن لیا۔ آستینوں پر سیاہ لمبے لمبے گن چڑھا لئے اور ہیٹ اور دستانے ہمیشہ کیلئے پہننے چھوڑ دیئے۔ اب وہ ایک نن کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ نہ کہیں آتی تھی نہ جاتی تھی ہاں کبھی کبھی یا تو گرجا چلی جاتی تھی یا اپنے خاوند کی قبر پر۔ چھ مہینے اسی طرح بیت گئے۔

اس نے اپنی سیاہ آستینیں اُتار دیں اور اتنے عرصہ کے بعد پہلی مرتبہ کھڑکیاں کھولیں۔ اب وہ اکثر صبح کے وقت باورچی کے ہمراہ بازار جاتی ہوئی دکھائی دے جاتی تھی۔ کچھ کھانے پینے کی چیزیں خریدنے کے لئے۔ لیکن گھر سے اب بھی ایک حد تک بے نیاز تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ گھر میں کیا ہو رہا تھا۔ ہر چیز ایک تاریکی میں تھی۔ ہاں شام کے وقت باغ میں ڈاکٹر کے ساتھ چائے پیتے ہوئے دیکھ کر لوگ کچھ اندازہ لگا لیتے تھے یا پھر اس بات سے جو اس نے ایک اور عورت سے ڈاکخانہ کے قریب کہی تھی۔

"ہمارے شہر میں جانوروں کا ٹھیک طور پر کوئی معائنہ نہیں کرتا اور یہی وجہ ان متعدّی بیماریوں کی ہے۔ روز شہر میں ایسی بیماریوں کی خبر اُڑتی رہتی ہے اور لوگوں کو گھوڑوں اور گایوں سے بیماریاں لگ جاتی ہیں۔ جانوروں کی صحت کا خیال رکھنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا انسانوں کی صحت کا۔"

جو حیوانوں کا ڈاکٹر کہتا تھا وہ انہیں باتوں کو دُہرا دیتی تھی اور ہر چیز کے بارے میں جو ڈاکٹر کی رائے تھی وہی اسکی رائے تھی۔ یہ چیز بالکل واضح تھی کسی سے بغیر کسی قسم کا لگاؤ رکھے ہوئے وہ ایک منٹ بھی نہیں جی سکتی تھی اور اسے خوشی میسّر نہیں آسکتی تھی اگر کوئی اور ہوتا تو ممکن ہے لوگ اُنگلیاں اُٹھاتے۔ لیکن اولنکا کے خلاف کوئی ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ کیونکہ جو کچھ وہ کر رہی تھی وہ بالکل فطری تھا۔

اس نے یا ڈاکٹر نے کسی نے بھی اپنے نئے تعلّقات کے بارے میں کسی سے تذکرہ نہیں کیا تھا۔ دونوں اس چیز کو چھپاتے تھے۔ لیکن اولنکا جیسی فطرت کی عورت کبھی کوئی چیز راز بنا کر نہیں رکھ سکتی تھی۔ جب بھی کوئی اس سے ملنے آتا یا ڈاکٹر کی رجمنٹ کے آدمی اسکے پاس آتے تو وہ ان سے چائے پیش کرتے وقت، کھانا کھلاتے وقت، جانوروں میں پلیگ، پاؤں اور مُنہ کی بیماریوں اور بوچڑخانے کی بابت باتیں کرنے لگتے تھے۔ وہ اسپر بہت کُڑھتا تھا اور جب سب مہمان چلے جاتے تھے تو وہ اسکی آستین پکڑ کر جھٹکتا تھا اور غصّہ میں چلاّتا تھا۔

"میں نے تم سے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ جو چیز تمہاری سمجھ میں نہیں آتی اسکے بارے میں باتیں مت کیا کرو۔ جب دو ڈاکٹر باتیں کر رہے ہوں تو تم اپنی بات بیچ میں ٹھونس دیتی ہو، ایسا مت کیا کرو۔ مجھے ایسی باتوں پر غصّہ آتا ہے۔"

وہ اسکی طرف حیرانی سے دیکھتی تھی اور چوکنّا ہو کر کہتی تھی "تو پھر ڈاکٹر میں اور کیا باتیں کروں۔"

اور پھر اسکی آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ وہ اس سے لپٹ جاتی تھی اور التجا کیا کرتی تھی کہ ڈاکٹر تم غصّہ مت ہوا کرو اور پھر دونوں خوش ہو جاتے تھے۔

لیکن یہ خوشی کچھ زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی۔ ڈاکٹر چلا گیا ہمیشہ کیلئے، اسکی رجمنٹ کا تبادلہ ہوگیا، غالباً سائبیریا کی طرف اور وہ اس دُنیا میں پھر تنہا رہ گئی۔

اب وہ اس دُنیا میں بالکل اکیلی تھی۔ اس کا باپ عرصہ ہوا مرچکا تھا۔ ہاں اسکی ایک ٹانگ سے لنگڑی کرسی ضرور برآمدہ میں پڑی تھی اور اس پر گرد جم گئی تھی۔ وہ دن بدن کمزور اور پیلی ہوتی چلی جا رہی تھی۔ لوگ اب اسکی طرف اس طرح نہیں دیکھتے تھے جس طرح وہ پہلے دیکھا کرتے تھے بلکہ اب تو دیکھتے ہی نہ تھے، ان کی وہ پہلی مسکراہٹ نہ معلوم کہاں اُڑ گئی تھی۔ اولنکا کے بہترین دن اب گزر کر بہت دور نکل گئے تھے اور اب اسکی ایک نئی زندگی شروع ہوگئی تھی جس میں سو کو کہیں دخل نہ تھا۔ شام کے وقت وہ مکان کے بیرونی حصّہ میں بیٹھا کرتی تھی اور ٹیسولی میں بجتے ہوئے بینڈ کی آواز اسکے کانوں میں آتی تھی لیکن اب اس آواز میں اسکے لئے کوئی دلکشی نہ تھی۔ وہ اپنے صحن کو نہایت بے بسی کے ساتھ دیکھتی تھی اور اسکے ذہن میں کوئی خیال نہ

تھا۔ اب اسکی کوئی خواہش نہ تھی۔ رات ہو جاتی تھی اور وہ خاموشی سے اپنے بستر میں لیٹ رہتی تھی اور اب اسکے خواب میں صرف ایک خالی صحن گھومتا تھا۔ وہ جی رہی تھی، کھا پی رہی تھی۔ یونہی، سب یونہی!

اب اس کی کوئی رائے نہ تھی دُنیا کی کسی چیز کے بارے میں بھی وہ اپنے گرد چیزیں دیکھتی تھی اور جو دیکھتی تھی وہی سمجھتی تھی لیکن ان کے بارے میں اسکی کوئی رائے نہ تھی۔ اب وہ نہیں جانتی تھی کہ کیا باتیں کرے۔ کس چیز کے متعلق باتیں کرے۔ اب اس کی کوئی رائے نہ تھی، کوئی رائے!

مثال کے طور پر آدمی بوتل دیکھتا ہے۔ بارش یا سڑک پر جاتے ہوئے دہقان کو دیکھتا ہے کہ گاڑی لئے ہوئے چلا جا رہا ہے لیکن ان تمام کے کیا معنی ہیں وہ نہیں سمجھتا۔ وہ نہیں جانتا یہ سب چیزیں کیوں ہیں! جب کوکن تھا، وسیلی یا حیوانوں کا ڈاکٹر تھا تو اس وقت وہ چیزوں کو سمجھتی تھی، ان کی وضاحت کر سکتی تھی ان کے بارے میں ایک رائے رکھتی تھی لیکن اب، اب تو ذہن اور دل دونوں اس طرح خالی تھے جس طرح مکان کا صحن خالی پڑا تھا۔ اب تو گویا اس کے مُنہ میں زبان بھی نہ تھی اور اگر تھی تو اسے کیڑا کھا گیا تھا۔

آہستہ آہستہ شہر چاروں طرف پھیلتا چلا گیا۔ پُرانی سڑکیں کلیاں بن گئیں۔ جس جگہ ٹیلہ، دلی اور نال تھی اب وہاں نئے موڑ اور مکانات بن گئے۔ کتنی تیزی سے گزرتا ہے وقت! اولنکا کا مکان بھی اب پُرانا ہو گیا تھا۔ چھتیں زنگ آلود ہو گئی تھیں چھجے ایک طرف کو جُھک گئے تھے اور صحن میں ہزاروں قسم کے خار و خس اُگ آئے تھے۔ اولنکا بھی اب معمر ہو چلی تھی۔ وہ اسی طرح اب بھی اپنے برآمدے میں بیٹھتی تھی لیکن اسکی روح اسی طرح خالی، خشک اور تلخ تھی۔ سردیوں میں وہ اپنی کھڑکی میں بیٹھ کر برف کا منظر دیکھا کرتی تھی۔ جب بہار کے پھولوں کی خوشبو اس تک آتی، یا گرجا کی گھنٹیوں کی آواز اس تک پہنچتی اچانک کچھ پُرانی یادداشتیں ان کے ذہن میں لوٹ آتیں۔ اسکے دل میں ایک درد سا پیدا ہوتا اور آنسو اسکی پلکوں پر لرزنے لگتے لیکن یہ سب کچھ صرف چند لمحوں کے لئے ہوتا تھا، صرف چند لمحوں کے لئے اور اسکے بعد پھر وہی خلا، وہی زندگی کی بدمزگی اور ویرانی! بلی کا سیاہ بچّہ اسکی کمر سے کھیلنے لگتا۔ اس کی ٹانگوں سے اپنا جسم رگڑتا۔ لیکن اسکے لئے اس کھیل میں کوئی دلکشی نہ تھی۔ اسے بلی کے بچّہ کی ضرورت نہ تھی اسے ایک انسان کی محبت چاہیے تھی جس میں وہ خود کو غرق کر دے، خود کو بھول جائے جس میں اسکی روح گھل مل جائے اور اسکے ذہن میں خیالات پیدا کر دے اور اسکے خون میں ایک قسم کی گرمی پیدا ہو جائے۔ وہ بلی کے بچّے کو جھٹک دیتی۔

"بھاگ، مجھے تیری ضرورت نہیں!"

اور زندگی اسی طرح گزرتی رہی، لمحے، دن، سال، کوئی خوشی نہیں، کوئی تبدیلی نہیں، کوئی ذاتی رائے نہیں! جو کچھ باورچی کہہ دیتا وہ اسے مان لیتی، اس پر یقین کر لیتی۔

جولائی کی ایک شام کو، جب ڈھور ڈنگر چر کر واپس لوٹ رہے تھے اور تمام صحن گرد سے پُر تھا ایک دم کسی نے دروازہ پر دستک دی، وہ ایک دم اُٹھ کر کھولنے کے لئے گئی۔ ایک حیرانی سی اسکے تمام جسم پر طاری ہو گئی۔ شہری لباس میں ایک معمر آدمی، سفید سر، ڈاکٹر! وہ دوڑ کر اس سے لپٹ گئی اور سر اسکے شانوں پر رکھ دیا۔ اس کیفیت میں اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ کب اور کس طرح چل کر کمرے میں پہنچ گئے اور چائے پینے لگے۔

"کونسی موج ادھر بہا لائی ڈاکٹر" اس نے خوشی سے بھرپور لہجہ میں کہا۔

"میں اب ہمیشہ کے لئے یہیں رہنا چاہتا ہوں اولنکا" اس نے

۶۷ کہا "میں نے ملازمت سے استعفےٰ دیدیا ہے اور جو کچھ میں نے اس وقت تک پس انداز کیا ہے اسی پر گزر کرنا چاہتا ہوں۔ اسکے علاوہ اب میرا بچّہ بڑا ہو گیا ہے اور اسکے سکول جانے کے دن ہیں۔ اب میں نے بیوی سے مصالحت کر لی ہے۔"

"کہاں ہے وہ" اولنکا نے پوچھا۔

"وہ لڑکے سمیت ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہے اور میں مکان کی تلاش میں پھر رہا ہوں۔"

"مکان کی تلاش میں کیوں پھر رہے ہو میرا مکان کس لئے ہے مجھے چاہئیے ہی کیا، صرف ایک کمرہ، میں تم سے کوئی کرایہ نہ لوں گی تم ضرور آ جاؤ۔ مجھے بڑی خوشی ہو گی۔"

اگلے روز سے مکان کی مرمت شروع ہو گئی چھتیں درست ہونے لگیں، دیواروں پر سفیدی ہو گئی۔ اولنکا ہاتھ اُٹھائے ہوئے ہدایتیں دیتی ہوئی چاروں طرف پھر رہی تھی۔ اسکے چہرے پر خوشی کندن کی طرح چمک رہی تھی اور وہ اسی طرح تمام رات جاگتی رہی۔ ڈاکٹر کی بیوی آ گئی۔ پتلی دبلی ایک سادہ سی عورت تھی جس کے چھوٹے چھوٹے بال تھے، بٹیر کی سی آنکھیں۔ اسکے ساتھ ساشا تھا، ایک دس سال کا بچّہ، نیلی آنکھوں والا چھوٹا سا بچّہ۔ بات

کرنے میں اسکے گالوں میں حلقے پڑ جاتے تھے۔ ابھی اسے آئے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ وہ بلی کے پیچھے بھاگنے دوڑنے لگا اور اسکی خوشی اور معصومیت سے بھری ہوئی کلکاریاں مکان میں گونجنے لگیں۔

"خالہ اماں یہ تمہاری پوسی ہے" اس نے اولنکا سے پوچھا۔ "جب یہ بچے دے تو ایک بچہ ہمیں ضرور دینا اماں چوہوں سے بہت ڈرتی ہیں۔"

اولنکا نے اس سے بہت سی باتیں کیں، اسے چائے پلائی، اسکے جسم میں ایک عجیب قسم کی مسرت لہریں لینے لگی اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ساشا اس کا بچہ ہے۔ اور جب شام کے وقت وہ اپنا سبق یاد کرنے کے لئے بیٹھا تو وہ اسے محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگی اور خود بخود کہنے لگی:

"میری جان،۔ ۔ ۔ میرے خزانے ..... تم کتنے اچھے ہو ..... کتنے شریر ہو۔"

"جزیرہ زمین کا وہ ٹکڑا ہے جو چاروں طرف پانی سے گھرا ہو" وہ زور زور سے پڑھ رہا تھا۔

"جزیرہ زمین کا وہ ٹکڑا ہے جو چاروں طرف پانی سے گھرا ہوا ہو" وہ زور زور سے پڑھ رہا تھا۔

"جزیرہ زمین کا وہ ٹکڑا ہے" وہ دہرانے لگی اور ایک طویل عرصہ کے بعد یہ اسکی پہلی رائے تھی جو اسکے ذہن کی مردہ زمین سے ابھر رہی تھی۔

اب اسکی اپنی ایک رائے ہوگئی تھی۔ شام کے کھانے پر وہ ساشا کے والدین سے باتیں کیا کرتی تھی اور کہا کرتی تھی کہ بچوں کے لئے اسباق کا انتخاب بہت مشکل رکھا ہے لیکن پھر بھی ہائی سکول تجارتی سکول سے بہتر ہے اس لائن میں آدمی آگے چل کر ڈاکٹر بھی بن سکتا ہے اور انجینئر بھی، اب یہ اس کی مرضی پہ ہے کہ چاہے جو پیشہ اختیار کرے۔

ساشا نے ہائی سکول جانا شروع کر دیا۔ اس کی ماں وہاں سے اٹھ کر اپنی بہن کے یہاں خارکوف جا رہی اور واپس نہیں آئی اسکے باپ کو روز جانوروں کی دیکھ بھال کیلئے جانا پڑتا تھا اور کبھی تو گھر سے تین تین روز غائب رہتا تھا۔ اولنکا کو ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ دونوں نے اسے نظر انداز کر دیا ہے اسکی اب گھر والوں کو کوئی ضرورت نہیں محسوس ہوتی اور یہ کہ وہ وہاں بھوکا بھی مرتا ہے اس لئے وہ اسے وہاں سے اٹھا کر اپنے گھر لے آئی اور ایک کمرہ اسکے رہنے کے لئے دیدیا۔

چھ مہینے سے ساشا اسکے ساتھ تھا۔ ہر روز صبح کو اولنکا اس کے کمرے میں جاتی اور دیکھتی کہ وہ اپنے رخساروں کو ہتھیلی پر رکھے ہوئے خاموشی سے سو رہا ہے۔ جب وہ اسے جگانے کا ارادہ کرتی تو اسے تکلیف محسوس ہوتی۔

"ساشنکا" وہ دردبھری آواز میں کہتی۔ "اٹھ بیٹھو جانم سکول کا وقت ہوگیا ہے۔"

وہ اٹھ بیٹھتا، نہا کر کپڑے بدلتا اور صبح کی دعا مانگنے کے بعد ناشتہ کرنے کیلئے بیٹھ جاتا۔ ایک دو توس، ایک کریم اور تین پیالیاں چائے کی پیکر وہ تیار ہو جاتا۔ لیکن اس تمام عرصہ میں نیند کی سستی اسپر سے دور نہ ہوتی، ایک چڑچڑا پن سا اس پر برستا رہتا۔

"تمہیں اپنی کہانی بھی یاد نہیں ساشنکا" اولنکا اس سے کہتی اور اسکی طرف ایسے دیکھتی جیسے کسی بڑے سفر پر روانہ ہونیوالا ہے "تمہارے ساتھ کتنی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اپنا سبق یاد کرلیا کرو اور اپنے استادوں کا کہنا مانا کرو جانم۔"

"آپ مجھے اکیلا چھوڑ دیجئے" ساشا اس سے تنگ آکر کہتا اور پھر وہ سکول کی طرف روانہ ہو جاتا، ایک ننھی سی جان بڑی سی ٹوپی پہنے ہوئے ایک بھاری سا بستہ کندھے پر رکھے ہوئے۔ اولنکا دبے پاؤں اسکے پیچھے پیچھے ہو لیتی۔

"ساشنکا" وہ اسے پیچھے سے آواز دیتی اور اس کے ہاتھ میں کھجور یا ایسی ہی کوئی کھانے کی چیز دیدیتی۔ جب وہ سکول کے دروازہ پر پہنچتا تو اسے شرم سی آنے لگتی کہ ایک طول طویل اور مضبوط عورت اسے چھوڑنے کے لئے سکول آرہی ہے۔ وہ پیچھے کی طرف مڑتا اور کہتا۔

"خالہ اماں اب آپ جائیے اب میں اکیلا چلا جاؤں گا۔"

وہ یہ سن کر خاموش کھڑی رہ جاتی اور وہ اسکول کے دروازہ میں غائب ہو جاتا۔

آہ اسے اس سے کتنی محبت تھی، کتنا لگاؤ تھا اسے اس بچے سے آجتک کسی چیز نے اسکی روح کا اس درجہ گہرا احاطہ نہ کیا تھا اس کی مادرانہ جبلتیں ابھر ابھر کر منظر شہود پر آگئی تھیں۔ اسے کتنی مسرت ملتی تھی اس ننھی سی جان کو دیکھ کر جس کے رخساروں میں بات

کہتے وقت حلقے پڑجاتے تھے۔ وہ اسکے لئے اب اپنی زندگی وقف کرسکتی تھی۔ وہ اپنی مسرّت اور آنسو بھری آنکھوں کے اظہار پر مجبور تھی۔ لیکن ایسا کیوں تھا، کیوں ؟ یہ کون بتا سکتا تھا کہ ایسا ہے کیوں ؟

وہ ساشا کو سکول کے دروازے کے پیچھے غائب ہوتا ہوا دیکھ کر گھر کی طرف لوٹ پڑتی تھی، مطمئن اور خاموش۔ اسکا دل محبّت سے لبریز ہوتا تھا اور اس کا چہرہ ان چھ مہینوں کے اندر ہی اندر پھر جوان ہو چلا تھا۔ اسکے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ ہوتی تھی اور چہرے پر ایک قسم کی روشنی سی۔ لوگ اسے راستہ میں دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔

"تسلیم اولگا جانم۔ کیسی ہو جانم" ؟

"آجکل سکولوں میں سبق بڑے مشکل دئے جاتے ہیں" وہ منڈی کے قریب کھڑی ہو کر اظہارِ خیال کرتی، "پہلی ہی جماعت میں اتنا مشکل سبق، کل انھوں نے اسے مُنہ زبانی ایک کہانی یاد کرنے کے لئے دے دی تھی۔ ایک لاطینی کا ترجمہ اور ایک شکل حل کرنے کے لئے۔ تم جانتے ہو ایک ننھی سی جان کے لئے کتنی مشکل چیزیں ہیں یہ"

اور وہ اُستادوں، اسباق، سکول اور کتابوں کے بارے میں اسی طرح باتیں کرنے لگتی جس طرح ساشا بیان کرتا۔

شام کو تین بجے کے قریب وہ دونوں اکٹھے کھانا کھاتے شام کو رات گئے وہ دونوں اکٹھے سبق یاد کرتے اور دونوں مل کر چلاتے۔ اور جب رات کو وہ اسے بستر میں لٹاتی تو بہت دیر تک اسے دیکھتی رہتی اور پھر اسکے لمبا سا صلیب کا نشان بنا کر کچھ پڑھنے لگتی اور پھر اپنے بستر میں لیٹ کر اپنے دُھندلے مستقبل کے خواب دیکھنے لگتی۔ جب ساشا پڑھ لکھ کر فارغ ہو جائے گا اور کہیں انجنیئر یا ڈاکٹر ہو جائے گا۔ اس کا ایک بہت بڑا امکان گھوڑا اور گاڑی ہونگے۔ شادی ہو گی اور بہت سے بچے ہونگے ...... وہ انہیں خوابوں کی گود میں سو جاتی، آنسو اسکی آنکھوں سے بہتے رہتے، اسکے رخسار تر ہو جاتے اور بلّی اسکے قریب لیٹی ہوئی خرخر کرتی رہتی۔

اچانک دروازہ پر دھم دھم ہوتی۔ اولگا گھبرا کر اور بے دم ہو کر آنکھیں کھول دیتی، دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگتا۔ آدھ منٹ بعد پھر وہی دھم دھم ہوتی۔

"کیا خبر ہارکو سے تار آیا ہو" وہ سوچنے لگتی کہ وہ دُنیا میں سب سے زیادہ بد قسمت عورت ہے اور ایک منٹ گزر جاتا اور دروازہ پر ایک دھیمی سی آواز گونجتی اور آخر میں وہ ڈاکٹر کی آواز ثابت ہوتی، معلوم ہوتا کہ کلب سے لوٹا ہے۔

"شکر ہے خدا کا لاکھ لاکھ" وہ سوچتی۔

رفتہ رفتہ اس کے دل کا بوجھ اُتر جاتا اور اسے پھر ایک سکون سا مل جاتا۔ وہ واپس اپنے کمرے میں ساشا کے متعلق

سوچتی ہوئی چلی جاتی جو برابر کے کمرے میں لیٹا ہوا گہری نیند سو رہا تھا اور خواب میں بڑبڑا رہا تھا۔

"یہ میں تمہیں دے دونگا ....

دور ہو جاؤ ...... بکو مت !"

(چیخو)

ساغر نظامی

ماؤں کو آخری سلام

غفلت کا انجام دیکھو، آخر ہمارے سرسبز و شاداب باغ میں وہ منحوس گھڑی آگئی جس کا خدشہ تھا ——— نو شگفتہ پھولوں کی گود بلبلوں کے خون سے اس طرح لبریز ہوگئی جیسے پیالے سرخ شراب سے، جیسے آنکھیں خون کے آنسوؤں سے، نونہالان چمن کے خون سے چمن کا ذرّہ ذرّہ رنگین ہوگیا، گویا ہر طرف گلاب کی خشک پتیاں بکھری ہوئی پڑی ہیں معصوم اور اچھوتی کلیوں کے نازک اور کیفِ شباب سے جھک پڑنے والے گچھوں میں صیاد کے تیروں نے آشیانے بنالئے باغ کی ایک ایک ٹہنی اور ایک ایک پتّی پر صیاد کی ظالم فوج نے اپنا قبضہ جمالیا، وہ پھول جن کی نزاکت نظارہ کا بھی بوجھ نہ اٹھا سکتی تھی ....

.... اور وہ پھول جن کی نکہت اپنی نازک خرامی کی وجہ سے
۷۰ شامّہ تک سفر کرنے میں مکلّف نظر آتی تھی مَسل کر پھینک دیئے گئے -
ادھر اُدھر پھینک دیے گئے -

باغ کے وہ نوجوان جو اپنی عمر کی بہاریں لوٹنے میں مست ہو سکتے تھے چمن کے وہ بانکے جن کی کجکلاہی چاند اور سورج کو نیچا دکھاتی تھی زخمی پڑے ہیں، وہ کنواریاں جو باغ کا نور اور بہاروں کی جان تھیں۔ اُن عفت و عصمت کی دیویوں پر صیاد و باغباں اور ان کے حواریوں نے وہ ناقابلِ بیان ظلم ڈھائے جن کا بیان کرنا ہمارے مقدس باغ کی چاردیواری میں "پاپ" سمجھا جاتا تھا، پاپ اے ماؤ پاپ! نہ بیان ہو سکنے والا پاپ ——— ایسی حالت میں تم ہمیں میدانِ جنگ کی طرف جانے سے روکتی ہو۔ اُس میدانِ جنگ کی طرف جہاں ہمارا انتظار کر رہی ہے۔ اے سپید سر بوڑھیو! یہ وقت رونے دھونے کا نہیں ہے ہمیں اپنے وطن؟ پیارے وطن پر قربان ہو جانے کیلئے رخصت کردو۔ اے مفلوک اور مفلس باغ کی غریب اور مصیبت زدہ غلام فطرت ماؤ ہمیں بادہ دیرینک بزدل، بیکار، بے غیرت اور بے حیا نہ بناؤ۔ اس وقت سارے باغوں پہ غلامی کے عفریت نے اپنے پروں سے سایہ کر لیا ہے اور وہ اپنی مقدس ہنسی کی آڑ لے پر ابدی غیرت کے میٹھے اور مدھر گیت نہیں گا سکتے۔

اے ماتا! ہم صبح سویرے ماحول کے گرم و تُند گیتوں کا شور سُن کر بیدار ہوئے ہیں ہماری رگوں میں سویا ہوا خون جاگ پڑا ہے، وہ خون جو ہمارے آباؤ اجداد سے ہمیں زندگی کے تحفہ کے طور پر ورثہ میں ملا ہے۔

یہ ورثہ ہم سے اپنے استعمال کا مطالبہ کرتا ہے۔ قرضخواہ اپنا قرض طلب کر رہا ہے، اے ماتا! ہمیں جانے دے۔ جانے دے، ہم اب وہ حالت برداشت نہیں کر سکتے جس کا برداشت کرنا سب سے بڑی ذلت ہے۔

صبح کی سپیدی دُکھیا کنواری کی مضمحل و غم زدہ آنکھوں کی طرح بے نور ہے اور تیریوں کے چہچہے مدھم پڑے ہوئے ہیں۔ ابھی فاختہ نے اپنی پرارتھنا ختم بھی نہ کی تھی کہ صیاد نے اس کو ایک ہی تیر میں خون اور پروں کی گیند بنا کر کانٹوں کی جھاڑی پر گرا دیا اور وہ ایک شاخ پر اٹک کر رہ گئی ———

اے ماں! آ ہم تجھے ظلم کا یہ پرچم دکھائیں ——— جانے دے، جانے دے پیاری اماں! ہمیں جانے دے انتقام کی تیز آگ ہماری رگ رگ پے پے میں بھڑک کر ہمیں آتشکدہ بنا چکی ہے۔ یہ آتشکدہ تیرے آنسوؤں سے ٹھنڈا نہیں پڑ سکتا۔ اس کو تو دشمن کے گرم خون کی بارش ہی سرد کر سکتی ہے۔

اے ماں! تو کیا سوچتی ہے۔ ہم تیرے وہی پوت ہیں جو شب و روز شراب اور گیت سے کھیلتے تھے اور رقاصہ لڑکیوں کے گھونگروؤں کی آواز پر ناچتے ہوئے اپنی راتیں گنواتے تھے مگر آج ہم موت کے فرشتوں کے کاندھوں پر سوار ہو کر اُس میدان کی طرف جا رہے ہیں جہاں توپوں اور ٹینکوں سے ہم کو کھیلنا ہے۔ ہم نے شراب کے مٹکوں کو اپنی جنگی چپلوں سے اوندھا دیا ہے۔ پیالوں کو میخانے کے فرش پر چکنا چور کر دیا ہے چھاگلیں سڑکوں پر پھینک دی ہیں۔ دیواروں پر چھائی ہوئی انگوروں کی شاداب بیلوں اور نیم تیار خوشہ ہائے تاک کو ریزہ ریزہ کر دیا ہے۔ ہم نے رقاصہ لڑکیوں کو ہاتھ پکڑ کر اس زور سے جھٹکا دیا کہ ان کی سُرخ چوڑیاں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین پر گر گئیں۔ ان کے آنسو آج ہم کو متاثر نہیں کر سکے اور کیوں کر سکتے تھے آخر تو ہم ارجن و بھیم کی اولاد میں سے ہیں۔ ہم نے ان کے وداعی گیت، درد انگیز اور غمناک گیت نہیں سُنے اور کیوں سُن سکتے تھے! ہمارے کانوں میں معصوم مظلوموں کے بین و بکا کی آوازیں سمائی ہوئی تھیں ہمارے کان اُن مہیب نغمے

کے شور پہ لگے ہوئے تھے "جو وقت کے" خوفناک مغنّی کے لبوں سے بلند ہو رہا تھا۔

ماتا! اے ماتا! ہم نے اپنی منگیتر کنواریوں کو بھی نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا اور کیوں دیکھتے جبکہ ہماری نیّت اور ہمارا ارادہ اپنے وطن پر قربان ہو جانے کا ہے۔ اے امّاں! ہم اس وقت تم سے دودھ بخشوانے کیلئے آئے ہیں۔ ——— آخری بار صورت دکھانے کیلئے آئے ہیں۔

اے ماں! اس قدر نہ چیخ، خدا کی قسم ہماری روح اپنے فرض کو بھول جائے گی، خدا کی قسم اس طرح نہ رو ہم صبح سویرے "کافر" ہو جائینگے۔ خدا کیلئے سر کو اس قدر نہ پیٹ کہ تیرے سفید بالوں کا ریشم بالکل بکھر جائے اور ہماری رگوں میں جوش مارنے والے خون کے بجائے آنسو دوڑنے لگیں۔

امّاں! امّاں! بوا! بوا! دامن نہ پکڑو ورنہ گریبان چاک کر دینگے یہ بزدلی، یہ کمزوری، دھرم سے یہ غدّاری اصول سے یہ بغاوت فرض سے یہ بد عہدی، اے ماؤ یہ تلواریں پڑی ہیں گلے کاٹ دو مگر ہمیں لامذہب نہ بناؤ،

. . . .

. . . .

. . . . ہمارا دامن نہ پکڑو، تمام دنیا اس وقت اپنے باغوں کی عزّت اور عزّت کی حفاظت کیلئے سینہ سپر ہے

. . . . ہمارے شاداب میوہ دار باغ میں ایک مدّت سے آندھیاں چل رہی ہیں، خزاں اور صیّاد کے ظلم اپنے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں، ہر درخت کی جڑ کھوکلی ہے، ہر نخل مرجھایا ہوا ہے۔ ہر پھول پژمردہ ہے۔ خوش رنگ چڑیاں پیاس سے بے تاب ہو کر شاخوں پر اپنی چونچیں کھولے ہوئے آسمان کی طرف مایوسانہ نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں۔ لُو کے گرم تھپیڑے خشک پتّوں کو بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتے، ذرّہ ذرّہ قوّت سے مغلوب ہے، قطرہ قطرہ آلام کے سمندر کی فلک بوس موجوں سے تھرتھرا رہا ہے۔ آسمان ہمارے نہیں رہے۔ زمین ہماری نہیں رہی در و دیوار ہم سے خفا ہیں کائنات ہم سے ناراض ہے۔ تمام لالہ زاروں کے محافظ ہمیں ذلّت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اے ماؤ ہم نے اس خفگی کے راز کو معلوم کر لیا ہے، ہم اپنی بے مائگی کے بھید کو تاڑ گئے ہیں ہم نے اپنے فرض کو بھلا دیا تھا، وہ مقدّس فرض، آج تیرے پوتوں کے سوئے ہوئے دلوں میں ایک بہادر کی طرح انگڑائی لیکر جاگ اُٹھا ہے۔ ہماری آنکھوں میں میدانِ جنگ کا نقشہ گردش کر رہا ہے۔ ہمارے گھوڑوں کے سُموں کے نیچے غنیم کی روح سسکتی نظر آتی ہے۔ ہماری تلواریں ہمارے رائفل ہمارے خنجر سب اپنی اپنی جگہ چمک رہے ہیں۔ ہم بہادر ہیں ہم اپنے باغ کے پھولوں کی حفاظت کیلئے خوفناک جہاد کیلئے تیار ہوئے ہیں۔ اے ماؤ ——— چھوڑ دو ہمارے گھوڑوں کی باگیں، ——— !

(۲)

نوجوان مجاہد اتنا ہی کہہ سکے تھے کہ کمسن کنواریاں اپنے اپنے چھپر کھٹوں پر جاگ اُٹھیں۔ ایک نے حیرت سے دیکھا ——— دوسری نے کچھ کہنا چاہا ——— تیسری رو پڑی، بھیّا! کہاں چلے؟ بیرن! کدھر جاتے ہو، کیا شکار کیلئے تیر و کمان سنبھالی ہے؟

ہاں شکار کو جاتے ہیں! مجاہدین نے جواب دیا۔ ظالم اور غاصب کے شکار کو جس نے ہمارے باغ کی زندگی کو شکار کرنے کی ٹھانی ہے۔

بہنوں نے اُٹھ کر دیکھا ——— اور بولیں: —

دوش پر نیزے اور کمروں میں تلواریں، جسموں پر زرہ بکتر۔ گھوڑے جنگی سامان سے آراستہ! بھیّا اب کاہے کو لوٹ کر آؤ گے۔ بیرن! اب کیوں اپنی بہنوں کو مکھڑا دکھاؤ گے! بھیّا! یہ عمر تو مرنے کی نہیں ہے، سہرا بندھنے کی ہے۔

"خاموش!" ——— مجاہدین نے تھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ غیرت مند وطن پرست اپنے مقدّس چہروں پر پھولوں اور کلیوں کے سہرے نہیں باندھا کرتے خون کے سُرخ موتیوں کا سہرا ان کے رُخ پر بندھتا ہے، بہنیں ان کے ماتھے پر ٹیکا نہیں لگاتیں، بلکہ حیاتِ جاوید

۱۷ ان کی جبیں پر خود اپنے ہاتھ سے کبھی نہ مٹنے والا قشقہ لگاتی ہے جو سورج بن کر ابد الآباد تک چمکتا رہتا ہے ——— "خاموش!" اے راجپوت بہن! چپ ہو۔ اے بابر کی نسل کو بدنام کرنیوالی لڑکی!

کنواریوں نے پھر رونا شروع کیا، بھائیوں کے دامن پکڑ کر بیٹھ گئیں اور بولیں: —

بھیّا مت جاؤ! اور جاتے ہو تو ہم کو بھی ساتھ لے چلو! امّاں! اب کاہے کو لوٹ کر آئینگے، ماؤں نے سنا اور دہاڑیں مار کر رونے پیٹنے لگیں۔ کاہے کو آئینگے، جا کر کون آتا ہے، پرمی کی گرمی پکھورٹے ہی جا رہے ہیں جو ہنس بول اور تما کو پی کر چلے آئینگے۔ آگ اور خون کے میدانوں میں جا رہے ہیں، موت کی کوٹھڑی کی کنڈی کھٹکھٹاتے ہوئے ہمارے پیارے جانے کہاں گم ہو جائینگے!! یہ ہمارے لاڈلے، یہ جوان جوان پوت، یہ مونگے کے دانے، یہ ہیرے کے ٹکڑے ہیں پر ماتما! یہ یوں ہی چلے جائینگے۔ اے خدا ہمیں باغ کی پروا نہیں، کوئی اُس میں آگ لگائے تو لگا دے، کوئی اُسے لوٹے تو لوٹ لے، کوئی اس پر قبضہ جمائے تو جما لے، مگر اپنے بچّوں کو نہ جانے دینگے۔ پھل نہ آئے باغ نہ پھولے۔ ہمارے پھول سدا بہار پھول یوں ہی شاداب رہیں۔ سندری دوڑ ——— کنڈی تو لگا ——— کوئی ہمارا جاز

کے بغیر جاسکتا ہے؟ ——— جاؤ گے؟ ——— جاؤ گے؟؟
مائیں نے اپنی ماتا سے متاثر ہو کر غضبناک دیوانگی کے ساتھ کہا۔ مجاہد بیٹوں نے سر جھکا لیا۔

اے بچو! اے ناتجربہ کار جوشیلے نوجوانو! ہماری اجازت کے بغیر جا سکتے ہو، ماتا کو خود روی کی درانتی سے ذبح کرو گے، پریم کا گلا جوانی کے تیز چاقو سے کاٹو گے؟ محبت کا گلا گھونٹو گے؟ کدھر ہیں تمہاری تلواریں؟ ——— کہاں ہیں تمہارے تیر؟ ——— کمانیں بازوؤں سے گرادو، گھوڑوں کی پیٹھوں کی زین اُتار دو۔ جنگی لباس کے ٹھک کھولدو ——— بڑے آئے باغ کے رکھوالی ——— بڑے بہادر۔ بڑے سورما۔ شراب کے پیالے توڑ آئے اناج نہیں دیکھا، مہارشی اماؤں کے حکم کے بغیر تم کچھ کر سکتے ہو، مگر آہ ہمارا پیارا دیس جسکی زمین پر تمہاری طرح روتی ہوئی ہم بھی پیدا ہوئی ہیں۔ یہ بچپن کا جھولا، یہ جوانی کی جولانگاہ!!

(۴)

ہاں یہی دیس، وہی دیس، آج ایسی مشکل میں ہے جس میں خدا کسی کو نہ ڈالے، وہی باغ آج اُسی میں ظلم اور تشدد، سختی اور جبر کی وہ آندھی چل رہی ہے جو ایک ہری شاخ اور ایک پھول کی پتی بھی باقی نہ چھوڑیگی جائینگے ہم اپنے پیارے دیس کو بچانے کیلئے اُسکی عزت پر مرمٹنے اور کٹ مرنے کے لئے ہم اپنی جان کی بھینٹ دیس کے اُس مندر پر چڑھائینگے جس کا سنہری کلس عرش الٰہی کو بوسہ دیتا ہے۔

چھوڑدے اماں! ہمارے گھوڑوں کی باگیں اور ہمیں جانے دے،

"نہیں"، ماتا نے بآواز بلند بے تاب ہو کر کہا اور اسکے بعد ماؤں کے ہاتھ جن میں چوڑیاں وداعی گیت گا رہی تھیں مجاہدین کی گردنوں میں حمائل ہو گئے۔ گئو ماتا خواب سے بیدار ہو گئی۔ طوطے نے چہچہانا شروع کیا مویشیوں کے گلے میں گھنٹیاں بجنے لگیں، بیٹوں نے ماؤں کے حکم سے تلواریں زمین پر ٹیک دیں کمانیں بازوؤں سے اُتار دیں ترکش ایک طرف رکھدئے، چہرے سُرخ تھے، آنکھیں نکلی پڑتی تھیں، سینے تنے جاتے تھے، اسی حال میں مجاہدین نے کہا:۔

ہم تمہارے بغیر کچھ نہیں کر سکتے، پانی بھی نہیں پی سکتے، تنکا بھی نہیں اُٹھا سکتے ——— مگر ——— اے ماؤ، کیا صدیوں کی غلامی نے تمہارے خون کو سرد کردیا ہے تم اپنی قومی روایات کو بھول گئیں، اگر اگر آج سے برسوں پہلے پتا بائی کے بجائے (جس نے وفاداری کی خاطر اپنے بیٹے کو کٹا دیا تھا) تم پیدا ہوئی ہوتیں تو کیونکر کام چلتا ———

ہم نہیں جائینگے دیس کی سیوا کرنے کیلئے مگر اے ماں! اس حقیقت سے انکار کردے کہ تو راجپوتوں کی اس قوم سے نہیں ہے جس نے جواہر بائی جیسی بہادر عورت پیدا کی جس نے میدان جنگ میں اپنی تلوار کے جوہر سے بہادروں کے دل ہلا دئے۔ اے ماؤ! ماتاؤ! ڈوبی ہوئی ماؤ! کرم دیوی بھی تمہاری ہی طرح ایک عورت تھی مگر وہ سچی "راجپوتنی" تھی جس نے اپنے دیس کی سیوا کیلئے تلوار اُٹھائی اور دشمن کو مار بھگایا۔

اے ماں! گو امتداد نے ہماری خصوصیتوں کو برباد کر ڈالا مگر ابھی زمانہ نورجہاں، کلاوتی اور ساوتری کو فراموش نہیں کر سکا ہے جو تمہاری ہی طرح بیٹوں کی مائیں تھیں۔ کلاوتی اور ساوتری ——— وہی ساوتری جسنے شیواجی کے چھکے چھڑادئے۔ کلاوتی ——— وہی کلاوتی جس نے علاؤالدین سے خوفناک جنگ کی اور زخم خوردہ شوہر کے زخم کا زہر چوس کر وفا کی راہ میں قربان ہو گئی۔

اے ماؤ! ہم دیس کی سیوا کیلئے تیار نہیں ہیں اگر تم یہ کہدو کہ "ماتا سچ مچ دُنیا میں بدترین جذبہ ہے اور تم اُس مہارانی کی نسل سے نہیں ہو جس نے اپنے شوہر جسونت سنگھ راٹھور کے ناکام واپس ہونے پر قلعہ کے دروازے بند کر لئے تھے اور کہا تھا کہ بہادر راجپوت یا فاتح کی حیثیت میں لوٹتا ہے یا شہید کے روپ میں۔ یہ کون میرے دروازے پر واپس آیا، کہدو کہ میں اسکی بیوی نہیں ہوں جو میدانِ جنگ سے ناکام ہو کر زندہ واپس آجائے۔

ماؤ! کہو۔ کہو۔ کیا تم اُسی قوم سے ہو جسکی عورتیں اپنی کوکھ سے رام اور پرشرام اور بھیشم، درونا چاریہ اور ارجن پیدا کرتی تھیں جو غیور تھیں، خوددار تھیں، بہادر تھیں، مستقل مزاج تھیں، آزادی پسند تھیں اور جنہوں نے آریہ ورت کے ذرّے ذرّے کو اپنا کلمہ پڑھنے کیلئے مجبور کر دیا تھا۔

اگر ابھمن کی ماں زندہ ہوتی تو ہم اُس سے کہتا کہ سچے بہادر کی بہادر ماں تیری آتما پر رحمت ہو کہ تو نے بزدل اور اشوتھامان کی گھمسان فوج میں شاندار رتھ کو چکر لگانے سے روکا نہیں، لیکن میری ماں! مجھے میرے دیس کی سیوا کرنے سے روکتی ہے اور وہ پھر بھی سمجھتی ہے کہ "راجپوت کی راجپوت بیٹی ہے"۔

بوڑھی مائیں شدت تاثر سے چیخ اُٹھیں۔ انکی آنکھوں سے عظمت و جلال کی کرنیں پھوٹ کر مجاہدین کی نگاہوں کو خیرہ کئے دیتی تھیں۔ انکے تنے ہوئے ابروؤں میں رام دھنش کھنچا ہوا معلوم ہوتا تھا ان کی نگاہوں سے تیغ امام چمکتی ہوئی معلوم ہوتی تھی انکی آنکھوں کی سُرخی میں جنہیں تپا رکھتیں وہ اُن میں بھسم ہو جانا چاہتی تھیں طعنوں کی بیل بوچھاڑ اتنی بڑی گالی اپنے خون کی ارتقائی شکل کی طرف سے شرم کرو۔ اے ماؤ اگر تم جلد یہ جان لیتیں کہ دیس کی سیوا اور اپنے باغ کی

(بقیہ مضمون دیکھو صفحہ ۵ پر)

کسوٹی

کسوٹی

نئی کتابیں

نئے ادبی رجحانات

اسرار کریمی پریس الہ آباد سے حال ہی میں ایک کتاب "نئے ادبی رجحانات" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے مصنف سید اعجاز حسین الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر اور اُردو ادب کی مشہور شخصیت ہیں۔ نظم و نثر پر علیحدہ علیحدہ اظہار خیال کیلئے کتاب دو حصّوں میں منقسم ہے۔ نظم کا آغاز دکن کی اُردو شاعری، ولی اور اس کے معاصرین سے کیا گیا ہے۔ اُردو شاعری کی ابتدا تصوّف آمیز عشق سے ہوئی۔ اور غالب تک اسی پُرانے ڈھرّے پر چلتی رہی کچھ تو ہندوستان
۴۷ کی سرزمین ہی اتنی مہربان واقع ہوئی ہے کہ انسان کو بھوکا نہیں مرنے دیتی اور کچھ ایرانی کلچر اور فارسی شاعری کے پرتو ہندوستانی زندگی پر گہرے پڑتے رہے۔ ہندو قوم اور اس کے کلچر میں خود کوئی جان باقی نہ تھی۔ ان کی زندگی ویدانت، بدھ مت کے نیاگی اصولوں، کرشن بھگتی، رام پریم، اور ایسے ہی مختلف نشوں کے بعد غضب کا رچاؤ پیدا کر چکی تھی۔ فارسی نعزل کے گہرے اثرات نے اس دور کے ہندوستانی کو سخت عاشق مزاج بنا دیا، غزل خود بھی اسی قسم کے سامانوں کو چاہتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو شاعری کی کوئی ایسی مضبوط بنیاد نہ پڑ سکی جس میں نشوونما کی خاص قوت ہوتی۔

لیکن دوسرے ملکوں خاصکر انگریزی شاعری ہی کو لیجئے چاسر کے بعد اب تک بتدریج ترقی کرتی نظر آئے گی۔ ہر آنے والے نے اپنے حصّہ کے دو چار قدم اُٹھائے اور دوسرے کے لئے راستہ بناتا چلا گیا۔ مگر لکیر کے فقیر ہندوستان تکاہل نشان میں کبھی کسی کو قدم اٹھانے کی جرأت نہیں ہوئی۔ جو بھی آیا اُس نے بزرگوں کے اثاثہ کو سینہ سے لگایا اور اسی پر فخر کرتے کرتے دم توڑ دیا۔ اس طرح یکے بعد دیگرے لوگ مرتے چلے آئے اور اپنے پیچھے مردہ شاعری کا ایک قبرستان بھی چھوڑتے چلے گئے۔

کتاب کے پہلے باب میں ولی سے لیکر سودا اور درد کے موضوعات شاعری کے متعلق اشارے کئے گئے ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر ان موضوعات کو جو غیر شعوری طور پر قلم سے نکل گئے ہوں گے باقاعدہ اپنا لیا جاتا تو ہمارے دور کی بہت پہلے ابتدا ہو گئی ہوتی۔ اور شاعری نہ معلوم اب تک کتنے قدم اُٹھا چکی ہوتی۔

بہرکیف پہلے باب میں غزل کی ابتدا و ارتقا کا تذکرہ کرنے کے بعد یہ دور امیر مینائی اور داغ پر ختم ہو جاتا ہے جسے اعجاز صاحب نے ان الفاظ میں ختم کیا ہے:۔

"ادبی دور کی تقسیم کے لحاظ سے اب قلم کا مسافر اس مقام پر آگیا ہے جو قدیم و جدید اُردو شاعری کا سنگم ہے، جہاں پرانی شاعری کے سربرآوردہ شعرا نئی شاعری کے علمبرداروں سے مل رہے ہیں۔ آزاد و حالی امیر و داغ کا احترام کرتے ہوئے اپنی عمارتوں کے نقشے مرتب کر رہے ہیں اور کہتے جاتے ہیں کہ ہم کسی طرح آپ کی منقصت گوارا نہیں کر سکتے۔ آپ کے کارنامے کبھی بھلا نہیں سکتے۔ صرف زمانہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے اُردو شاعری کا دائرہ وسیع کرنا چاہئے حسن و عشق کی منزلیں طے ہو چکی ہوں۔ یا ابھی باقی ہوں اب ادب کو وطن کی بیداری کے لئے موزوں بنانے دیجئے۔"

اس طرح انھوں نے پُرانے دور کا خاتمہ کیا ہے۔ اس دور کے ساتھ تقریباً وہ تمام پُرانی بدعتیں بھی ختم ہو گئیں جو استادی و شاگردی سے تعلق تھیں اور شعر کو بنئے کی طرح ترازو میں تولنے کا انداز بھی باقی نہ رہا نئے دور کا آغاز حالی اور آزاد سے ان الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

"مغربی تہذیب و تمدّن کا اثر یہ بھی تھا کہ اب ہندوستانیوں کو صاف نظر آنے لگا کہ دُنیا بدل گئی ہے، پُرانے طرز زندگی سے کام نہ چلے گا۔ نئے اصول مرتب کرنے پڑیں گے، وضع قطع، ادب، سب کو تبدیل کرنا پڑے گا۔"

چنانچہ اُردو شاعری نے وضع قطع تبدیل کرنی شروع کی۔ آزاد نے نئے رجحانات کی تشکیل کی، حالی و اسمٰعیل نے بڑھ کر ہاتھ بٹایا۔ غرضکہ مغربی تمدن اور خیالات نے اردو شاعری پر یہ اثر ڈالا کہ آزاد حالی اور اسمٰعیل نے نئے رجحانات کے ماتحت نظمیں کہنی شروع کر دیں۔ حالانکہ ماحول سازگار نہ تھا۔ اس لئے کہ ابھی پرانے دور کا خمار اور ہلکی سی غنودگی دماغوں میں رچی ہوئی تھی۔

اگر ہم ذرا پیچھے مڑ کر دیکھیں تو ابھی معلوم ہو جائے کہ انشار جرأت اور مصحفی سب کے سب ایک مسخرے پن میں مشغول ہیں۔ راس و رنگ، حسن و عشق، اور شیخ کی دستار، میخانہ و پیمانہ موضوع شاعری بنے ہوئے ہیں۔ اصل میں مٹتے ہوئے جاگیردارانہ ماحول کے اثرات باقی تھے، مسلمانوں میں تعیش کی لہر دوڑی ہوئی تھی، غزل نے محاورات نگاری معاملہ بندی اور عشق و محبت کے پست جذبات کے لحاظ سے ترقی کی، وہی پرانا ڈھچر، اِدھر کے الفاظ اُدھر، اُدھر کے فقرے اِدھر کر دئے اور شاعری کا فریضہ ادا ہو گیا۔ چنانچہ ہم میر۔ غالب اور مومن کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ غزل میں کسی کی طرف اشارہ نہیں کر سکتے، سب اسی ڈگر پر چلتے رہے اور انھیں الفاظ و خیالات کا اعادہ کرتے رہے الفاظ کی توڑ جوڑ اور زبان کی چٹکاریاں ان لوگوں کے نزدیک معراجِ کمال تھی۔

ہمارے موجودہ دور کے رجحانات کی بنیاد حالی، آزاد، اسمٰعیل ہی کے ہاتھوں پڑ چکی تھی۔ ان موضوعات کو جو غزل میں کبھی کبھی اپنی جھلک دکھاتے تھے، باقاعدہ شاعری کا موضوع بنایا گیا، اور شاعری نے اپنا دقیانوسی چولا تبدیل کر ڈالا۔ جدید شاعری کی داغ بیل ڈالنے والوں کا ذکر مصنف نے ان الفاظ میں کیا ہے :۔

> "جدید شاعری نے ابتدا ہی سے اپنے رجحانات کی فہرست میں عملی پہلو کو سب سے اہم جگہ دی، اخلاقیات تمثیلات کے پردے میں ہندوستان کو عملی جدوجہد کی طرف نہ صرف توجہ دلاتی رہی بلکہ ان سے دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ آزاد، حالی اور اسمٰعیل متعدد نظمیں اسی نقطۂ نگاہ سے لکھتے رہے"

نظم معرّیٰ جسے ہمارے شعرا آج رواج دینا چاہتے ہیں آج سے بہت عرصہ پہلے جدید شاعری کے بانیوں کے ہاتھوں اس کی ابتدا ہو چکی تھی لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح اُس وقت دماغ اس اسلوب نظم سے واقف نہیں تھے، آج بھی نہیں، اور اگر ہیں بھی تو شاذ و نادر ہی، مگر یہ انداز بھی نظر آتے ہیں کہ شاید ہوتے ہوتے خوگر ہو ہی جائیں گے۔

کتاب میں شاعری کے ذیل میں جس مسئلہ پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے وہ شاعری میں پیدا ہونے والے مختلف قسم کے رجحانات ہیں ساری کتاب سیاسی، معاشی، معاشرتی، سماجی اور تعلیمی تبدیلیوں اور تقاضوں کے ذکر سے بھری ہوئی ہے۔ اور اس طرح شعراء اُن کے اسالیب کلام اور ان کی خصوصیاتِ شاعرانہ کو پس منظر میں دبا دیا گیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی قوم کا ادب اس کی ذہنی کشمکش کا آئینہ ہوتا ہے۔ یہ وہ دور تھا کہ جب مغربی نیشنلزم سے متاثر ہو کر اور انگریزی تعلیم کے نتائج کے طور پر ہندوستانی اپنے پر پُرزے نکال رہے تھے۔ جن لوگوں کے ہاتھوں میں ادب تھا وہ بہت دور رس تھے وقت کی ضرورت کو سمجھتے تھے، اور اچھی طرح جانتے تھے کہ یہی وہ دور ہے جب مسلک کے قدیم ذہنی سانچے کو توڑ کر نئے سانچوں میں جدید رجحانات کو ڈھالنا ہوگا۔ چنانچہ کوششیں شروع ہوئیں اور برابر جاری رہیں۔

ان رجحانات میں جو سب سے زیادہ نمایاں رجحان ہے وہ سیاسی تقاضات ہیں ہندو مسلمان دونوں کوشش رہے تھے کہ کسی طرح ملک متحد ہو۔ اس کوشش کے سلسلہ میں قومی و وطنی ادب کی پیداوار بہت اعلیٰ درجہ کی نہ سہی مگر متوسط معیار کی ضرور تھی۔ اقبال کی متعدد نظمیں اس سلسلہ میں بڑا درجہ رکھتی ہیں۔ اس کے بعد چکبست تو اس مشن میں پیش پیش تھا۔ اس زمانہ میں ہوم رول اور سیلف گورنمنٹ کے مطالبہ ہو رہے تھے۔ ہندو مسلمانوں کے ذہنوں میں سے ابھی اپنی گزشتہ "حاکمیت" کا تصور نہیں نکلا تھا، مغرب کی تحریکوں نے انھیں اور جھنجھلا دیا، سیاسی تحریکوں کے لیڈر ایسے جلنے بوجھے لوگ تھے جن پر ہر شخص کا ایمان تھا۔ تحریک خلافت ترک موالات کی تحریک، سول نافرمانی، اور عام طور پر ایک قوم پرستی کی روح ملک کے گوشہ گوشہ میں دوڑ گئی۔ ہر بار، ہر تحریک کو حکومت کی طرف سے کچلا گیا لیکن ملک میں وطن پرستی کا جذبہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ مغربی تعلیم کے اثرات، دوسرے ممالک کی سیاحی کا پرتو، یورپین اقوام اور ممالک کے طور طریقے اور ان کا انعکاس، ذہین ہندوستانی بے چین ہو گئے کہ کسی طرح ملک کو آزاد کرا ہی دیں۔ موجودہ نظام سے باغی بھی تھے اور متاثر بھی، اس لئے چاہتے تھے کہ کسی طرح سہی، خواہ تعاون کرکے خواہ ٹکرا کر بہر حال ہندوستان کے لئے کچھ کر گزریں۔

ان تمام طوفانوں کے ساتھ جو چیز سب سے زیادہ کارگر ثابت ہوئی وہ مادی خیالات کی رو تھی، دُنیا کا ایک ملک اس کا تجربہ کر رہا تھا۔ انقلابات ظہور اور وجود میں آ رہے تھے۔ مگر یہ تمام خیالات صرف تعلیم یافتہ

اور دماغی طبقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ عوام ابھی اُسی طرح اونگھ رہے تھے ہندوستان کی اسّی نوّے فیصدی دیہی آبادی میں اس رو کا احساس بھی نہ تھا۔

دماغی طبقوں ہی سے ادب کا تعلق ہے، چنانچہ نثر و نظم پر مارکسی خیالات اور سوشلزم کے مجموعی اثرات کا عکس پڑا۔ مختصر کہانی پر پریم چند تک تو طالسطائی کی اخلاقیاتی کیفیات چھائی ہوئی تھیں۔ مگر اب نئے موضوعات سرمایہ، سرمایہ دار، مزدور، کسان، غریبی، امیری اور اسی قسم کے دوسرے مضامین پر اظہار خیال شروع ہوا۔ کہانی کے پس منظر میں ایک نئی دُنیا جھلکنے لگی۔

شاعری کے رجحانات قومی بھی بدلنے شروع ہوئے، حالی کی مرثیہ خوانی، اقبال کی بین الاسلامیت، چکبست کی وطن پرستی، اور پرانی دنیا کو واپس لانے کے تمام نعرے بیکار اور دقیانوسی قرار دئے گئے جس مرکز پر حالی اور آزاد وغیرہ نے شاعری کو چھوڑا تھا نہ صرف یہ کہ اس مرکز سے شاعری نے حیرتناک ترقی کی بلکہ منزلوں آگے نکل گئی۔ تمام شعرا نوجوان تھے، مارکسی خیالات کے دلدادہ، پیکار کیلئے ہر وقت تیار شاعری ان کا ذریعہ معاش نہ تھی، یہ بھی اک چیز تھی جو زندگی کے اور شعبوں کی طرح زندگی میں شامل تھی، یہ اپنے بزرگوں کے مقابلہ میں من چلے اور آزاد تھے، ان سے اور دربار دل کے آسروں سے کیا تعلق!؟ یہ اس گروہ میں سے نہیں تھے جو امرا، کے سہارے دن تبر کرنے کی فکر میں ہی زندگی گزارتا تھا۔

ان شعرا اور ادیبوں کے نزدیک قومی حکومت کے ماتحت آزادی ملنا ہی کافی نہ تھا، بلکہ وہ اپنے ادب میں سامراج کی مخالفت کرکے اک نئی اشتراکی دُنیا کی مبادیات کی داغ بیل ڈالنا چاہتے تھے، اب بھی ملک کی قومی تحریکوں سے انکا اتحاد عمل سہی، مگر محض ملک کی داخلی آزادی یا سامراجی نظام کے ماتحت کامل آزادی بھی ان کا مقصود نہیں۔ اسی طرح وطن پرستی کے جذبہ میں زیادہ وسعت، گہرائی اور زور پیدا ہو گیا۔ ان تمام سیاسی رجحانات کے متعلق مصنف نے جگہ جگہ اس طرح اشارے کئے ہیں :-

"جنگ عظیم کے زمانہ ہی میں غلّہ، کپڑا اور دیگر ضروریاتِ زندگی کی گرانی نے لوگوں کی اقتصادی حالت ابتر کر دی تھی اس کے بعد بھی کم و بیش اب تک وہی عالم تھا، صنعت و حرفت کی حالت یہ تھی کہ کارخانے زیادہ تر (۸۷ فیصدی) انگریزی سرمایہ سے چل رہے تھے، دوران جنگ برطانوی جہازات افواج اور اسلحہ جات پہنچانے میں مصروف تھے اور تمام ممالک کام کے حاجتمند تھے۔"

"۱۹۱۸ء میں انفلوانزا کی بیماری ہندوستان کیلئے ایسی مہلک اور عالمگیر ثابت ہوئی کہ کوئی آٹھ لاکھ آدمی مر گئے مزدور طبقہ میں اس وبا کا حملہ کچھ زیادہ نہیں رہا، اتنے مرے کہ کارخانوں میں ہر طرف مزدوروں کی مانگ ہونے لگی، مزدوروں نے موقعہ سے فائدہ اُٹھا کر کارخانے والوں کے سامنے اور مطالبات پیش کئے۔"

مطلب یہ ہے کہ اس قسم کے حالات، تحریکات، مزدوروں اور نچلے طبقہ کے لوگوں کی جدوجہد اور مارکسی خیالات نے نوجوانوں پر کافی اثر ڈالا، ان کی روحوں میں جو آگ دبی ہوئی تھی وہ ان کی زبانوں سے پھوٹ پڑی، وہ ایک نئی دُنیا کا خواب دیکھنے لگے۔

ان تمام حالات و خیالات کو مصنف نے کامل طور پر واضح کیا ہے، آغاز سے لیکر موجودہ وقت تک کا پورا خاکہ نگاہوں کے سامنے پیش ہو جاتا ہے۔

اس خاکہ کو دیکھنے کے بعد کوئی تعجب نہیں اگر ہمارا موجودہ ادب ظہور میں آیا۔ کیونکہ نوجوانوں نے سیاسی رجحانات سے بھی فائدہ اُٹھایا اور غیر ملکی ترقی یافتہ ادب سے استفادہ بھی کیا۔ اوّل اوّل اشتراکی ادب کو حکومت نے روکنا چاہا، لیکن نوجوان بڑھتا ہی چلا گیا، اور رفتہ رفتہ تمام ملک مشتعل ہو گیا۔ لوگ جیلوں میں بند کئے گئے، مگر وہ اثر جسے ذہن و دماغ قبول کر چکے تھے، اُسے بہ کوشش بھی نہیں مٹایا جا سکا۔

اصل میں یہ کتاب موجودہ ادب کا ایک سرسری پس منظر ہے، ادب اور ادیب شعرا اور شاعر سے کچھ زیادہ بحث اس میں نہیں کی گئی ہے۔ تمام کتاب محض رجحانات سے پُر ہے، باوجود اس کے مصنف نے جس چیز پر سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ محض آزاد اور اس کے ہم عصر ہیں، جب وہ موجودہ شعرا کا تذکرہ کرنے پر آتے ہیں تو ان کا قلم سست پڑ جاتا ہے، اور وہ محض ان کے نام گنا کر رہ جاتے ہیں، کہیں کہیں موجودہ شعرا کے کلام کے نمونے بھی انھوں نے دئے ہیں، مگر اس سے وہ تشنگی دور نہیں ہوتی جو محسوس ہوتی ہے

وہ شعرا جنھوں نے اوّلین ترقی پسندانہ شاعری کی ابتدا کی، یقیناً قابلِ ستائش ہیں، لیکن اب اُردو شاعری اُن کے کارناموں سے بہت آگے نکل گئی ہے، کتاب میں بار بار اُن لوگوں کا ذکر ہے اور موجودہ دور کے کہنے والوں کا محض نام لیکر چھوڑ دیا گیا ہے۔

حالیہ شعرا کے کلام پر باقاعدہ مبسوط تبصرہ کی ضرورت تھی، اُنکی

توانائیوں اور کمزوریوں کا ذکر کیا جاتا یا اگر یہ نامناسب تھا تو پھر محض "رجحانات" کا تذکرہ کر کے کتاب کو ختم کر دیا جاتا۔ کچھ لوگ اس سختی سے سراہے گئے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کتاب انھیں ممدوحین کی خاطر لکھی گئی ہے اور کچھ غریبوں کے متعلق اس سطحیت سے لکھا گیا ہے گویا یہ بھی اعجاز صاحب کے ممدوحین کا پرتو ہیں۔

مصنّف کی اس دقّت کا ہمیں اندازہ ہے، اوّل اول ان کے ذہن میں محض رجحانات نگاری کا تصوّر تھا، جیسے ہی انھوں نے قلم اُٹھایا رجحانات پیدا کرنے والوں کا تذکرہ بھی ضروری سمجھتے گئے۔ ان کے تذکرہ سے آگے مضمون شیطان کی آنت معلوم ہونے لگا۔ خوفِ طوالت سے اختصار سے کام لینا چاہا، بار بار پُرانے ناموں کو دُہرایا، اور جہاں نئے نام آئے ان کا محض ذکر کر کے فرض سے عہدہ برآ ہو گئے ہے۔

سید اعجاز حسین نے شعر کی ہر صنف کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، جہاں جس کی ضرورت تھی، اُسے تشنہ نہیں چھوڑا گیا، مگر بالآخر طوالت کے خیال سے تھک کر وہ ایک جگہ پہنچکر اکتا گئے، ان کا ہاتھ اور دماغ دونوں ستانے پر مجبور کرنے لگے، پھر بھی انھوں نے موجودہ دور کی شاعری کی خصوصیت کو ...... کہیں نظر انداز نہیں کیا، موجودہ شاعری جو آزاد وحالی کے بعد وجود میں آئی اس کے متعلق وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"اس قسم کی شاعری میں ایک خاص اعتماد کا عنصر ہے، انسانی قدرت کی وسعتوں پر کافی توجہ کی ہے جس کا مقصد ہندوستانیوں کو بزدلی، اور احساس کمتری کے شدید جذبہ سے الگ کرنا ہے۔"

ایک دوسری خصوصیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

"کارل مارکس کے نظریہ کے مطابق اس کے اقتصادی مفاد کی کسوٹی پر جانچا گیا، وجدان و جذباتی خصوصیات کو زیادہ جگہ نہیں دی، اگر اس قسم کی چیزیں حیاتِ انسانی کے اس پہلو کو تقویت پہنچاتی ہیں جن کا تعلق معاش سے ہے تو قائم رکھے جانے کے قابل ہیں۔"

ایک تیسری خصوصیت کا یوں ذکر کرتے ہیں:۔

"اُردو شاعری کے اس سیاسی رجحان کی ایک خصوصیت یہ بھی قابل دید ہے کہ جوش و خروش کی حالت میں اشتراکی شعراء اپنے کو اُن اوصاف سے متصف کرتے ہیں جو رومانی شعراء کو معشوقوں میں نظر آتے تھے، مگر یہ صفتیں لب و لہجہ و اندازِ بیان کی تبدیلی سے بالکل نئی خصوصیات اختیار کر لیتی ہیں، نزاکت یا نسائیت کے بجائے ان میں مردانگی و جانبازی کے عناصر شامل ہو جاتے ہیں اور یہ بدلی ہوئی ہیئت ایسی فضا پیدا کر دیتی ہے جو اپنی ندرت و لطافت کی وجہ سے دلوں پر سپاہیانہ انداز میں قبضہ کر لیتی ہے۔"

ان تمام خوبیوں کے باوجود جدید شعراء کے مزید تعارف کی کمی کی وجہ ایک پیاس سی باقی رہ گئی، پھر بھی جہاں تک کتاب کے نام کا تعلق ہے کتاب اس سے پورا پورا انصاف کرتی ہے۔

مگر فرائض کی اس تمام تکمیل کے بعد بھی، وہ آزاد نظم کا ذکر کچھ دبے ہوئے انداز میں کرتے ہیں،

ورنہ ان کے ارادوں میں وہ تساہل پیدا نہ ہوتا جو ختم کرتے کرتے پیدا ہو گیا ہے، ان کی انصاف پسندی اور وسعت نظر تو اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ حصّہ نثر میں جہاں تک تدریجی ترقیوں اور تبدیلیوں کا تعلق ہے اس کے بیان میں انھوں نے کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی، یہاں تک کہ مختلف زمانوں میں شائع ہونے والے اخبارات و رسائل اور جتنی چیزیں اُردو ادب کے ارتقاء کا سبب ہوئیں ان سب کا تذکرہ انھوں نے کیا ہے۔

قدیم نثر کا تذکرہ کرنے کے بعد اعجاز صاحب نے جدید نثر پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اور جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس کی اشاعت و ترقی میں بھی انھیں ہستیوں کا ہاتھ ہے جو نظم میں کارفرما تھیں۔ ہاں ایک دو ناموں کا اضافہ یہاں ضرور ہو جاتا ہے۔ سر سیّد احمد خاں اور شبلی نعمانی جس طرح نظم پر مغربی جذبات و خیالات کا اثر ہوا، اسی طرح نثر پر بھی ہوا، مضمون نویسی کا آغاز ہی اس دور سے ہوا، سیرۃ نگاری اور تاریخ کو بھی اُردو میں ایک مقام حاصل ہوا، اس طرح متعدد قابل قدر کتابوں کا اضافہ اُردو ادب میں ہو گیا۔

ہر چند کہ ابھی تک تنقید کا کوئی نکھرا ہوا تخیل اُردو میں نہیں آیا، لیکن بہرحال اُردو میں تنقید کے یہ اسالیب جو آجکل جاری ہیں مفقود تھے، دیوانوں پر نہایت بیہودہ قسم کی رائے زنی ہوا کرتی تھی، اس رائے زنی کا نہ کوئی مفہوم ہوتا تھا نہ کوئی مقصد، بہرحال یہ طریقہ یک لخت ختم ہو گیا۔

ڈاکٹر لی بان جیسے شخص کی اعلیٰ ترین کتاب "تمدّن عرب" کا اُردو میں ترجمہ کر لیا گیا، یہ اُردو کی نہایت عظیم الشان کامیابی تھی۔ ناول، ڈرامہ، مقالہ، رفتہ رفتہ سبھی کچھ اُردو میں ایک ارتقائی

شکل اختیار کرتا چلا گیا، سب سے زیادہ ترقی مختصر کہانی نے کی، مختصر کہانی لکھنے والوں کا ذکر کرتے وقت بھی مصنف کی رفتار سست پڑ جاتی ہے، موجودہ دور کے لوگوں سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں، ان کا موضوع صرف نئے رجحانات ہیں۔

انھوں نے اس دور کے تقریباً تمام ادبی ادلدوں کا ذکر کیا ہے ان کی کوششوں کو بھی سراہا ہے، اس دور کی چیزیں اُردو کے پروپیگنڈے سے متعلق ہیں، مثلاً سنیما، ریڈیو اور اسی قسم کی دوسری چیزیں، ان کا بھی ذکر اور ایک دو نقادوں کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن اس ضمن میں جو چیز سب سے زیادہ حیران کن ہے وہ یہ ہے کہ ایک دو ایسے مصنفوں کا ذکر کر گئے جن کے لئے اُردو ادب میں کوئی جگہ نہیں، اور دو ایک ایسے آدمیوں کو چھوڑ گئے جن کے بغیر مضمون نامکمل معلوم ہوتا ہے۔ صادق الخیری کا کام مختصر افسانہ نویسی میں ایسا نہیں جسے بھلایا جا سکے لیکن ندیم صہبائی ایسی چیز نہیں جن کا تذکرہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ پروفیسر مرزا احمد سعید ایسی شخصیت نہیں جسے اُردو ادب ایسی آسانی سے نظر انداز کر دے۔ تعجب ہے کہ اعجاز صاحب اتنی بڑی غلطی کیونکر کر گئے اور انھیں کیونکر اس کا احساس نہ ہوا۔

٧٨ جیسا کہ ہم نے کہیں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے کہ انھوں نے جہاں تک متقدمین کا تعلق ہے انھیں بہت غور سے پڑھا ہے اور اُن تمام تحریکوں کا بھی مطالعہ کیا ہے جو اس پچھلے دور میں ہندوستانیوں پر اثر انداز رہی ہیں، لیکن جہاں تک موجودہ دور کے لکھنے والوں کا تعلق ہے وہ ان سے اور ان کے کام سے لاپرواہ معلوم ہوتے ہیں

متاخرین میں یا اس دور میں ابھی تک زندہ شعرا اور ادیب ایسی بے باکی سے تو بھلائے جانے کے قابل نہیں اور پروفیسر مرزا احمد سعید ایسے کمن بھی نہیں جن کا کام کسی نے نہ دیکھا ہو اور ان سے کوئی واقف بھی نہ ہو۔

ان تمام اعتراضات کے باوجود بھی کتاب ایک بڑی کمی کو پورا کر رہی ہے اور اس میں وہ تمام رجحانات جو اُردو نظم و نثر پر اثر انداز رہے ہیں ان کا بڑی خوبی سے تذکرہ کیا گیا ہے اور اس کیلئے ادبی دُنیا کو اعجاز صاحب کا ممنون ہونا چاہیئے۔

جمالِ کشمیر

مصنفہ منشی بابو رام ایڈووکیٹ۔ فرخ آباد یوپی
قیمت بارہ آنے (۱۲)

اس کتاب میں منشی بابو رام نے مناظر کشمیر کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ نظم کیا ہے، جہاں تک موضوع کا تعلق ہے کوئی نئی بات نہیں اکثر لوگوں نے کشمیر اور مناظر کشمیر پر قلم اٹھایا ہے لیکن لوگوں کی کوشش اور منشی جی کی کوشش میں فرق اتنا ہے کہ اوروں نے محض کشمیر ہی پر اکتفا کی ہے لیکن منشی جی نے شروع سے لیکر جہاں سے کشمیر کی حدود کا آغاز ہوتا ہے انھیں نظم کرنا شروع کیا ہے، اور جتنی بھی دیکھنے کی جگہیں، تفریح کے مقامات اور عجیب روزگار چیزیں وہاں ہوسکتی ہیں چاہے وہ عمارتیں ہوں یا چشمے، دریا ہوں یا آبشار، یہاں تک کہ راستہ کی خوبصورتی تک کو نظم کیا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ ہر سیلانی کو یہ نظم ایک گائڈ کا کام دے سکتی ہے جہاں تک نظم کی خوبیوں اور شاعرانہ کوشش کا تعلق ہے اس میں کوئی کوتاہی نہیں معلوم ہوتی۔ نظم کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو اپنے قلم، خیالات اور زبان پر پورا پورا اقتدار ہے، اور یہی سب سے بڑی خوبی کی بات ہے۔

کیا فسوں ساز تھا وہ لہجۂ طنزِ دلدار
بن گیا چشمِ زدن میں وہ چمنِ شالامار
وسطِ گلشن میں وہ تعمیر ہوا قصرِ نگار
سنگِ موسیٰ کے ستوں کرتے ہیں اک گفتار
اس کے پہلو میں جہانگیر کا دل ہے پنہاں
جس سے آتی ہے صدا "نور جہاں، نور جہاں"

ایک جگہ اور دیکھئے:۔

اہلِ کشمیر ہُنر مند ہیں مشہور جہاں
کارِ ابریشم و پشمینہ میں یکتائے جہاں
بے زری سے ہے مگر جامۂ تن گرد نشاں
اشک کہسار اسی غم میں ہے چشموں سے رواں
شدّتِ سوز سے پتھر بھی گھلا جاتا ہے
پانی بن بن کے دلِ کوہ بہا جاتا ہے

غرضیکہ ساری نظم نہایت خوبصورت، دلآویز اور عمدہ ہے۔

قومیت اور بین الاقوامیت

اس کتاب کو محمد قاسم حسن نے لکھا ہے اور مکتبہ جامعہ نے شائع کیا ہے۔
قیمت ایک روپیہ (عہ)۔

سیاسی رجحان کے تحت یہ مسئلہ آجکل ایک اہم صورت اختیار کر گیا ہے، قومیت کا تصور آج لوگوں کے دلوں میں اتنا راسخ ہو گیا ہے کہ اس کا مٹانا ایک مشکل امر...... ہے، یہاں تک کہ وہ لوگ جو اس کا مفہوم بھی ٹھیک طریقہ پر نہیں سمجھتے ان کے تحت الشعور میں قومیت کا

تصور جاگزیں ہے، اگرچہ اب اس کے ساتھ ایک لفظ اور بڑھا دیا گیا ہے لیکن پھر بھی یہ ابھی تک واہمہ ہی ہے۔

ہم اگر ایک ہلکی سی نظر ڈال کر دیکھیں گے تو معلوم ہو جائیگا کہ لفظ "بین الاقوامیت" ابھی تک وہیں ہے جہاں سے اس کا آغاز ہوا تھا، یورپ کے صنعتی انقلاب نے لوگوں کو کچھ اس درجہ لالچی بنا دیا ہے کہ اگرچہ وہ اس قومیت کے گورکھ دھندے سے نکلنا چاہتے ہیں لیکن نہیں نکل سکتے غیر شعوری طور پر پورا یورپ محسوس ہو گیا ہے۔ ہر شخص اپنی جگہ پر دوسرے کو اپنے سے کمتر حالت میں دیکھنا چاہتا ہے، اور اسی جذبہ کا نتیجہ ہے یورپ کا موجودہ انتشار۔

اگرچہ ہر شخص اب جذبۂ قومیت سے اکتایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اور بین الاقوامیت اُسے اپنی طرف کھینچنا چاہتی ہے لیکن وہ اسی خیال میں صبح سے شام کر دیتا ہے، اور گاڑی چل رہی ہے، قاسم صاحب نے اپنی اس کتاب میں قومیت اور بین الاقوامیت ہر دو کی ابتدا اور اس کے خیال کی ترویج بتائی ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے قومیت کی تشریح کی ہے اور بتایا ہے کہ لفظ قومیت کو کن کن معنوں میں لیا جاتا ہے اور کیونکر یہ لفظ ظہور میں آیا اور اس کے عناصر کیا ہیں

کتاب کے تیسرے باب میں انھوں نے قومیت کے تخیل کے ارتقاء پر روشنی ڈالی ہے کہ کیونکر یہ چیز مختلف خطوں میں پہنچی، کیونکر لوگوں نے اس خیال کو اہمیت دی۔ اس باب میں انھوں نے یورپ میں قومیت کے لفظ کو واضح کیا، ترکستان، پولینڈ، اسپین، سوئٹزرلینڈ اور روس نے کیونکر اپنے آپ کو قوموں کے رابطہ میں منسلک کیا، اور پھر کیونکر یورپ میں اقلیتوں کے مسئلہ کی طرف توجہ دی گئی۔

اس کے بعد انھوں نے اس جذبۂ قومیت کے ارتقا کو مشرقی ممالک میں واضح کیا ہے، یہاں سے بڑھ کر وہ جدید قومیت پر آئے ہیں کہ موجودہ یورپ اور دورِ حاضر قومیت کو کن معنوں میں استعمال کرتا ہے، اس کے بعد وہ آفاقیت پر روشنی ڈالتے ہوئے بین الاقوامیت پر آتے ہیں۔

بین الاقوامیت اور اس کا ارتقاء اس کی تنظیم، کوششیں اور قوانین، اس کے بعد انجمن اقوام، امن عالم، اس تخیل کی ابتدا غیر شعوری طور پر قومیت سے بیزاری، یہ سب کچھ انھوں نے ان آخر کے ابواب میں بیان کیا ہے۔

بہرکیف کتاب عمدہ ہے، اور وہ لوگ جو ان سیاسی ہنگاموں اور ان کے اتار چڑھاؤ سے واقفیت بہم پہنچانا چاہتے ہیں اُن کیلئے نہایت مفید اور دلچسپ ثابت ہو گی۔

افادی ادب

یہ مختصر سی کتاب اختر انصاری کی تصنیف ہے، جسے نیا سنسار، کتاب گھر نے شائع کیا ہے۔

"ادب حیاتِ انسانی کی تفسیر ہے" اس خیال کو لیکر اختر صاحب نے ادب کی وضاحت کی ہے، اور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، کہ یہ فقرہ جوں کا توں درست ہے۔ اس نظریہ کو انھوں نے مختلف جگہوں پر مثالیں دیکر ثابت کیا ہے، کہ خواہ زمانہ کوئی ہو، ماحول کیسا ہی ہو ادیب یا شاعر اس سے ہر حالت میں متاثر ہوتا ہے، اور جو کچھ وہ کہتا ہے یا لکھتا ہے وہ تمام اس کے خارجی اثرات کا پرتو ہوتا ہے۔

اختر صاحب نے اس نظریہ کی اس کتاب میں تردید کی ہے جن کا خیال ہے کہ ادب کو اپنے ماحول اور اثرات سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ لوگ جن کے خیال کے مطابق ادب لاہوت وناسوت سے بھی کہیں آگے کی چیز ہے اختر صاحب کی رائے میں دیوانہ کے مترادف ہیں، ادب کی تعریف کرتے ہوئے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"ہمارے نزدیک ادب میں دو خصوصیتیں لازمی طور پر پائی جانی چاہئیں:۔

اول تو یہ کہ وہ اپنے دور کی اجتماعی زندگی سے ایک گہرا اور براہِ راست تعلق رکھتا ہو۔

دوسرے یہ کہ اس کی تخلیق ایک مخصوص اور واضح سماجی مقصد کے ماتحت عمل میں آئی ہو"

ان دو چیزوں کو بنیاد بنا کر اپنے خیالات کو آگے بڑھایا ہے، اور ہر دو خیالات کی تشریح کی ہے۔ تشریح کرتے کرتے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"جذبۂ عشق کی ترجمانی میر بھی کرتا ہے اور ہندی کی شاعرہ میرا بھی، سعدی و حافظ بھی، اور ایران کا جدید شاعر بہار بھی، شاعر اطالوی ڈانٹے بھی اور قدیم یونان کی شاعرہ سیفو بھی، لیکن ان میں سے ہر ایک کی شاعری دوسروں کی شاعری سے بنیادی طور پر مختلف ہے، اس لئے کہ ہر ایک کا جذبۂ عشق ایک مخصوص اور جداگانہ سیاسی و معاشی ماحول کے رنگ میں رنگا ہوا ہے اب اس کے بعد یہ کہنا کہ فلاں ادیب ان جذبات واحساسات کی ترجمانی کرتا ہے جو زمان ومکان کی قید سے آزاد ہیں، اور اس لئے اس کا ادب کسی خاص وقت اور خاص مقام سے وابستہ نہیں ہے، اور اس کے برعکس فلاں ادیب کے موضوعات محض وقتی اور ہنگامی ہیں، ایک فضول اور بے معنی سی بات ہے۔"

اس خیال کو بڑھاتے بڑھاتے وہ ایک جگہ اور لکھتے ہیں ؛۔

"شعرگوئی، افسانہ نگاری، اور ڈرامہ نویسی کوئی پاگلوں کی مجنونانہ حرکتیں تو ہیں نہیں کہ معانی اور مفہوم سے عاری اور غرض وغایت سے بےنیاز ہوں، وہ ہوشمند انسانوں کے ہوشمندانہ مشاغل ہیں، اور یقیناً ایک خاص مقصد رکھتے ہیں۔"

اور اس کے باب کے اختتام پر وہ اسے یوں ختم کرتے ہیں :۔

"کسی ادبی کارنامہ کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کیلئے ہم یہ دیکھیں گے کہ وہ ادبی کارنامہ اپنے دور کی اجتماعی زندگی سے ایک گہرا اور براہ راست تعلق رکھتا ہے یا نہیں، اور یہ کہ اس کی تخلیق ایک مخصوص اور واضح سماجی مقصد کے ماتحت عمل میں آئی یا نہیں، اگر اس میں یہ دونوں خصوصیتیں پائی جاتی ہیں تو وہ صحیح وصالح ادب کا ایک نمونہ ہے ورنہ نہیں۔"

غرضیکہ انھوں نے ادب کے افادی پہلو کو نہایت کاوش کے ساتھ واضح کیا ہے، اور اس کے نمونے دئے ہیں۔ کتاب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

مولانا محمد علی رح کے یورپ کے سفر

اس کتاب میں محمد علی مرحوم کے کچھ خطوط اور چند مضامین شامل ہیں، ان تمام خطوط اور مضامین کو محمد سرور صاحب نے ترتیب دیا ہے، اور کتاب خانۂ پنجاب، لاہور سے شائع ہوئی ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ (۸/عہ)

سرسید اور آزاد کے بعد اردو نثر نگاری نے جس طرح اور جس طرف رخ کیا وہ کوئی ایسی گمنام چیز نہیں جس کا تذکرہ بالتفصیل کیا جائے ہاں مختصراً اتنا ہے کہ اردو مضمون نگاری نے رخ افسانہ نگاری کی طرف بدل دیا، اور طبیعت کا رجحان روسی اور فرانسیسی ادب کے زیر اثر (Fiction) کی طرف ہو گیا۔

اس کہنے سے یہ مراد نہیں کہ اردو نثر میں مضمون نگاری قطعاً مفقود ہو گئی بلکہ یہ کہ نسبتاً کم ہو گئی۔ محمد علی مرحوم اسی پرانی زنجیر کی ایک کڑی ہیں جس کے حلقے آزاد، سرسید اور حالی ہیں اور ان کے مضامین اور خطوط کی زبان میں وہی رنگ جھلکتا ہے لیکن ہم یہاں جس چیز کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں وہ اس کتاب کی ادبی حیثیت نہیں بلکہ ایک قسم کی کرداری حیثیت ہے، اس تمام کتاب میں زیادہ تر مولانا کے خطوط ہیں، اور یہ چیز اب بالکل صاف ہو گئی ہے کہ خطوط انسان کے کردار کی بڑی حد تک تصویر کشی کرتے ہیں۔

ہم یہاں خطوط کی اہمیت پر کوئی خاص روشنی نہیں ڈالنا چاہتے ہر وہ انسان جسے علم اور مطالعہ سے تھوڑا سا بھی واسطہ ہے خطوط کی اہمیت پر آج سے بہت پہلے کچھ دیکھ چکا ہو گا جب اردو میں پہلے پہل خطوط کی اہمیت سمجھی گئی تھی۔ اس کتاب میں جس قدر خطوط درج ہیں ان میں دو قسم کے خطوط زیادہ تعداد میں ہیں۔ پہلی قسم کے خطوط وہ ہیں جو سیاسی معاملات کی بنا پر یورپ کے سفر سے متعلق ہیں۔ اور دوسرے وہ ہیں جو سفر یورپ کے دوران میں لکھے گئے۔ لیکن یہ سفر صرف علالت کی بنا پر بغرض علاج کرنا پڑا تھا۔ بہرحال ہمیں خطوط کی نوعیت کی تفصیل میں بھی جانے کی ضرورت نہیں ہاں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ مولانا کے سفر ان کی زندگی کی جد و جہد، ان کی کامیابی یا ناکامی، اور یورپ کی معاشی اور اقتصادی زندگی سمجھنے کیلئے ان خطوط کا مطالعہ ضروری ہے۔ ایک جگہ مولانا اپنے خط میں تحریر فرماتے ہیں ؛۔

"یہ سب کچھ تو ہوا اگر سوال پیسہ کا ہے، یہاں صرف کھانے وغیرہ اور نرسنگ کے روزانہ ۲۵ مارک یعنی ۱۷ روپیہ دینا پڑینگے اور دوا دارو اور پروفیسر صاحب کی فیس علاوہ۔

ہندوستان کے افلاس کے متعلق میں نے انگریزوں کی اس بار بار کی بکواس کے بارہ میں کہ But living is cheaper in India (وہاں کی زندگی تو سستی ہے) جل کر عرض کیا تھا کہ Yes and dying only just a little cheaper ——— (بالکل صحیح فرمایا، اور مر جانا زندگی سے کچھ ہی زیادہ سستا ہے)

یہاں کے مصارف کے خوف سے کہنا پڑتا ہے کہ Living is dear in Europe and on the whole dying is much cheaper.

زندگی یورپ میں سخت گراں ہے، اور سب چیزوں کا لحاظ کیا جائے تو مر جانا ہی بہت سستا ہے۔"

مولانا کے تمام خطوط میں اسی قسم کی جھلکیاں ہیں جن میں ہندوستان اور یورپ سیاسی اور معاشی لباس پہنے موقع موقع سے جھانکتا رہتا ہے۔ ان خطوط کے مطالعہ سے بڑی حد تک محمد علی مرحوم کا کردار آئینہ ہو جائے گا۔ اور ہم بڑی حد تک انھیں سمجھ سکیں گے۔

سنہ ۱۹۳۹ء میں جاری ہوا

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی ماہنامہ

ایشیا

منظور شدہ

محکمۂ تعلیمات حکومتِ صوبۂ متحدہ، حکومتِ بہار

حکومتِ سی۔ پی اور حکومتِ صوبۂ پنجاب

ناشر

مکتبۂ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

(جملہ حقوق محفوظ)

(نمونہ مفت نہیں بھیجا جاتا)

قیمت سالانہ پانچ روپیہ (ہندوستان سے)
قیمت فی نمبر آٹھ آنے

قیمت سالانہ آٹھ روپیہ (دوسرے ممالک سے)
(ایجنسیوں کو ۲۵ فی صدی کمیشن)

فہرست

ماہنامہ ایشیا

دسمبر ۱۹۴۲ء

ناظم :- اسد یار خانِ اعظم

ادبی مرکز میرٹھ

شمارہ	مضمون	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۱	ہمارے نقاد	ساغر نظامی	۳
	"نگار" کا ریاض نمبر		
	نئی صبح		
	(ادبیات سیاسیات)		
۲	حکومت کا دائرہ عمل	علیم اللہ صدیقی بی۔ اے (جامعی)	۶
۳	غزل	ولی وارثی	۱۲
۴	اخبار نویسوں کی قیمت	رئیس امروہوی	۱۳
۵	رباعی	مرزا یگانہ چنگیزی علیہ السلام	۱۶
۶	میکاولی کا سیاسی فلسفہ	اکرام قمر ایم۔ اے	۱۷
۷	افکار	ساغر نظامی	۲۱
۸	چین میں امداد باہمی	عطاء اللہ	۲۲
۹	منتشر جذبے	ساغر نظامی	۲۵
۱۰	منشی جی	حامد حسین قادری	۲۶
	نیا راگ		
	(نظم و غزل)		
۱۱	آدرش	ساغر نظامی	۳۰
۱۲	ساقی	نواب جعفر علی خاں اثر بی۔ اے	۳۲
۱۳	احساس کی چٹکی	احمد ندیم قاسمی	۳۳

شمارہ	مضمون	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۱۴	دو غزلیں	ظفر تاباں دہلوی - فراق گورکھپوری	۳۴
۱۵	نئی موج طوفان	ساغر نظامی	۳۵
۱۶	غزل	اقبال صفی پوری	۳۶
	نئی کہانی		
	(افسانے ڈرامے)		
۱۷	اندر اور باہر	رام پرتاپ بہادر ایم۔ اے	۳۸
۱۸	آتش و آہن	م۔ ش حقی	۴۱
۱۹	ایک خط	محمد صدیق ایم۔ اے	۴۲
	کسوٹی		
	(کتابیں)		
۲۰	غالب کے سو شعر	ساغر نظامی	۴۶
	تصویر کدہ		
	(فلمی انتقاد)		
۲۱	ایک کتاب	ساغر نظامی	
	(شالامار پکچرز کی پہلی تصویر)		۵۴

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی ماہنامہ

ایشیا

جلد ۷ — دسمبر سنہ ۱۹۴۲ء — نمبر (۱۱)

ہمارے نقّاد

(”نگار“ کا ریاض نمبر)

نگار کا جنوری فروری سنہ ۱۹۴۳ء نمبر ”ریاض نمبر“ کی صورت میں شائع ہوا ہے۔ انتساب، اعترافات، اور انتخابِ کلام ریاض، اڈیٹر کے قلم سے ہے اور باقی مضامین دوسرے مضامین نگار حضرات کے ہیں۔ سیّد عقیل احمد جعفری، ریاض مرحوم کے عزیز ہیں، اس لئے سوانح حیات، ریاض کی شوخیاں، مکاتیب ریاض، ریاض کے بعض انتقادی مباحث وغیرہ جیسے اہم اور ضروری عنوانات پر ان کے مضامین نہایت موزوں ہیں۔

اس نمبر پر تفصیلی نظر ڈالنے سے پہلے ضروری ہے کہ اک جائزہ تنقید کے اُس زاویۂ نگاہ کا لیا جائے جو ہمارے نام نہاد نقّادوں نے بنالیا ہے اور جس سے وہ اُردو شعر و ادب کی چھان بین کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں زیریں سطور بڑی حد تک بنیاد کا کام دے سکتی ہیں:—

”انتقاد کی ایک عام غلطی جس میں تقریباً ہر شخص مبتلا نظر آتا ہے یہ ہے کہ نقّاد سب سے پہلے یہ دیکھتا ہے کہ لکھنے والے نے اسکے ذوق کی رعایت کس حد تک کی ہے اور اسکے نقطۂ خیال سے کون کون سا حصہ ایک تصنیف کا مکمّل کہا جاسکتا ہے اور اسکے بعد وہ ایک قطعی حکم لگا دیتا ہے کہ فلاں جزو ایک کتاب کا اچھّا اور فلاں خراب ہے، میرے نزدیک یہ اصولی غلطی ہے اگر ایک شخص کا دماغ زندگی کے مختلف شعبوں کارگاہِ حیات کے کثیر الانواع مناظر جذباتِ انسانی کے مختلف کوائف، تکمیل فن کی متعدد اشکال، اور فطرت کے بوقلموں مظاہر سے علیحدہ علیحدہ لطف اندوز ہونے کی اہلیت نہیں رکھتا تو اس کو انتقادی ذمّہ داریاں اپنے سر نہ لینا چاہئے، کیونکہ اسکے لئے ایسے دماغ کی ضرورت ہے جو ہمہ گیر ہو اور ہر چیز کی جداگانہ حیثیت و امتیاز کو سمجھ کر اسکے نقائص و محاسن کا درک کرسکے لیکن چونکہ یہ صفت شاذ و نادر کسی میں پائی جاتی ہے، اس لئے حقیقی معنیٰ میں نقّاد کا وجود بھی بہت کم نظر آتا ہے اور عام طور پر انتقادی مقالے تنقیصی جرح سے زیادہ کوئی اور حیثیت اختیار نہیں کر سکتے:

فرض کیجئے ایک نقّاد فطرت کی طرف سے یہ ذوق لے کر آیا ہے کہ جذباتِ سوز و گداز کو پسند کرتا ہے اور یہ پسندیدگی اس قدر غلو کی حد تک پہنچ گئی ہے کہ کوئی اور جذبہ اس کو پسند ہی نہیں آتا تو اس کو یقیناً نقد کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، نقد وہی شخص کرسکتا ہے جو اگر ایک طرف میر کے اس شعر پر سر دُھن سکتا ہے ؎

سب ہوئے نادم پئے تدبیر ہو جاناں سمیت
تیر تو نکلا مرے سینے سے لیکن جاں سمیت

تو دوسری طرف داغ کا یہ شعر بھی اسے بے چین بنا دیتا ہو[۵]

یہ سیر ہے کہ دوپٹہ اُڑا رہی ہے ہوا
چھپاتے ہیں جو وہ سینہ کمر نہیں چھپتی

الغرض نقاد کے لئے ضروری ہے کہ اس کی طبیعت اپنی اپنی جگہ ہر رنگ کا لطف اُٹھا سکتی ہو" اور وہ ہر کتاب کا مطالعہ صرف اس کے موضوع اور مصنف کے میلانِ طبع کے لحاظ سے کرسکتا ہو" (نگار ریاض نمبر)

ہر چند کہ یہ کوئی نیا نظریہ نہیں ہے، شبلی کا زاویۂ نگاہ نیاز کے الفاظ میں ہے، مگر یہ اُردو ادب کی ایک ایسی شخصیت کے الفاظ ہیں جو اپنی منکر فطرت کے لئے مشہور ہے۔ ہر چند کہ یہ شذرہ موقع کے لحاظ سے ایک اختیاری اصول کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن یہ اپنی جگہ بہت کچھ حقیقی ہے، غالباً اتنا حقیقی کہ خود نیاز کی رہبری کرسکتا ہے۔

آئیے ہم آپ کو ذرا وضاحت کے ساتھ یہ بتائیں کہ اُردو ادب میں انتقاد کے نام پر برسوں سے انفرادی رائے زنی کی محض ایک قیامت برپا ہے، صحیح تنقید کا تو ذکر ہی کیا، غلط تنقید کا بھی وجود نہیں، ملک میں گنتی کے چند محدود مطالعہ اور قیاسی رائے رکھنے والے ایک دو نثر نگار ہیں، جو اس وقت تک ذاتی پسندیدگی و ناپسندیدگی اور اپنے جانبدارانہ ادبی مصالح کی خاطر چند مخصوص شعراء کی نقابت کرتے آئے ہیں۔ خود نیاز فتحپوری جن کو شاید اپنے متعلق یہ دھوکہ ہے کہ وہ بھی اپنی جیب میں اک کسوٹی رکھتے ہیں اور جوہر کو پرکھ سکتے ہیں بذاتِ خود اک فریبِ عظیم ہیں۔

۳ یہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں کہ شعراء و ادباء، ان کے معائب و محاسن انکے شعر ادب اور اس کی اقدار ....

.... ان کے ادبی فروغ کے امکان و عدمِ امکان پر اعلیٰ نقاد اور مفکر کی طرح غور کرنا نیاز کے بس کی بات ہی نہیں، ....

....

....

نیاز کی نقادی ہی میں نہیں تمام اندازِ تحریر میں ایک سن رسیدہ بیگم کا سا عالمِ ناز تو پایا جاتا ہے مگر ایک مفکر اور وسیع النظر نقاد کی سی گہرائی مفقود ہے۔"

.... ایک ادھیڑ عمر شعلہ جمال مہارانی جو جوانی ڈھل جانے کے باوجود ماضی کی تمام فتح مندیوں کے تصور، اور حاضر قوتوں کے سہارے نفرت و محبت میں انتہا پسند رہتی ہے اور اشیا و افراد کی اقدار قائم کرنے میں انفرادی قطعیت سے کام لیتی ہے، کچھ ایسا ہی عالم نیاز کے تنقیدی نقطۂ نگاہ کا ہے۔ یہ شخص عدل و جوہر شناسی اور ہدایت و رہبری سے قطعی عاجز ہے۔ لیکن جس زبان میں "شعر العجم" کے بعد ایک جامع انتقادی کتاب نہ لکھی جاسکی ہو، اُس زبان میں ہر کہ و مہ کا نمایاں ہو جانا تعجبات سے نہیں، نیاز کے اندازِ تحریر کی چٹک ضرور دلوں کو لبھاتی ہے اور دور سے انگوٹھا دکھانا بھی دل چھین لے جاتا ہے، مگر محض طنز یا تی چھینٹو اور نخروں سے تنقید جیسے اعلیٰ فریضہ کو کوئی تعلق نہیں، ایک اور بھی بات ہے، نیاز اک نو ظہور و ناقص جمالیاتی و رومانی عہد کی پیداوار ہے اُس نے اور اسکے معاصرین نے ادب میں رومانوی جمالیاتی ادب کے ارتقار کیلئے جو کوششیں کیں وہ اپنی جگہ مسلّم ہیں، لیکن یہ عہد ابھی مکمل بھی نہ ہونے پایا تھا کہ اُردو ادب میں تاریخ نے جست لگائی اور نئے نظریوں نے تبدیلی و تغیّر کی رفتار کو بالکل نئی سمتوں میں موڑ دیا۔ ادب کے نئے تقاضوں اور بدلتے ہوئے اسالیب مقاصد کی بنیادوں کو نیاز نے نہ دوسری زبانوں کے ادب میں مطالعہ کیا اور نہ زمانہ کے بطن سے پیدا ہونے والے طوفان کو محسوس کیا اس لئے نئی چیزوں کا اندازہ تو وہ خود کر ہی نہیں سکتا تھا، لیکن قدیم شاعری خاص کر غزل کے متعلق بھی اس کا تنقیدی زاویۂ نگاہ قطعی "ذوقی" و "انفرادی" حیثیت رکھتا ہے۔ مومن کو غالب پر ترجیح دینا، ابن یمین کو حافظ سے بڑھانا اور طرح طرح کی عجیب حرکتیں کرنا، یہ اصل میں ممتاز و ممیز ہونے کی تدابیر تھیں، ورنہ اس کی طرف سے کوئی تعمیری کوشش ظہور میں آنی چاہئے تھی جو شعر و ادب کی تعمیر میں مدد دیتی، اسکے یہاں تنقید محض تخریب و تردید کا دوسرا نام ہے۔ وہ اس عمل کو اپنی کامیابی و برتری سمجھتا ہے کہ اُسے بلور کا گلاس دیا جائے اور پوچھا جائے "نیاز صاحب یہ گلاس کیسا ہے" وہ اس گلاس کو ہاتھ میں لے اور زمین پر پٹک کر چور چور کردے، پھر کہے، اچھا ہے مگر ٹوٹ جاتا ہے۔"

اکثر جگہ اسکی رائے ذاتی دشمنی و دوستی کے ماتحت بھی ہوتی ہے جیسے کہ جوش ملیح آبادی کے خلاف اس کا کمزور جہاد، یا سیماب اکبرآبادی کی تائید (جو بعض وقتی مصالح کے پیش نظر کی گئی تھی) یا اس تائید کے بعد پھر اُن کی شدید تردید (یہ تردید بھی دوسرے مخالف جذبہ کے ماتحت کی گئی تھی)، یا "اُردو شاعری نمبر" اور اس سے تعلق رکھنے والا تنقیدی نمبر، یا اب یہ "ریاض نمبر"۔

جہاں تک ریاض خیرآبادی کا تعلق ہے، وہ بہر حال (بقیہ مضمون دیکھو صفحہ ۴۸)

نئی صبح

علیم اللہ صدیقی بی اے (جامعی)

حکومت کا دائرہ عمل

ازمنۂ قدیم سے یہ مسئلہ مرکز بحث رہا ہے کہ حکومت کا دائرۂ عمل کیا ہو؟ عہد جدید میں بھی یہ مسئلہ مفکرین کی توجہات کا مرکز بنا ہوا ہے اور ابتک ایسا کوئی حل نہ نکل سکا جس پر تمام ارباب فکر متفق ہو جائیں۔ میں نے اس مضمون میں سب سے پہلے یونانی، اسلامی اور مسیحی نظریوں کا صرف ایک اجمالی خاکہ پیش کر دیا ہے اور ان پر تنقید و تبصرہ کی ضرورت اس لئے نہیں سمجھی کیونکہ ان نظریوں کا عملی شکل میں کہیں اس عہد میں وجود نہیں ہے، لیکن عہد جدید کے دو مشہور نظریوں، سوشلزم، اور اس کی مختلف قسموں، اور انفرادیت .... کے ہر پہلو پر نظر ڈالی ہے اور ان کی اچھائیاں اور برائیاں سنجیدگی کے ساتھ نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یونانی نظریہ

یونان میں فرد، جماعت یا فرد اور ریاست کو ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں خیال کیا جاتا تھا، ان کا باہمی تعلق نہایت گہرا تھا اور ہر کام ریاست کا کام سمجھا جاتا تھا، ان کا باہمی تعلق نہایت گہرا تھا اور ہر کام ریاست کا کام سمجھا جاتا تھا، یونانی مفکرین نے اس پر بھی غور و فکر کیا تھا کہ ایک مشترک مطبخ قائم کرنا چاہئے اور شہریوں کیلئے ایک خاص پوشاک مقرر کی جائے افلاطون نے یہ بھی محسوس کیا کہ سیاست کی بنیاد اس وقت تک محکم نہ ہو گی جب تک اسے ایک متحدہ مذہب سے تقویت حاصل نہ ہو، اس نے اپنی کتاب "ریاست" میں یہ خیال ظاہر کیا ہے "ریاست کے ارباب حل و عقد کو چاہئے کہ ایک متحدہ مذہب کے قیام اور اسے عام طور سے مقبول بنانے کی کوشش کریں۔"

اسلامی نظریہ

ریاست کے دائرۂ عمل کا اسلامی نظریہ یونانی نظریہ سے کافی مشابہ ہے، یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کا مذہب ایک تھا اور یونانیوں کا کوئی مخصوص مذہب نہ تھا، اسلامی مفکرین ایک خاص مذہبی تعلیم اور خاص اخلاقی اصول کے پابند تھے اور یونانی نہیں تھے، لیکن فرد، جماعت اور سیاسی تنظیم کو یونانی سیاست کی طرح اسلامی سیاست میں بھی ایک واحدہ .... مانا گیا ہے، اتنا فرق ضرور ہے کہ اسلامی سیاست کی بنیاد مذہب پر قائم ہے اور اس کی وجہ سے ریاست پر بہت سی مذہبی اور اخلاقی قیود عائد ہیں، مثلاً "اسلامی ریاست کمزور بچوں کو پھینک نہیں سکتی ہے لیکن یونان کی بعض ریاستوں نے ایسا کیا تھا"، بیت المال کا تصور یونانیوں کے "عام مطبخ" کے تصور سے بہت قریب ہے اگرچہ اسلامی سیاست میں اسکی بنیاد اخلاق اور مذہبی آئین پر قائم

مسیحی نظریہ

عیسائی مذہب، خصوصاً رومی کلیسا کی تعلیم یہ تھی کہ دین اور دنیا یا دوسرے الفاظ میں مذہب اور سیاست دو جداگانہ چیز ہیں، اسی لئے ریاست کی حیثیت اتنی ہی پست تھی جتنی دین کے مقابلہ میں دنیا کی، کیونکہ ریاست دنیاوی اداروں میں شامل تھی، لیکن چونکہ سیاسی تنظیم کے بغیر عیسائی جماعت کا شیرازہ مجتمع نہیں کیا جا سکتا تھا، اسی بنا پر سنہ ۸۰۰ء میں مقدس رومی سلطنت کی تاسیس عمل میں آئی، اور ارباب کلیسا مذہبی معاملات میں پیشوا ملنے گئے، دنیاوی معاملات کا انتظام بادشاہوں کے حوالہ کر دیا گیا جن کا سردار اصولاً مقدس رومی شہنشاہ سمجھا جاتا تھا۔ سولھویں صدی عیسوی کے اوائل تک اس نظام کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا اور اسی زمانہ میں "مارٹن لتھر .... نے دین اور دنیا کے ایک ہونے اور "صحیح دینی زندگی" ہونے کی تعلیم دی۔"

جدید نظریے!

جدید مذہبی تحریکوں کے ساتھ دُنیاوی زندگی کی جدید حیثیت اور تجارت اور سرمایہ داری نے بہت ترقی کی۔ ترقی کرنیوالے افراد یا جماعتیں اصولی طور سے عموماً ریاست کے وجود کو غیر ضروری خیال کرتی تھیں، اِن کے اعتدال پسند طبقہ کا بھی یہ نظریہ تھا "کم سے کم ان کے معاملات میں ریاست دخل دے" یہ طبقہ چونکہ مالدار تھا اس لئے ان کے اس نظریّہ کی کافی شہرت ہوئی، اس نظریہ کی ابتدائی شکل .... "کرنے دو" فرانسیسی لفظ ہے)

آزاد تجارت کا آئین اور انگلستان کے لبرلزم .... کو اس سے بہت قریبی تعلّق ہے۔ مگر اس کا زیادہ قریبی تعلّق (laissez faire free trade) اور (Liberalism) سے ہے، یہ نظریہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے تاجروں میں عام طور سے مقبول تھا، انگلستان میں جو لبرل پارٹی بنی اور اس کا جو پروگرام بنا اس کی اساس اسی "آزاد تجارت کے آئین" پر قائم تھی ۱۸۱۵ء میں جب نپولین سے جنگ ختم ہوئی تو زمینداروں نے اس خیال سے کہ غلّہ کے دام گرنے نہ پائیں غلّہ کی درآمد پر بھاری محصول لگوا دیا، اس کی وجہ سے روٹی کی قیمت بہت بڑھ گئی، یہ بیان کرنا بے محل نہ ہوگا کہ ان زیادتیوں کے خلاف احتجاج کیا گیا خصوصاً (Corn laws) کو منسوخ کرانے کیلئے بہت سی تحریکوں نے جنم لیا جو بعد میں (Liberalism) کی زبردست تحریک میں تبدیل ہو گئیں اور تیس برس کی متحدہ اور مسلسل کوشش کے بعد ۱۸۴۶ء میں (Corn laws) منسوخ کرا کر دم لیا گیا۔

لبرلزم (Liberalism) کی تعلیم کا ایک معاشی پہلو تھا جس میں تجارت کی آزادی اور معاہدہ کی آزادی کا مفہوم یہ تھا کہ سرمایہ دار اور مزدور کو آزادانہ معاہدہ کرنے کا حق ہو، حکومت اس باہمی معاہدہ کو بروئے کار لانے میں ضرور امداد کرے لیکن اسے دخل دینے کا حق حاصل نہ ہو، لبرلزم .... کی تعلیم کا ایک دوسرا پہلو سیاسی بھی تھا۔ وہ انفرادیت کے حامی تھے اور ان کی خواہش تھی کہ افراد کو اپنی زندگی کی تعمیر میں زیادہ سے زیادہ آزادی دی جائے اور ریاست صرف وہی کام اپنے ذمّہ لے جن کے متعلق یقین ہو کہ افراد انہیں انجام نہ دے سکیں گے۔ مثلاً فوج رکھنا، پولیس کا انتظام کرنا، عدالتیں قائم کرنا وغیرہ، لبرل کا یہ نظریہ بھی اسی نقطۂ نظر کا رہین تھا کہ حکومت کو تعلیم کے بارے میں بھی دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ انہیں کی تعلیم اور اثر کی وجہ سے انگلستان میں ۱۸۷۰ء تک عام جبری تعلیم کا رواج نہ ہو سکا حالانکہ فرانس میں جبری تعلیم کا قانون ۱۸۴۰ء میں پاس ہو گیا تھا اور وہاں عام طور سے اس کا نفاذ تھا جس کی وجہ سے فرانس کی تعلیمی حالت پر خوش گوار اثر پڑا تھا۔

لبرلزم .... کی تعلیم انگلستان میں زیادہ مقبول ہوئی، وجہ یہ تھی کہ تجارت کی آزادی، معاہدہ کی آزادی اور انفرادیت کے اصول میں سرمایہ داروں اور متوسط طبقہ کے افراد کا زیادہ سے زیادہ فائدہ تھا اور یہ طبقہ اپنے اثر و نفوذ اور سرمایہ کی وجہ سے چھایا ہوا تھا مگر باقی یورپ میں یہ تعلیم کبھی بھی صحیح تسلیم نہیں کی گئی۔ انگلستان میں بھی ۱۸۷۰ء کے بعد قانوناً نہیں تو عملاً لبرلزم کی تعلیم ترک کی جانے لگی اور بیسویں صدی میں تو اسکے اصول کو بالکل چھوڑ دیا گیا اور اس کی جگہ اجتماعیت (collectivism) کے رجحان نے لے لی، ریاست نے عام مفاد کیلئے ہر قسم کی ذمّہ داری اپنے سر لے لی اور جماعت کا ہر کام گویا ریاست کا کام ہو گیا، یورپ کے دوسرے ممالک میں اجتماعیّت کی طرف رجحان انگلستان سے بہت پہلے پایا جاتا تھا۔

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

اجمالی طور سے یہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ انفرادی مسلک کے پیرو حکومت کے افراد کے حق میں دخل اندازی کو ناپسند کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ چونکہ انسانی معاشرہ نے ابھی تک اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ بغیر خارجی دباؤ کے انسان کی زندگی، جان و مال محفوظ رہ سکیں، اسی لئے وہ حکومت کو ناگزیر خیال کرتے ہیں تاکہ جس وقت ان عناصر زندگی میں سے کوئی بھی معرض خطر میں ہو، اس وقت حکومت مداخلت کر کے نقصان رساں کو کیفر کردار کو پہنچائے لیکن اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ حکومت ایسے معاملات میں بے دخل

دے جو افراد کے دائرہ اقتدار میں ہوں، مثلاً تعلیم، حفظانِ صحت وغیرہ انفرادیت کے حامیوں کا خیال ہے کہ انہیں طے کرنے کا ہر شخص کو کلی اختیار حاصل ہے اور وہ اپنے ان معاملات کو حکومت اور دوسرے لوگوں سے بہتر سمجھ سکتا ہے اور انہیں حل کر سکتا ہے اس لئے ان معاملات میں خارجی دخل اندازی سود مند ہونے کی جگہ مضر ثابت ہوگی۔

ان کے برعکس اجتماعیت کے حامی یہ کہتے ہیں، کہ انسان اپنے مفاد سے کماحقہٗ واقف نہیں ہوتا اور اسکے اور ریاست کے اغراض و مقاصد میں بعض دفعہ جو منافات پائی جاتی ہے اسکے بُرے نتائج کے انسداد کیلئے حکومت کی دست اندازی ضروری ہے، ان کا خیال ہے "انفرادی معاشرہ میں اصولِ مقابلہ کی ترویج کے سبب انسان کی محنت اور سرمایہ کا بہت بڑا حصّہ ضائع ہو جاتا ہے، وجہ یہ ہوتی ہے کہ ایک ہی قسم کے کام کو بہت سے لوگ بیک وقت انجام دیتے ہیں، اس لئے کوئی امر بھی خاطر خواہ تکمیل کو نہیں پہنچتا۔ ان کے خیال میں بہترین ریاست وہی ہے جس میں اپنے پرائے کا کوئی امتیاز باقی نہ رہے، بلکہ سرمایہ وزمین دونوں ریاست کی ملکیت سمجھی جائیں اور "محنت" پر 8
اسی کا پورا اختیار ہو، مکمل اجتماعی یا اشتراکی ریاست وہی ہے، جس میں اپنے پرائے کا کوئی امتیاز باقی نہ رہے بلکہ سرمایہ و زمین دونوں ریاست کی ملکیت سمجھی جائیں اور "محنت" پر اسی کا پورا اختیار ہو، مکمل اجتماعی یا اشتراکی ریاست میں نہ زمینیں ہونگی نہ ملیں نہ ... نہ مدارس اور کارخانہ جات ہوں گے، بلکہ جس قدر بھی عاملین پیدائش ہیں سب حکومت کے دست نگر ہوں گے۔ ہر فرد گویا ریاست کی طرف سے کام کرے گا اور اسی کے مقرر کردہ معاوضہ پر اس کی قوتِ بسری ہوگی[1]"

انفرادیت کے حامیوں کے دلائل

انفرادیت کے حامیوں نے اپنے اصول پیش کر کے اپنے نقطۂ نظر کا استدلال کیا ہے، ان حامیوں میں آدم اسمتھ[2] . . . .

فون ہمبولٹ[3] . . . . اور ہربرٹ اسپنسر[4] . . . . کی شخصیتیں نمایاں طور سے نظر آتی ہیں، ان انفرادیت کے حامیوں کا سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ ہر فرد کو اپنی حرکات و سکنات کی اس وقت تک پوری آزادی ہونا چاہیے جبتک اسکا یقین نہ ہو جائے کہ اسکی آزادی سے کسی دوسرے فرد کو گزند پہنچتا ہے۔ انکا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسانی معاشرہ کی بُنیاد خود غرضی پر مبنی ہے، اس لئے ہر شخص اپنی غرض اور اپنے سود و زیاں کو دوسروں سے بہتر سمجھ سکتا ہے، اسی کے حصول کیلئے جتنی خارجی رکاوٹیں کم ہونگی، اسی قدر آسانی ہوگی، ان کا خیال یہ بھی ہے کہ ہر فرد کے حصولِ مقاصد ہی سے افراد کی اجتماعی فلاح و بہبود مدّنظر ہوتی ہے، اس لئے کہ افراد ہی تو معاشرہ کے اجزاء ترکیبی ہوتے ہیں، یہ ظاہر ہے کہ اگر ہر فرد اپنی بہبودی کیلئے جدوجہد کریگا تو مختلف افراد کے درمیان مقابلہ کی کشمکش پیدا ہو جائے گی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان کی اعلیٰ صلاحیتیں اُبھر آئیں گی اور ان میں اپنی مدد آپ کرنے کی اہلیت پیدا ہو جائیگی اور جو افراد فطرۃً ناقابل ہیں یا ماحول کے باعث ان کی فطری صلاحیت زائل ہو چکی ہے وہ ناقابلِ التفات ہو جائینگے یا فنا ہو جائینگے اس کا اثر معاشرہ پر خوش گوار پڑیگا، وجہ یہ ہوگی کہ اب صرف صالح اجزاء رہ جائینگے اور فاسد فنا ہو جائینگے۔ اس بحث و نظر سے انفرادیوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ حکومت کو چاہئے کہ افراد کے کاموں میں بےضرورت دخل نہ دے، اور صرف انہیں امور کی نگرانی رکھے جو ان کے جان و مال اور آزادی کے لئے ناگزیر ہیں۔

. . . .

. . . .

انفرادیت کے حامیوں کا سب سے پہلا اصول جو اس نظریہ کی جان ہے، یہ ہے کہ ہر فرد کو نہ صرف اپنی بہبودی مدّنظر ہوتی ہے اور اسکے لئے وہ جان توڑ کوشش کرتا ہے بلکہ وہی اس جدوجہد کا اہل بھی ہوتا ہے، اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ عقل انسانی مکمل نہیں ہے، "ممکن ہے ایک چیز کو ہم مفید خیال کرتے ہوں اور وہ درحقیقت ہمارے لئے مضر ہو۔ اسی طرح یہ بھی

---

[1] اقتباس (کسی قدر تصرف کے ساتھ) از "اشتراکی تخیل اور تحریک رجحانات" باب ۸ و ۹ مؤلفہ الیاس احمد صاحب برنی ایم اے ناظمِ دارالترجمہ حیدرآباد دکن[2] ملاحظہ ہو "دولتِ اقوام" ــــ ــــ ۔

[3] "خیالات متعلق تحدید دائرۂ حکومت"

[4] (Man versus State) "فرد بمقابلۂ ریاست"

ممکن ہے کہ ایک چیز کو ہم اپنے لئے مضر خیال کرتے ہوں اور در اصل وہ ہمارے لئے "مفید ہو" یہ صرف دعوی نہیں ہے بلکہ روزمرہ اس قسم کے صدہا واقعات پیش آتے رہتے ہیں جو اسکی تائید کرتے ہیں، اگر ہر فرد اپنے جائز مقاصد حاصل کرنے کے ذرائع سے کماحقہٗ واقف ہوتا تو ہم کسی فرد کو غربت اور ناکامی کی زندگی گزارتے ہوئے نہ دیکھتے۔ دوسرے بعض مرتبہ جس چیز میں بظاہر افراد کا مفاد نظر آتا ہے اس میں ان کی اجتماعی کیفیت کی بقا ضروری ہے (اور یہ مسلّم ہے کہ ضروری ہے) تو پھر دونوں خیالات کو ایک دوسرے سے بالکل جُدا اور ممتاز رکھنا پڑیگا، اور ریاست کی ترقی اور اسکے مقاصد کے حصول کیلئے اسی طرح سہولتیں بہم پہنچانا پڑیں گی جس طرح خود افراد کی ترقی اور مقاصد کے حاصل کرنے میں آسانیاں پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تیسرے . . . . یہ کہ انفرادیت کے حامی جس "آزادی" کی بقا کی کوشش کرتے ہیں اس کا تعین ریاست کی اثباتی مداخلت کے بغیر قریبًا ناممکن ہے اور فطری حقوق اور آزادی ریاست کی اثباتی مداخلت کے بغیر ایک سرور انگیز خواب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے ہیں، آخری دلیل انفرادیت کے حامیوں کی طرف سے جو پیش کی جاتی ہے وہ بقاء اصلح (اچھے عناصر کی بقاء) کا نقطۂ نظر ہے۔ اس دلیل کا سب سے بڑا مؤید ہربرٹ سپنسر . . . . ہے۔ وہ کہتا ہے

"انسانی معاشرہ کی حقیقی فلاح و بہبودی مضمر ہے کہ بہترین افراد باہمی مقابلہ کے ذریعہ آگے بڑھیں اور بدترین فنا ہو جائیں"۔[1] سطحی نظر سے یہ خیال نہایت اچھا نظر آتا ہے کہ کوئی فرد بیکار نہ رہے جو بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے دوسروں کا دست نگر ہو، لیکن اگر اسے عمیق نظر سے دیکھا جائے تو یہ بالکل بے بنیاد نظر آتا ہے، اسپنسر نے یہ نظریہ ان جانوروں سے اختراع کیا ہے جن میں اپنی اصلاح کی اہلیت نہیں ہے درانحالیکہ انسان ان جانوروں سے کہیں ممتاز ہے، اور ہر وقت وہ اپنی حالت بہتر بنانے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ بعض ترقی یافتہ ممالک میں اب وہی اندھے گونگے

لولے، لنگڑے اور اپاہج جنہیں شاید اسپنسر سمندر میں ڈبو دیتا، معاشرہ کے بہترین عناصر بن گئے ہیں، جب یہ صورتِ حالات ہے تو جانوروں کی عادات سے استدلال کرنا اور بنی نوع انسانی کو گردن زدنی سمجھنا کہاں تک روا ہو سکتا ہے! دوسری غلط فہمی اسپنسر کو یہ ہے کہ باہمی مقابلہ سے بُرے افراد فنا ہو جاتے ہیں، اور اچھے باقی رہتے ہیں، سچ پوچھئے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس مقابلہ کی وجہ سے بہت سے لوگ ایک ہی قسم کا کام کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے معاشرہ کو سخت معاشی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے، دوسرے جو فرد مقابلہ کی وجہ سے امتیاز حاصل کر لیتا ہے۔ وہ اگرچہ اضافی حیثیت سے قابل ترین ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ بہترین فرد بھی ہو، اس کے وسائل اور اس کا دائرۂ نظر عمومًا تنگ ہو جاتا ہے، اسکے برعکس اجتماعی انتظامات کی صورت میں دائرہ وسائل کی کثرت، مقاصد کی توسیع اور سرمایہ کی زیادتی کی وجہ سے وسیع تر ہو جائیگا!۔

انفرادیت کی ترمیم شدہ ہیئت

جنگ عظیم سنہ ۱۴-۱۸ء کے بعد انفرادیت کے نظریہ نے 9
چولا بدلا ہے اور اس کی ہیئت میں بہت کچھ تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں دورانِ جنگ سنہ ۱۴-۱۸ء میں ہر ملک کے اندر دو قسم کی کیفیات ظاہر ہوئیں، ایک تو حکومت کی مداخلت دوسرے دیگر اداروں کے اثر میں توسیع۔ جنگ کے زمانہ میں اسکی ضرورت پیش آئی کہ مرکز سے منحرف قوتوں کا خاتمہ کر دیا جائے یا حکومت ان پر پوری طرح سے قابو پالے۔ اس مقصد کے لئے نئے نئے ٹیکس، آرڈیننس اور ڈیفنس لاز نافذ کئے گئے، اکثر جنگجو ملکوں میں جنگ کیلئے جبری بھرتی کی گئی، ذاتی کارخانوں میں، جن میں پہلے روزمرہ کے استعمال کی اشیاء بنتی تھیں، اب گولہ بارود اور دوسری جنگی ضرورتوں کا سامان طیار کیا جانے لگا، غرض ہر جگہ حکومت کی نگرانی ہونے لگی اور ہر موقع پر حکومت کے افسر نظر آنے لگے، اس کا ردعمل . . . . لازمی تھا۔ چنانچہ جنگ کے بعد لوگوں کو حکومت کی مداخلت اور دست برد سے ایک قسم کی نفرت سی پیدا ہو گئی تھی اور بڑی قومی انجمنوں اور اداروں نے خود اپنے آئین اور ضوابط پر عمل کر کے یہ ثابت کر دیا کہ ترتیب و تنظیم حکومت کے جبر کے بغیر بھی ممکن ہے۔ "انہیں معاشی کیفیات سے انفرادیت

---

[1] Men Versus State (ا بمقابلہ ریاست
بحوالہ مبادی سیاسیات۔

جدیدہ جنم لیتی ہے۔" انفرادیت کی انتہائی شکل نراج .... ہے۔ اس کا مفہوم "عدم حکومت" ہے۔ اسکے حامی چاہتے ہیں کہ انسان کے قوائے ذہنی اور جسمانی ہیں اتنی ترقی ہو جائے کہ افراد اور جماعتیں بغیر کسی قسم کے خارجی دباؤ کے تمام زندگی کے کاروبار انجام دے سکیں، ان کے خیال میں حکومت کے فقدان کے باوجود ترتیب و تنظیم اسی طرح باقی رہیگی، مگر جبر کا عنصر بالکل الٹ جائیگا ان کا سب سے بڑا گرد کروپٹکن .... کہتا ہے "اگر تم مجر یط سے ماسکو جاؤ تو تمہیں بیسیوں ریلوں میں سفر کرنا پڑیگا، جنہیں کروڑوں مزدوروں نے بنایا ہوگا، جن کی ہم آہنگی کے لئے کسی برسر اقتدار مرکزی حکومت یا ادارہ کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوئی۔"[1] ان کے نزدیک موجودہ حکومت بیکار ہے ورنہ صرف تعلیم اور حفظان صحت بلکہ ملک کی حفاظت بھی اختیاری انجمنوں کے ذریعہ کی جاسکتی ہے۔ ان کا قول ہے کہ تاریخ انسانی میں اس قسم کی مثالیں نظر آتی ہیں کہ بیرونی حملہ آور کسی ملک کی منظم فوجوں پر تو کامیابی حاصل کر لیتے ہیں لیکن انہیں شہریوں کے ایسے مسلح گروہوں کے سامنے نیچا دیکھنا پڑتا ہے جو جگہ جگہ سے چھپ کر حملہ بول دیتے ہیں، ان کے نزدیک، فرد حقیقی معنی میں اسی وقت آزاد کیا جا سکتا ہے جب سیاسی بساط سے ریاست اور حکومت دونوں کا جنازہ اٹھ جائے اس وقت فرد کو ریاست اور سرمایہ دار دونوں کی محکومی سے آزادی نصیب ہو جائیگی اور ملکی امور ان کی بجائے اختیاری انجمنوں کے ذریعہ انجام پذیر ہوا کرینگے!

....

انفرادیت جدیدہ کے حامیوں کو یہ تسلیم ہے کہ انسان خود غرض ہے افراد اور جماعتوں کی باہمی اغراض میں تصادم ہوتا رہتا ہے کیا اس تصادم کے روکنے کیلئے اختیاری انجمنیں اور اختیاری ادارات کافی ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں! اس کا نتیجہ یہ ہوگا جو زیادہ طاقتور ہوگی وہی موجودہ حکومت کی جگہ لے لیگی اور دوسری اختیاری اداروں کو اپنا مطیع بنا لے گی، یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے انسان کی فطرت میں حاکم و محکوم ہونے کی صلاحیتیں اور احساسات پائے جاتے ہیں اور محض نظریہ اور انسانی تخیل سے انسانی فطرت بدلی نہیں جاسکتی

اس لئے اس نظریہ کا تعلق خیالی دنیا سے عملی دنیا کے اعتبار سے زیادہ ہے جو سود مند ہونے کے لئے بڑی دلیل ہے۔

اجتماعیت کا نظریہ

اس نظریہ کی ابتدائی شکل اشتراکیت ہے، اسکے بانی اور سب سے بڑے گرو کارل مارکس .... نے ۱۸۴۷ء میں جرمنی زبان میں ایک کتاب .... (اصل داری) کے نام سے شائع کی، اس میں اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ دنیا کے جملہ آلام و مصائب کی جڑ ذاتی ملکیت ہے، دنیا کی مصیبتوں کا علاج صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ اس کا خاتمہ کر دیا جائے اور اس کی جگہ مشترکہ ملکیت کے اصول پر عمل کیا جائے۔ اس عقلیہ کے تمام انتظامات ریاست کے ذمہ ڈال دئے جائیں۔ ریاست افراد کی فلاح و بہبودی سے خود افراد سے زیادہ واقف ہوتی ہے، مقاصد کے حصول کیلئے ریاست کو جملہ عاملین پیدائش پر خصوصی نگرانی لازمی طور پر کرنا چاہیئے۔ کارخانوں کا انتظام اس کا فرض ہے اور ہر شخص کے واسطے اسکے کام کے مناسب آرام و راحت کا انتظام کرنا بھی اسی کا فرض منصبی ہے۔ مارکس کا خیال ہے کہ اس طرح مقابلہ کا مضرت رساں جذبہ فنا ہو جائیگا اور افراد اپنے مفاد کیلئے نہیں ملک کے معاشری مفاد کیلئے کوشاں ہوں گے اور اسکی وجہ سے پوری ریاست کو طرح طرح کے مفاد حاصل ہوں گے!

اجتماعیت .... اشتراکیت کی ترمیم شدہ شکل ہے۔ پچھلے اسی برس میں خصوصاً جنگ عظیم ۱۹۱۴-۱۸ء کے بعد اشتراکیت کے اصولوں میں کافی کمی زیادتی کی گئی ہے۔ اس کا دارومدار بھی کارل مارکس کے خیالات ہیں، اسکے حامی صرف یہ چاہتے ہیں کہ اشتراکی اصول کا اثر و نفوذ ہر ملک میں آہستہ آہستہ رواج پذیر ہو اور حکومت کی مشینری اشتراکیوں کے قبضہ میں آ جائے، اس مقصد کے حصول کیلئے مغربی یورپ میں ہر ملک کے اندر باقاعدہ اجتماعی سیاسی پارٹیوں کو منظم کیا گیا، ان میں سب سے پہلا گروہ جرمنی کے اندر "انجمن مزدوران" کی شکل میں نمودار ہوا، اس انجمن کو انیسویں صدی کے وسط میں فرونینڈ لاسال نے قائم کیا تھا، ۱۸۷۵ء میں جرمانی "دستوری اشتراکی" گروہ ظاہر ہوا اور اس نے اہمیت حاصل کر کے ۱۸۹۱ء میں اپنے پیش نامہ کا اعلان کر دیا یہ فریق حکومت میں اس وقت تک ارتقاء کا خواہشمند تھا جبتک ملک میں اشتراکی خیالات پورے طور سے سرایت نہ کر جائیں،

---

[1] "نراج کا فلسفہ اور اسکا مطمع نظر" بحوالہ مبادئ سیاسیات۔

انگلستان میں اشتراکی خیالات کے روحِ رواں جارج برنارڈ شا اور فے بین سوسائٹی (جسکے کرتا دھرتا مسٹر سڈنی دیب تھے جو سنہ ۱۹۲۹ء کے وسط میں جب مزدور جماعت کی وزارت ترتیب دی گئی تھی تو یہ زیر نوآبادیات تھے) ان لوگوں کا مطمح نظر یہ رہا ہے کہ ایک طرف لامرکزیت کے اصول کی نشر و اشاعت کریں اور دوسری طرف جبری بیمہ، معمر لوگوں کے وظائف کے تقرر، کارخانہ داروں اور مزدوروں کی جبری پنچایت اور کارخانوں کی نگرانی کے اصول کی آڑ میں حکومت کے دائرۂ اثر کو وسیع کریں، یہی وجوہ تھے جن کی وجہ سے ان اجتماعیوں کو عظیم الشان کامیابیاں حاصل ہوئیں، چنانچہ ایک طرف سنہ ۱۹۱۹ء میں جمہوریہ جرمنی کا سب سے پہلا صدر وہاں کے اشتراکی گروہ کا لیڈر فریڈرش ایبرٹ مقرر ہوتا ہے، دوسری جانب انگلستان میں سنہ ۱۹۲۴ء میں انگلستان کی مزدور پارٹی کا لیڈر ریمزے میکڈانلڈ وزارتِ عظمیٰ پر فائز ہوتا ہے۔

کمیونزم کا نظریہ!

اشتمالیت .... بھی اشتراکیت کے اصول کو بروئے کار لانے کا ایک دوسرا طریق کار ہے۔ ضمناً یہ معلوم ہو چکا کہ اجتماعیت کے حامیوں کا اشتراکی اصول اور قواعد کو عملی شکل دینے کا طریق کار یہ تھا کہ ارتقاء کے ذریعہ اشتراکیت کو ہمہ گیر کیا جائے، اشتمالیت یا کمیونزم کے حامیوں کا طریق کار یہ ہے کہ ان اصولوں کو انقلاب اور فرقہ وارانہ جنگ کے ذریعہ بروئے کار لایا جائے، ان کا خیال ہے کہ سرمایہ داروں نے اپنی بنیاد اتنی مستحکم کر رکھی ہے، کہ وہ نرمی سے اپنی جگہ چھوڑنے کو آمادہ نہیں ہو سکتے ہیں، ابتدائی کمیونزم کے حامیوں میں مشہور جرمانی سیاسی فلسفی اینگلز سب میں ممتاز تھا[1] لیکن اسے عملی شکل دینے والا لینن Lenin تھا جو سنہ ۱۹۱۷ء سے سنہ ۱۹۲۴ء تک روس کا ڈکٹیٹر رہا۔ لینن کہتا ہے[2] "یہ خیال خام ہے کہ جس طبقہ کے قبضہ میں صدیوں سے اقتدار رہا ہے وہ بغیر فیصلہ کن جنگ کے آسانی سے اپنے اقتدار سے دست بردار ہو جائیگا[3] ضرورت اس کی ہے کہ ملک کا مزدور اور محنتی طبقہ جبرًا موجودہ سیاسی اختیارات اپنے قبضہ میں کر لے اور اپنے مقاصد کے حصول کیلئے انہیں کام میں لائے"۔ کمیونزم کے حامیوں کا خیال ہے کہ موجودہ زمانہ کی بدامنی اور کشمکش کی وجہ صرف عدم مساوات ہے کامل مساوات کے بعد ایسی سیاسی فضا پیدا ہو جائے گی جس میں جبر و اکراہ کی حاجت نہ رہے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت کی حاجت بھی نہیں رہے گی، اس کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب مختلف طبقوں میں توازن قائم نہ ہو

لیکن جب آبادی کے مختلف طبقوں میں مساوات کی بنا پر توازن قائم ہو جائیگا تو حکومت کی ضرورت باقی نہ رہے گی، اشتراکیوں اور انفرادیوں کے خیالات میں یوں زمین و آسمان کا فرق ہے لیکن دونوں کا مطمح نظر ایک ہے، یعنی دونوں کا مقصد یہ ہے کہ ایک زمانہ آجائے جس میں فرد کو کامل آزادی نصیب ہو اور کسی قسم کے خارجی دباؤ کی ضرورت باقی نہ رہے!

سوشلزم اور کمیونزم پر ایک تنقیدی نظر

یہ تحریکیں بھی حدِ اعتدال سے گزری ہوئی ہیں اور مغالطوں سے پر ہیں، سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ان میں تین "عاملین پیدائش، زمین، محنت اور اصل میں سے محنت پر زیادہ زور دیا گیا ہے"۔ دوسرے ہم دیکھتے ہیں کہ "موجودہ انفرادی حالات میں قیمت، نوعیت و مقدار پیداوار، تقسیم دولت اور دو معاشی امور کا تعین خود بخود طلب و رسد کے قانون کے ذریعہ ہو جاتا ہے، لیکن جب مقابلہ ہی نہ رہے گا تو پھر ان کا تعین دشوار ہو جائیگا، تیسرے جہاں مقابلہ نہ ہونے سے رشوت ستانی اور سازشوں کا بازار گرم ہو جائیگا، وہاں جب ذاتی بہبود اور ذاتی منفعت کا خیال نہ رہیگا تو افراد بے پرواہ ہو جائینگے"۔ ارسطو کہتا ہے "جب انسان کسی کام کو خود اپنا تصور کرتا ہے تو وہ اس میں شرکت کے کام سے زیادہ دلچسپی لیتا ہے"[1]

"خیالی دُنیا سے عملی دُنیا بہت مختلف ہے"[2]۔ خیالی اعتبار سے ایک طرف ہربرٹ سپنسر اور کروپوٹکن کے نظریے اور دوسری طرف کارل مارکس اور اینگلز کے خیالات بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں،

---

[1] ملاحظہ ہو اعلان اشتمالین

[2] ملاحظہ ہو لینن کی کتاب "انقلاب طبقۂ اسفل"

---

[1] ترجمہ انگریزی جونٹ، ۲، ۳، ۴،

[2] ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب ام اے پی ایچ ڈی

لیکن جب انھیں عملی دُنیا میں لایا جاتا ہے تو ان پر عمل دشوار ہوتا ہے۔ چنانچہ جن ملکوں میں انفرادی نقطۂ نظر سے حکومت رائج ہے وہاں عام بہبودی اور زمانہ کی ضروریات نے انھیں مجبور کیا ہے کہ حکومت کے مختلف شعبوں میں اشتراکی اصول اختیار کریں اور وہاں حکومت کا دائرہ اقتدار وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ دوسری جانب روس میں جو ۱۹۱۷ء سے کمیونزم کا مرکز ہے، یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مکمل طور سے کمیونزم کے اصول پر عمل کر کے ترقی کی "موجودہ منزل" بھی اس وقت تک طے نہیں کی جا سکتی ہے جب تک افراد کو تھوڑی بہت آزادی نہ دی جائے اور انفرادیت کے اصول پر ایک حد تک عمل نہ کیا جائے۔

اس بحث و نظر سے یہ چیز بخوبی ثابت ہو گئی ہے کہ اشتراکیت اور انفرادیت دونوں کے اصول میں افراط و تفریط پائی جاتی ہے، اور ان کے حامی اعتدال پر قائم نہیں رہے ہیں، آزاد اور متمدن ملکوں میں "حکومت کا دائرۂ عمل" یہ ہے کہ ملک کی ترقی اور فلاح و بہبودی کے تمام شعبوں پر ان کی نگرانی ہوتی ہے اور نہ صرف رسل و رسائل اور معاشی پالیسی پر اس کا اقتدار ہوتا ہے بلکہ بڑی حد تک تعلیم اور حفظانِ صحت کے مسائل بھی اسکے ذمہ ہوتے ہیں، حکومت کی طرف سے کارخانوں کی سرپرستی کی جاتی ہے، اور وقتاً فوقتاً صنعتی نمائشوں کے ذریعہ دُنیا کی توجہ ملکی پیداوار اور مصنوعات کی طرف مبذول کی جاتی ہے۔ ملکی صنعت و حرفت کو بیرونی مصنوعات پر طرح طرح کے محصول عائد کر کے، محفوظ کیا جاتا ہے، اکثر متمدن ممالک میں ریلوں کو یا تو حکومت براہِ راست چلاتی ہے ورنہ ان پر نگرانی ضرور رکھتی ہے،

غرض "حکومت کا دائرۂ عمل" ہر ملک کے حسب حال ہونا چاہیئے کوئی طریقۂ کار ہر جگہ یکساں طور سے مفید ثابت نہیں ہو سکتا، اس لئے یہ ناگزیر ہے کہ "دائرۂ عمل" کا خاکہ بناتے وقت ہر ملک کے جغرافیائی، تہذیبی اور خصوصی حالات کا لحاظ رکھا جائے ورنہ کامیابی مشتبہ رہے گی، غور کرتے وقت یہ خیال ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ نظری اور عملی سیاست میں زمین، آسمان کا فرق ہے!

۱۲ وَلی وارثی

غزل

گلشن میں ہر اک پھول زباں رکھتا ہے لیکن
مبہوت سا ہے نغمۂ بلبل کے اثر سے

کچھ بادہ و ساغر کی حقیقت نہیں ساقی
مے خانے کی رونق ہے فقط تیری نظر سے

اصغر[1] کی غزل کیا ہے غزل ہے کہ فسوں ہے
پوچھے یہ کوئی جا کے ولی اور جگر سے

[1] اصغر گونڈوی مرحوم

رئیس امروہوی

اخبار نویسوں کی قیمت!

یورپی اخبارات وجرائد کے متعلق عام طور پر یہ اعتماد ہے کہ وہ خارجی اثرات سے بلند تر ہو کر قوموں اور ملکوں کی خدمت کرتے ہیں، اور اپنے نقطۂ نظر کے اظہار میں کسی طاقت و اقتدار سے مرعوب نہیں ہوتے —— مگر بعض مستثنیات کو چھوڑ کر یہ خیال صحیح نہیں۔ یورپی جرائد اکثر وبیشتر اپنا قلم، اپنا دماغ، اور اپنا ضمیر بہت آسانی سے فروخت کر دیتے ہیں گو یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ وہ معمولی داموں پر یہ سودا نہیں کرتے، ان کی جنبش قلم کو خریدنے کے لئے ہزاروں لاکھوں پونڈ کی ضرورت پڑتی ہے، یہ خصوصیت تو ہم ہندوستانی اخبار نویسوں کو ہی حاصل ہے کہ اگر کبھی بکتے بھی ہیں تو پورے دام نہیں اٹھتے —— اس مقالہ میں بتلایا گیا ہے کہ یورپ کے اخبارات کس طرح گنگا جمنی مصلحتوں اور سنہری روپہلی اغراض کے ماتحت غیر ملکی طاقتوں کے آلۂ کار بن جاتے ہیں اور جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں —— اگر غور کیا جائے تو رائے عامہ کو جنگ کی طرف مائل کرنے میں سب سے اہم حصہ انھیں سنگین صحافیوں اور پُرامن اخبار نویسوں کا ہوتا ہے، آپ موجودہ لڑائی کے پس منظر میں بھی ایڈیٹر کے قلم اور صحافت کے دماغ کو پُراسرار سازشوں میں مصروف دیکھ سکتے ہیں۔ (رئیس)

لندن کے مشہور اخبار نویس اور روزنامہ "ڈیلی میل" کے بانی مسٹر کینڈی جونس (KENNEDY gonce) نے صحافت کی تعریف مندرجۂ ذیل الفاظ میں کی ہے۔

صحافت کیا ہے؟

وہ ایسا ادارہ ہے جس کا سب سے پہلا مقصد روپیہ کمانا ہے اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ عوام کو پوری طرح اخبارات کی سرپرستی اور قدردانی پر آمادہ کیا جائے، عوام عجائب پسند ہوتے ہیں، وہ اپنی تفریحِ طبع اور دلبستگی کے لئے سنسنی دوڑا دینے والی خبریں چاہتے ہیں سنسنی دوڑا دینے والی خبریں صرف جنگ مہیا کرتی ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ لڑائی کا زمانہ اخبارات و جرائد کی مقبولیت و ہردلعزیزی کا زمانہ ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر جزائر برطانیہ کے مشہور ترین روزنامہ "لنڈن ٹائمز" کو لیجئے، جنگ کریمیا نے ٹائمز کو ٹائمز بنا دیا، اور اس نے کثرت اشاعت کی بنا پر اس قدر دولت و خوشحالی پیدا کر لی کہ صرف ایک پینی روزانہ میں اتنا ضخیم پرچہ اپنے خریداروں کو دینے لگا۔ روزنامہ "اسٹینڈرڈ" کے لئے ہندوستان کا غدر ۱۸۵۷ء بھی ایسا ہی مبارک ثابت ہوا کہ اس نے ایک پیسہ روزانہ اپنی قیمت مقرر کر دی۔ فرانس اور پرشیا کی جنگ (۱۸۷۰ء) کے دوران میں "ڈیلی ٹیلی گراف" کی اشاعت پچاس ہزار سے بڑھ کر ایک لاکھ پچاس ہزار ہو گئی۔ اور مصر و سوڈان کی جنگ کے وقت ڈھائی لاکھ تک جا پہنچی۔

جنوبی افریقہ کی جنگ (بوئر وار) کے دوران میں "ڈیلی میل" (لندن) نے اشاعت کا اک نیا معیار قائم کیا، اس نے اس لڑائی کے اخباری میدان میں اس عمدگی اور قابلیت سے قدم رکھا کہ اشاعت ۵ لاکھ کے بجائے دس لاکھ ہو گئی۔ لیکن پچھلی لڑائی کے دوران میں ٹائمز کی ساکھ گر گئی، اور وہ اپنی قیمت دو پنس کے بجائے تین پنس مقرر کرنے پر مجبور رہا۔

ان مثالوں سے بخوبی ظاہر ہے کہ جنگ اخباروں کیلئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوتی ہے، اور وہ عموماً اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ صفحۂ ارض کے کسی گوشہ پر لڑائی کے شعلے بھڑکیں اور وہ عوام کے جذبات سے کھیل کر اپنے لئے دولت و اقتدار پیدا کریں، مگر یہ خیال قائم کر لینا بھی غلط ہے کہ وہ اپنے مفاد کے لئے

فقط یہی طریقہ استعمال کرتے ہیں، بلکہ بسا اوقات وہ جنگ کی مخالفت میں اپنا مفاد پاتے ہیں اور لڑائی کے خلاف دھنواں دھار مقالات لکھنے شروع کر دیتے ہیں، اس کی ایک بہترین مثال "قضیہ تونس" پیش کرتا ہے۔ برلن کانگریس میں مختلف یورپی طاقتوں کے نمائندوں نے خفیہ طور پر ٹیونس (جس پر ۸ نومبر ۱۹۴۲ء کو اتحادیوں نے حملہ شروع کیا ہے) فرانس کے حصہ میں دیدیا تھا مگر جب یہ معاہدہ منظر عام پر آیا تو لندن کے اخبارات میں آگ لگ گئی، اس کی وجہ یہ تھی کہ برطانی وزارت خارجہ نے پریس کو شہ دیدی تھی، اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لندن ٹائمز نے لکھا کہ

"یہ ناممکن ہے کہ فرانس شمالی افریقہ کے ساحل پر اپنی نوآبادیاں قائم کرے کیونکہ اس کا نتیجہ فرانس و انگلستان کی جنگ کی شکل میں نکلے گا"

۱۸۸۰ء اور ۱۸۹۰ء کے درمیان طنجہ (الجزائر) کے مسئلہ پر انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان چل پڑی، اور برطانی حکومت نے لندن کے اخباروں کو فرانس کے پیچھے لگا دیا، اور انھوں نے اس مسئلہ پر خوب خوب زہر افشانیاں کیں۔"

۱۴ یہ ہے برطانی پریس کا کمال ——— جو تمام یورپ میں سب سے زیادہ سنجیدہ اور معقولیت پسند پریس خیال کیا جاتا ہے، لیکن جو ملک جذباتی اور انتہا پسند واقع ہوئے ہیں، ان کے پریس کی تلوّن مزاجی اور انتہا پسندی کا کیا کہنا؟

اس سلسلہ میں سروی اور آسٹروی پریس کی مثال ہمارے ذہن میں آتی ہے، سرویا اور آسٹریا کے درمیان عملی لڑائی کا آغاز جولائی ۱۹۱۴ء (جنگ عظیم کی ابتدا) میں ہوا، لیکن مشہور سیاستدار، مجاٹووچ راوی ہے کہ سرویا اور آسٹریا کے پریس کے درمیان ۱۹۰۴ء ہی سے ٹھن گئی تھی، وہ ایک دوسرے کے خلاف خوب خوب الزام لگاتے تھے اور یہی قلم کی لڑائی انجام کار ۱۹۱۴ء میں تلوار کی لڑائی میں تبدیل ہو گئی۔

اس چیز سے پریس کی طاقت کا ثبوت ملتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حکومتیں سماج اور رائے عامہ کے اس طاقتور آلہ کو اپنے اثر میں لینے کی کوششیں کرتی رہتی ہیں۔

برطانی حکومت زمانۂ امن میں صرف اس چیز پر اکتفا کرتی ہے کہ اخبارات کو سرکاری مراسلات اور بیانات نشر و اشاعت کی غرض سے بھیجتی رہے، بعض اوقات برسر اقتدار وزارت کا کوئی رکن کسی مشہور اخبار نویس سے گہرے تعلقات پیدا کر لیتا ہے، چنانچہ جنگ کریمیا کے دوران میں لارڈ پارسٹن اور مارننگ پوسٹ کے درمیان گہرے تعلقات پیدا ہو گئے تھے، البتہ بعض اوقات انگریزی صحافت نے غیر معمولی ذمہ داری اور قابل رشک آزادیٔ رائے کا ثبوت دیا ہے، جس کی بہترین مثال لندن ٹائمز کا وہ دلیرانہ رویّہ پیش کرتا ہے جو اس نے ۱۹۰۳ء میں شاہنشاہ ایڈورڈ ہفتم کے مقابل اختیار کیا، اس زمانہ میں لندن ٹائمز جرمنوں کے خلاف پروپیگنڈا کر رہا تھا اور شاہنشاہ ایڈورڈ قیصر ولیم سے اتحاد کرنے کے حامی و ساعی تھے، آخر انھوں نے ایک خفیہ قاصد لندن ٹائمز کے ایڈیٹر کے پاس روانہ کیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ اپنے مخالف جرمن رویّہ کو بدل دے" آپ کو معلوم ہے کہ تاجدار برطانیہ کے اس پیغام کا جواب لندن ٹائمز کے اولوالعزم ایڈیٹر نے کیا دیا، اس بلند نظر اور حریّت پسند مدبّر نے شاہنشاہ ایڈورڈ کو جواب میں لکھا کہ

لندن ٹائمز ہز میجسٹی کی خواہشات کا احترام کرنے کے لئے ہر وقت تیار ہے، لیکن اس معاملہ میں....... صرف اسی معاملہ میں معذور ہے۔

ٹائمز کے متعلق کچھ ہی کیوں نہ کہا جائے لیکن اس مقام پر تو وہ شاہی اثر سے بھی آزاد نظر آتا ہے ——— یہ یقیناً ایک عظیم الشان واقعہ ہے اور اس کا راوی بھی اتنا ہی عظیم الشان ہے یعنی خود قیصر ولیم اس شاندار روایت کے ناقل ہیں، پھر بھی یہ بات طے شدہ ہے کہ یورپ کی اکثر حکومتیں اخبارات و جرائد کو رشوت دینے کی عادی ہیں، بلکہ بعض موقعوں پر تو وہ مخالف پارٹی کے اخبارات کو بھی خرید لیتی ہیں ——— اسکی تعجب انگیز مثال فرانسیسی چیمبر میں دوہرائی گئی کہ دوران جنگ میں حکومت فرانس نے حزب الاختلاف کے اخبار "بونٹ رگ" کو خرید لیا تاکہ اس کی مخالفت سنجیدہ حدود تک محدود رکھی جائے۔

(مانچسٹر گارجین کی رپورٹ ۱۷ دسمبر ۱۹۲۴ء)

یہ حکومتیں صرف ملکی اخبارات کے ضمیر و دماغ کو ہی نہیں خریدتیں بلکہ غیر ملکی صحافت پر بھی اثر ڈالتی ہیں، چنانچہ روسی غیر ازوسکی (۱۹۱۴ء) کا بیان ہے کہ

"ترکی الیات کے مسلّمہ افلاس کے باوجود ۱۹۱۳ء میں ترکی سفیر مقیم پیرس نے فرانسیسی اخبارات کو لاکھوں فرانک بطور

رشوت پیش کئے، اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس نے فرانسیسی نامہ نگاروں اور صحافیوں سے تقریباً پچاس لاکھ کا وعدہ کیا تھا جس کا ½ حصہ زرِ نقد کی صورت میں ادا ہونا تھا، چنانچہ "لیبرے بیٹرول" نے اس سلسلہ میں ایک لاکھ فرانک حاصل کئے۔"

بہت سی شہادتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یورپی حکومتیں اکثر اپنے غیر ملکی سفراء کے ذریعہ اخبارات کو روپیہ تقسیم کرتی ہیں اطالوی سفیر مقیم استانبول نے ۱۸۸۸ء میں سر چارلس ڈلکی کو لکھا کہ اطالوی پریس کا معتد بہ حصہ فرانسیسی حکومت نے خرید لیا ہے جیسے کہ اس سے پہلے "استیخانی ہیواس" ایجنسی نے خرید لیا تھا۔

۱۹۰۴ء میں ایک جرمن مدبّر نے واضح الفاظ میں اس لین دین کی طرف اشارہ کیا جو فرانسیسی حکومت اور اطالوی پریس کے درمیان ہوا تھا۔

اخبارات کو سب سے بڑا مالی فائدہ اُس سیاسی جمود کے درمیان میں پہنچا جو ۱۹۱۴ء سے پہلے سردیا اور آسٹریا کے متنازعہ مسائل کے سلسلہ میں یورپی سیاسیات پر طاری ہو گیا تھا، جرمن دستاویزات میں اس کی طرف صریح اشارات پائے جاتے ہیں، چنانچہ کاؤنٹ جاگو اپنے جرمن سفیر (مقیم روم) سے بذریعہ تار دریافت کرتا ہے کہ

"آیا یور ایکسیلنسی یہ بتانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے کہ اطالوی پریس کو متاثر کرنے کیلئے کتنے روپیہ کی ضرورت ہے؟"

۲۱ر جولائی ۱۹۱۴ء کو وہ اپنے سفیر (مقیم وائنا) کو ہدایت کرتا ہے کہ حکومت آسٹریا سے اس مقصد کیلئے رقم طلب کرو۔

۲۵ر جولائی ۱۹۱۴ء کو جرمن سفیر (روم) اپنی رپورٹ میں رقمطراز ہے کہ

"میرے آسٹروی معاصر نے اخبارات کو رشوت دینے کے لئے ۱ لاکھ فرانک خرچ کئے ہیں، کیا میں اس سلسلہ میں بیس ہزار سے تیس ہزار مارکس تک پر اعتماد کر سکتا ہوں؟"

اب دوسری طرف روس پر نظر ڈالئے، پیرس کا روسی سفیر ازوسکی اپنی یادداشت میں رقمطراز ہے کہ

"اگر ہم چاہتے ہیں کہ درۂ دانیال کا مسئلہ ہماری مرضی کے مطابق طے ہو تو ہمیں پیرس کے اخبارات کا اعتماد حاصل کرنا پڑیگا، لیکن بدقسمتی سے میرے پاس روپیہ موجود نہیں ہے، حالانکہ اطالوی سفیر (ٹٹونی) دل کھول کر صرف کر رہا ہے۔"

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ چند روز کے بعد روسی سفیر (ازوسکی) کی یہ شکایت رفع ہو گئی، کیونکہ جولائی ۱۹۱۴ء میں اس نے پیرس کے اخبارات کو بڑی فیاضی اور دریا دلی سے روپیہ تقسیم کیا۔

اس سے دو برس قبل اکتوبر ۱۹۱۲ء میں موسیو سیزونوف (روسی وزیر خارجہ) نے اپنی ذمہ داری پر تین لاکھ فرانک کی گرانبہا رقم ازوسکی کو اس مقصد کیلئے دی تھی، اور لطف یہ ہے کہ روس کا یہ کثیر التعداد روپیہ فرانسیسی اخبارات پر موسیو پوائنکارے (وزیر اعظم فرانس) اور دیگر فرانسیسی مدبّرین کی زیرِ نگرانی تقسیم ہوا کیونکہ فرانسیسی حکومت خود ملکی رائے عامہ کو روس کی مدافعت میں منظم و مضبوط کرنا چاہتی تھی۔

اس کے بعد حکومت فرانس اور روس نے یورپی اخبار نویسوں کو خریدنے کا ایک مشترکہ پروگرام بنایا، اور ایک بین الاقوامی ایجنسی کے ذریعہ سونے چاندی کی یہ لوٹ شروع ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ جرمن، آسٹریا اور ترکی کے خلاف ایک زبردست محاذ قائم کیا جائے، ہم ذیل میں صرف پیرس کے اخبارات کی فہرست پیش کرتے ہیں جن کو اس لوٹ مار میں حصہ ملا، ان کے علاوہ دیگر اخبارات نے جو رشوتیں لیں ان کی فہرست طویل ہے، فرانس کے جو اخبارات خرید لئے گئے وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) لا المنیٹرن .. .. .. ۴۰ ہزار فرانک
(۲) لا اُوورر .. .. .. ۱۷ ہزار فرانک
(۳) ایل اونٹمینٹ .. .. ۱۱ ہزار فرانک
(۴) ایل ایکشن .. .. ۹ ہزار فرانک
(۵) ایل فرانس .. .. ۱۱ ہزار فرانک
(۶) لی ریپل .. .. .. ۷ ہزار فرانک
(۷) لی گل بلیس .. .. ۲ ہزار فرانک
(۸) پیرس جنرل .. .. ایک ہزار فرانک

(ازوسکی جلد سوم صفحہ ۱۵۱۳ سی۔ الیف کا زاڈ صفحہ ۲۷)

یہ کچھ عجیب بات ہے کہ فرانسیسی اخبارات سے غیر ملکی حکومتیں بہت جلد معاملہ طے کر لیتی ہیں، اور فرانسیسی اخبارات مدّت سے یہ منفعت بخش کاروبار کرتے آئے ہیں، چنانچہ ۱۷۷۹ء میں پیرس کا مشہور جریدہ "ای فرانس اینڈ وی ایسٹینٹ" روسیوں کا تنخواہ دار تھا۔

جن لوگوں نے گزشتہ جنگ عظیم کے ذہنی اسباب کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے ان کا متفقہ طور پر یہ فیصلہ ہے کہ پچھلی لڑائی ہرگز شروع نہ ہوتی اگر یورپی اخبارات لڑائی پر اُدھار کھائے نہ بیٹھے ہوتے۔

انھوں نے رائے عامّہ کو جنگ پر ابھارا، باہم منافرت پیدا کی، ایک دوسرے کے خلاف الزامات لگائے، طرح طرح کے بہتان تراشے، جھوٹ بولے، چند ہزار سکّوں کی خاطر لاکھوں بے گناہوں کے سر کٹوا دیے، اور دانستہ طور پر ان خون آشام سرمایہ داروں کے آلۂ کار بن گئے، جن کا پہلا اور آخری مقصد صرف جنگ ـــــ عالمگیر جنگ تھا۔

اگر ہم موجودہ لڑائی کے ذہنی اور واقعاتی پس منظر کا تجزیہ کریں تو اس میں بھی ہمیں ان ضمیر فروش اخبار نویسوں کی خود غرضی اور غدّاری صاف طور پر جھلکتی نظر آ سکتی ہے ڈاکٹر جوزف گوئیبلز نے دنیا بھر کے اخباروں کو نازیوں کا ہمدرد بنانے میں جس قدر روپیہ خرچ کیا ہے اس کا اندازہ آسان نہیں، رائٹر ایجنسی تو مسلّمہ طور پر برطانی پروپگنڈا آفس کی ایجنٹ ہے، اس کے علاوہ دُنیا کے بہت سے خبر رساں ادارے اور نامہ نگار برطانی وزارت اطلاعات عامّہ کے اشاروں پر کام کرتے ہیں، امریکہ، جاپان، ترکی اور دوسرے ملکوں کا بھی یہی حال ہے، ایک لاکھ اخبار نویسوں میں بمشکل ایک فرد ایسا ہوگا جس کا قلم کسی اجنبی اثر و اقتدار کے پاس رہن نہ ہو، اور اب تو یہ کاروبار پہلے کے مقابل عمومیت اختیار کر گیا ہے، سوویٹ یونین کے علاوہ کسی ملک کا پریس سرمایہ داروں کی گرفت سے آزاد نہیں۔

بہرحال جنگ میں اخبارات کا حصہ دیکھ کر ہمیں پرنس بسمارک کا وہ قول یاد آجاتا ہے جو اس نے اخبارات کی ایسی (خفیہ) کارگزاری کے متعلق اپنے ایک دوست سے کہا تھا۔

"یاد رکھو! تلوار چلانے سے پہلے قلم حرکت میں لائے جاتے ہیں۔"

مرزا یگانہ چنگیزی علیہ السّلام

رُباعی

کیا بھانپتا ہے بھانپنے والے بازار
حیران ہے بوٹا بانٹنے والے بازار
سنتی جا ہے کل اور بھی دور سے دور
آفاق کی صدا پینے والے بازار

اکرام قمر۔ ایم اے

میکاولی کا سیاسی فلسفہ

جارج ۔ ایچ ۔ سیبائن اپنی کتاب "سیاسی نظریہ کی تاریخ" میں میکاولی پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے "میکاولی کا کردار اور اس کا فلسفہ موجودہ تاریخ کے لئے ایک معمہ بنا رہا ہے۔ کبھی تو اُسے ایک کٹر کلبی .... ظاہر کیا جاتا رہا ہے۔ کبھی ایک گرم مزاج محبّ وطن۔ بعض نے اُسے سرگرم قوم پرور گردانا اور بعض نے اُسے ایک سیاسی سیوعی سمجھا۔ کچھ لوگوں کی رائے میں وہ دل سے جمہوریت پسند تھا اور کچھ اصحاب کا خیال ہے کہ وہ مطلق العنان فرماں رواؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بے باکی کی حد تک پہنچ گیا تھا۔

پندرہویں صدی عیسوی میں سلطنت اور پاپائیت کا نزاع کم ہو چکا تھا۔ جاگیرداری نظام ختم ہو رہا تھا۔ بادشاہوں کی قوت قدرتی طور پر بڑھ رہی تھی۔ کلیسا اور ریاست دونوں میں ہی شخصی قوت کی طرف قدم بڑھائے جا رہے تھے۔ جاگیرداروں اور مجموعیوں (کارپوریشنوں) کے بجائے سیاسی طاقت ایک فردِ واحد ــــ بادشاہ ـ ـــ کے ہاتھوں میں مرکز ہو رہی تھی۔ انگلستان میں ہنری ہفتم۔ فرانس میں لوئی نہم اور ہسپانیہ میں فرڈی ننڈ طاقتور بادشاہ تھے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہر جگہ مضبوط آدمی کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی اور طاقتور بادشاہ وقت کا سب سے بڑا تقاضہ تھا۔ قومی ریاست کا موجودہ نظریہ نشو و نما پا رہا تھا۔

اس تبدیلی کا تمام یورپی سماج پر اثر ہوا۔ وسائل کی کمیابی کی بنا پر تجارت مقامی ہو کر رہ گئی تھی اور شہر اقتصادی اکائیاں بن گئے تھے۔ ایک قسم کا وفاقی نظام ہی اس صورت کا صحیح حل تھا۔ پیداوار کا انتظام بلدیاتی گلڈوں (یعنی ہم پیشہ لوگوں کی بلدیاتی انجمنوں) کے ہاتھ میں تھا۔ اب اس طریق میں بھی تبدیلی رونما ہوئی۔ تجارت بکھری بکھری تھی۔ تمام ملوکیتیں اپنے قومی وسائل کو استعمال میں لانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھیں۔ سوداگر طبقہ اس دور میں پیدا ہو گیا۔ وہ امراء سے غیر مطمئن تھا اس لئے بادشاہ کے ساتھ تھا۔ اس طرح ازمنۂ وسطیٰ کے تمام ادارے آہستہ آہستہ ختم ہونے لگے اور بادشاہت کے پاؤں جمنے لگے۔ یہ نظریہ رائج ہو گیا کہ بہت سے ظالم امراء کی حکومت کی نسبت ایک ظالم بادشاہ کی حکومت بہتر ہے۔

سولھویں صدی کے آغاز ہی سے قومی ملوکیتیں زور پکڑنے لگیں ازمنۂ وسطیٰ کے ادارے، آئینی جاگیرداری، شہری ریاستیں، اور کمزور مگر دولتمند کلیسا دب کر رہ گئے۔ حکومتیں اب درمیانی طبقہ پر زیادہ انحصار کرنے لگیں۔

علوم کا احیا ہو رہا تھا۔ فلاسفر بھی اپنے بدلتے ہوئے ماحول سے متاثر ہو رہے تھے۔ چنانچہ میکاولی (۱۴۶۹-۱۵۲۷ء) بھی حالات زمانہ سے اثر لئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ ازمنۂ وسطیٰ کے اداروں سے بھی واقف تھا اور قومیت کے جس نئے جذبہ پر نئے ادارے استوار کئے جا رہے تھے وہ اس سے بھی آگاہ تھا، اسے اس کا بھی احساس تھا کہ ان تبدیلیوں میں قوت و طاقت کا کیا حصہ ہے، وہ ایک خوشگوار سماجی زندگی کا خواہاں تھا، چونکہ اس نے بیدین تربیت پائی تھی اس لئے اس نے یہ جاننے کی کوشش کبھی نہ کی کہ مطلوبہ تبدیلی میں اخلاق و مذہب کا کتنا حصہ ہوگا۔

پروفیسر ہیرن شا اپنے کتابچہ "ارتقائے نظریات سیاسی" میں میکاولی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :- 17

"میکاولی فلورنس کی مختصر سی مگر عظیم الشان جمہوریت کا باشندہ تھا، وہ ایک اطالوی محبِّ وطن تھا۔ وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ اس کا ملک تشتّت و انتشار اور مفسدہ پردازیوں کی بنا پر طاقت کی دوڑ میں مغرب کی بڑی بڑی قومی ریاستوں سے پیچھے رہ گیا ہے اور وہ زمانہ کچھ دور نہیں جب اُسے فرانس یا ہسپانیہ فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیں گے، یا یہ دونوں اس پر قبضہ کرنے کے لئے باہم جھگڑیں گے اور یہ تباہ و برباد ہو جائے گا چنانچہ وہ کوئی ایسا طریقہ معلوم کرنے کے لئے بہت بیتاب تھا جس سے اطالیہ متحد ہو جائے، ہر قسم کے جارحانہ اقدام کا مقابلہ کر سکے، غیر ملکیوں کو باہر نکال سکے، نظم و قانون قائم کر سکے، اور فنون و تمدّن کی ترقی کے لئے مناسب ماحول پیدا کر سکے۔ اسی مقصد کی خاطر اس نے تین بڑی بڑی کتابیں ــــ (۱) فن جنگ۔ (۲) لائیوی پر مکالمات ـ اور (۳) بادشاہ ــــ لکھیں"

میکاولی صرف فلسفی ہی نہ تھا، وہ اپنے زمانہ کا ایک عملی انسان بھی تھا، وہ فلورنس میں ایک اہم سرکاری کمیٹی کا سکریٹری تھا۔ اُسے جلاوطنی اور قید کا سامنا بھی کرنا پڑا، رہائی کے بعد وطن واپس آکر اس نے

باقی عمر تصنیف و مطالعہ میں صرف کی، اس نے فلورنس کی تاریخ بھی لکھی اس میں اس نے بادشاہوں کی بہت تعریف کی ہے۔ اس کتاب کی ادبی حیثیت بہت بلند ہے۔

اطالیہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے تھے۔ ہیجان و انتشار کا دَور دورہ تھا۔ شہروں پر جبر و استبداد کی حکومت تھی، فوجی تنخواہ دار اور پیشہ ور تھے، وطن پرور رضاکاروں کی کوئی فوج نہ تھی۔ کئی مطلق العنان فرماں روا قابلیت کے مالک تھے اور کئی اس حیثیت سے صفر تھے، اندرونی بدحالی کے علاوہ بیرونی خطرہ بھی موجود تھا۔ ہسپانیہ اور فرانس کی آنکھیں اطالیہ پر لگی ہوئی تھیں۔

اطالیہ کے پانچ حصے ہو چکے تھے، پاپائے اعظم نے اب اپنے لئے یہ حیثیت قبول کر لی تھی کہ وہ حاکموں کا حاکم نہیں بلکہ ان کے برابر ہے، اگرچہ وہ خود اطالیہ کو متحد کرنے کی تو قوت نہ رکھتا تھا، مگر وہ اتحاد اطالیہ کی ہر کوشش کے راستہ میں روڑے اٹکا سکتا تھا، اور بیرونی حملہ آوروں کو حملہ کے لئے بلا سکتا تھا۔ کلیسا کو امن کا علمبردار ہونا چاہئے تھا لیکن وہ حکومت کا حریف بنا ہوا تھا۔ پاپائے اعظم کی اپنی کلیسائی سلطنت تھی، پادری عوام کو بھی بھڑکا رہے تھے، اطالیہ کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو بڑی مشکل کا سامنا تھا اس طرح اطالیہ کی ترقی مسدود ہو کر رہ گئی، چنانچہ ہر طرف سے پاپائے اعظم کی مذمت ہونے لگی۔ سیاسی انتشار کے علاوہ یہ دن اخلاقی اعتبار سے بھی بدترین تھے۔ اخلاقی، مجلسی اور مذہبی غرضیکہ ہر اعتبار سے اطالیہ اضداد کا مجموعہ بنا ہوا تھا، اگرچہ لوگ مذہبی رسوم کو بڑی سختی سے ادا کرتے تھے، مگر مذہب کی حقیقی روح سے تغافل برت رہے تھے۔

ذہنی آزادی تو موجود تھی مگر اداروں میں خراج قائم ہو چکا تھا، قوت اور خود غرضی کا دور دورہ تھا، ارسطو کا قول سچا ثابت ہو رہا تھا کہ "جب قانون اور انصاف باقی نہ رہیں تو انسان سب حیوانات سے بدتر ہو جاتا ہے"۔

میکاولی بے قابو انسانوں کے دور کا سیاسی مفکر تھا!

ملک کے انتشار اور بدنظمی سے وہ بہت متاثر ہوا تھا اور امن و نظم قائم کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک صاحب بصیرت انسان تھا اور اطالیہ کو متحد دیکھنا چاہتا تھا۔ اور اس امر کے لئے کسی مضبوط شخص کی حکومت کی ضرورت تھی۔ اس چیز پر میکاولی کے فلسفہ کی بنیاد ہے۔

وہ امن پسند تھا اور انسانی فطرت کے متعلق کلبی نقطۂ نظر رکھتا تھا۔ اس کے نزدیک سیاست کی بنیاد خود غرضی پر ہے۔ مقصد کے حصول کے لئے خواہ کوئی بھی راستہ اختیار کرنا پڑے، اختیار کرنا چاہئے، یعنی حکومت ہمیشہ مضبوط ہونی چاہئے، اس مسئلہ کو وہ صرف سیاسی ہی نہیں سمجھتا بلکہ اس سے بھی زیادہ اہمیت دیتا ہے، اس مسئلہ کو حل کرنے میں دو چیزوں نے اسکے لئے بہت سہولت پیدا کر دی۔

(۱) اس کا اپنا مطالعہ۔ اور (۲) اس کا اپنا تجربہ۔

قوتِ بازو اور دغا یہ سب اس مقصد (ریاست کی بقا) کے لئے استعمال کئے گئے تھے۔ میکاولی کے نزدیک صرف "طاقتور بادشاہ" کا وجود ہی اس مقصد کے حصول کا ممکن العمل ذریعہ تھا۔

تاریخ روما کے مطالعہ سے یہ بات اس پر واضح ہو چکی تھی کہ تاریخ اپنے آپ کو دُہراتی ہے، اور ہمیشہ ایک دائرہ کی شکل میں چلتی رہتی ہے۔ ارسطو نے جو دائرہ ـــــ بادشاہت، استبدادیت، عدیدیت، جمہوریت وغیرہ کا ـــــ پیش کیا تھا، میکاولی اس کا قائل تھا۔

میکاولی سے پہلے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ان میں اور ایک صدی پہلے کے لوگوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مگر تاریخ روما کے مطالعہ نے اس پر یہ روشن کر دیا تھا کہ پہلے جمہوری نظام موجود تھا، پھر اس کی جگہ استبدادیت نے لی، اور جب لوگوں کی حالت اور گر جائے گی تو ایک مضبوط ملوکیت قائم ہو جائے گی۔ اس کا خیال تھا کہ اطالیہ میں اس وقت مؤخر الذکر حالت موجود ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ میکاولی جو دل سے تو جمہوریت پسند ہے "بادشاہ" میں اشرافی فلسفہ پیش کرتا ہے۔ اپنی دوسری کتابوں میں وہ خالصۃً جمہوریت پسند ہے۔ بعض لوگ تو اس تضاد کو حقیقی کے بجائے محض سطحی سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اپنی کتاب "بادشاہ" میں بھی وہ دل سے جمہوریت پسند ہے لیکن سوال تو یہ ہے کہ یہ کتاب لورنزو سے کیوں معنون کی گئی ہے اور اس کا ہیرو کیوں سیزر بورجیا ہے؟ اس نے بحث کیوں اس طریق پر کی ہے جس سے ملوکیت کی صاف طور پر تائید ہوتی ہے؟

میکاولی کو جمہوریت پسند کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ اس کی کتاب "بادشاہ" ملوکیت کی علمبردار نہیں بلکہ ملوکیت کی پردہ دری کرتی ہے اور لوگوں کو استبدادیت سے خطرات آگاہ کرتی ہے لیکن یہ نظریہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ یہ کتاب نہ استبدادیت کے خلاف انتباہ کرتی ہے اور نہ اس کی پردہ دری کرتی ہے۔ یہ "نئی" اخلاقی بنیادوں پر قائم شخصی حاکمیت کا جواز پیش کرتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میکاولی دل سے جمہوریت پسند تھا، لیکن وہ ایک ایسا آدرش ادی تھا جسے اندرونی اور بیرونی حالات نے بدل کر . . . . اس امر کا قائل بنا دیا کہ چونکہ جمہوریت ناکام رہی ہے اس لئے یہ

ضرورتِ زمانہ کے مطابق نہیں ہے۔ وقت ایک مضبوط بادشاہ یا مستبد کا مطالبہ کر رہا تھا۔

اس کے سامنے سب سے اہم سوال ریاست کی بقا تھا اور یہ سوال عملی فلسفہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اور حالاتِ زمانہ کے مطابق اس سوال کا حل کیا معلوم کیا جاتا ہے۔ شریفانہ اور غیر شریفانہ طریقے ہر جگہ ہی اختیار کئے جاتے ہیں، اس کا خیال ہے کہ مقصد ہر قسم کے ذرائع کو جائز قرار دیتا ہے۔ بادشاہ کو بُرے اور بھلے ہر قسم کے طریقوں سے آگاہی ہونی چاہئے پروفیسر ہبرن شا اپنی کتاب "ارتقائے نظریاتِ سیاسی" میں میکاولی کے اس نظریہ کا بدیں الفاظ ذکر کرتا ہے :۔

"بادشاہ کو اپنے مقصد کے حصول کے لئے ——— یعنی اطالیہ کے اتحاد، ایک قومی فوج کے قیام، غیر ملکی حملہ آوروں کے اخراج، اور امن و خوشحالی قائم کرنے کے لئے ——— کیا ذرائع اختیار کرنے چاہئیں؟ میکاولی کا خیال ہے کہ یہ مقصد اتنا عظیم ہے کہ ذرائع غیر اہم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اگر بادشاہ اپنا مقصد اُن ذرائع سے حاصل کرے جنھیں اخلاقی سمجھا جاتا ہے تو یہ ایک اچھی بات ہے لیکن یہ اغلب ——— بلکہ تقریباً یقینی ——— ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا اس صورت میں اُسے بلا تامل وہ ذرائع اختیار کرنے چاہئیں ——— مثلاً بیرحمانہ جبر و تشدد، اور غیر محدود دغا و فریب ——— جنھیں عام طور پر منافیٔ اخلاق گردانا جاتا ہے، یہ میکاولیت کا لبّ لباب ہے۔ اس طرح سے سیاست کو اخلاقیات سے خارج کر دیا گیا۔ یہ نظریہ اس امر کا اعلان ہے کہ مقصد ہر قسم کے ذرائع کو جائز قرار دیتا ہے۔"

وہ ریاستوں کے عروج و زوال کے اسباب کا تجزیہ کرتا ہے "بادشاہ" میں وہ بادشاہتوں پر اور "مکالمات" میں جمہوریتِ روما پر تبصرہ کرتا ہے۔ وہ منافیٔ اخلاق وسائل اور طاقت پر اعتقاد رکھتا تھا، لیکن جمہوریت کا دل سے حامی تھا۔ چونکہ اطالیہ میں اُس وقت جمہوریت کا قیام ناموزوں اور ناممکن تھا، اس لئے اس نے اپنے جمہوری اعتقادات کا کہیں بھی کھُل کر اظہار نہ کیا۔

میکاولی کا فلسفہ ایک مدبرانہ نظریہ ہے، جو حالاتِ زمانہ کے مطابق بنایا گیا ہے۔ اس کے نزدیک سیاست بذاتِ خود ایک منتہا ہے۔ وہ فنِ حکومت پر بحث کرتا ہے، اس کی تمام مساعی و توجہات صرف حکومتی قوّت بڑھانے پر مرکوز ہیں۔ مذہب، اخلاق اور سماج کی اس کے نزدیک اُسی وقت اہمیّت ہے جب وہ سیاست پر اثر انداز ہوں۔ وہ بداخلاق نہیں، بلکہ اخلاق میں اعتقاد نہیں رکھتا وہ سیاست کو ہر قسم کے افکار ——— مذہبی، مجلسی، اخلاقی وغیرہ ——— سے علیحدہ کر دیتا ہے۔

اس کی تعلیمات ارسطو سے ملتی جلتی ہیں۔ اسے ریاستوں کی اچھائی یا بُرائی سے کوئی واسطہ نہیں۔ پاپائیت کی مذمت میں وہ مارزیلیو کا ہم نوا ہے۔ وہ اسے اطالیہ کی پھوٹ کا باعث سمجھتا ہے لیکن مارزیلیو اور میکاولی میں ایک اہم فرق بھی موجود ہے۔ مارزیلیو عیسائی اخلاق کو عاقبت سے وابستہ کر کے انھیں آزادی دیتا ہے، مگر میکاولی ان اخلاق کا محض اس بنا پر مخالف ہے کہ یہ دوسرے جہان سے متعلق ہیں۔ وہ ایک دُنیادار تھا، عیسائیت کی وہ مذمت کرتا ہے کیونکہ یہ انسان میں اطاعت گزاری اور انکساری کی عادات پیدا کرتی ہے۔ "مکالمات" میں وہ عیسائیت کا موازنہ پُرانے مذاہب سے کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

"ہمارے مذہب میں سب سے بڑی مسرت عجز، انکسار اور دُنیوی اشیاء سے نفرت میں مضمر ہے۔ مگر دوسرے مذاہب کا معاملہ بالکل برعکس ہے۔ وہ روحانی رفعت، جسمانی قوّت، اور انسانی توانائی کی تمام خصوصیات کو بہترین قرار دیتے ہیں...... میں سمجھتا ہوں کہ عیسائیت کے ان ہی اصولوں نے انسانوں کو کمزور کر دیا ہے۔ بدنیّت اشخاص انھیں آسانی کے ساتھ اپنا شکار بنا لیتے ہیں اور ان پر پوری طرح قابو پا لیتے ہیں۔ اور انسانوں کی اکثریت مظالم کا انتقام لینے کے بجائے انھیں خوشی کے ساتھ برداشت کرتی ہے، کیونکہ عیسائی تعلیمات میں یہی جنّت کے حصول کا طریقہ ہے۔"

میکاولی کا خیال ہے کہ ہر بدطینت شخص عیسائی اصولوں کو آلۂ کار بنا سکتا ہے اور دوسری دُنیا کے انعامات کا لالچ دیکر عوام کو لوٹ سکتا ہے وہ عوام کے مذہب و اخلاق کے سیاسی اور سماجی اثرات سے غافل نہ تھا۔ وہ حکام کو منافیٔ اخلاق وسائل کے استعمال کی اجازت تو دیتا ہے، مگر اسے اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ عوام میں پھیلی ہوئی بداخلاقی اچھی حکومت کا قیام ناممکن کر دیتی ہے۔ وہ یہ جانتا تھا کہ ریاست کی بنیاد عوام ہیں اور ان کے اخلاق و اطوار کی اہمیّت سے بھی آگاہ تھا۔ لیکن اس کا خیال ہے کہ حاکم اور محکوم کے لئے اخلاق کے دو جُدا جُدا ضابطے ہیں۔ حاکم کو اپنی قوّت بقا میں کامیاب ہونا ہے اور محکوم کو اپنی روش سے سماج کو مضبوط کرنا ہے۔

میکاولی اخلاق سے جو بے اعتنائی برتتا ہے اُسے بعض اوقات علمی بے نیازی . . . . قرار دیا جاتا ہے۔ مگر یہ خیال غلط ہے۔ اس کے سامنے صرف ایک ہی سوال تھا ـــــ سیاسی قوّت کا ـــــ اور باقی تمام مقاصد و امور کی طرف وہ توجہ ہی نہیں کرتا۔ وہ کوئی علمی انسان بھی نہ تھا، اگرچہ وہ تجربات سے اپنے اصول وضع کرتا ہے لیکن اس کی تجربیت . . . . اس لئے نہیں کہ نظریات اور عمومی اصولوں کی صداقت کو جانچے۔ وہ واقعات سے نتائج اخذ کرتا ہے۔ مگر یہ کہنا بھی غلط ہے کہ میکاولی ایک "تاریخی" طریقہ کی پیروی کرتا ہے۔ جو مثالیں اپنے نظریات کی تائید میں وہ پیش کرتا ہے وہ پُرانے زمانہ سے لی ہوئی ہوتی ہیں اپنے وضع کردہ اصولوں کو وہ تاریخ کی روشنی میں دُرست ثابت کرتا ہے۔ ایک لحاظ سے تو وہ بہت غیر تاریخی تھا، وہ واضح طور پر یہ کہتا ہے کہ انسانی فطرت ہمیشہ اور ہر جگہ ایک ہی رہی ہے، چنانچہ جہاں کہیں سے بھی اُسے اپنی تائید میں مثالیں ملتی ہیں وہ انھیں اپنے قارئین کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ اپنی سمجھ بوجھ کو کام میں لا کر واقعات کا مشاہدہ و مطالعہ کرے۔ وہ مختلف واقعات پر تبصرے کرتا ہے لیکن کوئی فلسفیانہ اصول پیش نہیں کرتا۔

۲ اس کے نزدیک انسان خود غرض ہے۔ اور طاقتور سے اپنے آپ کو ریاست کی امداد کے بغیر بچا نہیں سکتا۔ ملکیت اور زندگی کا تحفظ ضروری ہے اور یہ صرف حکومت کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ (یہی نظریہ ہابز کے اصولوں کی بنیاد ہے) اطالیہ کی حالت بدترین ہو چکی تھی اور اب اُسے ایک مضبوط حکومت کی سخت ضرورت تھی۔ جب ضروری اور ناگزیر اچھائیاں باقی نہ رہیں تو صرف مضبوط حکومت ہی امن و نظم قائم رکھ سکتی ہے۔

وہ کہتا ہے کہ انسان فطرتاً لڑاکا ہے اور اس کی اس فطرت میں توازن پیدا کرنے کے لئے ایک مضبوط حکومت ضروری ہے۔ بالفاظِ دیگر سماج میں ایک مطلق العنان ریاست ہونی چاہیے جو سیاسی اور اقتصادی طاقتوں میں توازن قائم رکھے۔

اس کا خیال ہے کہ اخلاقی اور مدنی اچھائیاں قانون سے پیدا ہوتی ہیں اس لئے زوال پذیر قوموں میں قانون ساز کی سخت ضرورت ہے۔ یہ قانون ساز سماج کی تعمیر کرتا ہے اور صرف ریاست کے انتظام و انصرام کی نگرانی نہیں کرتا بلکہ سماج کے تمام عناصر کو قابو میں لاتا ہے وہ ایک فوج بھی بنا سکتا ہے اور اقتصادی، سیاسی، اخلاقی اور مذہبی امور میں بھی دخل انداز ہو سکتا ہے۔

قانون اخلاق نافذ کر سکتا ہے اس لئے قانون ساز اخلاق سے بالاتر ہوتا ہے۔ اس کے کاموں کو جانچنے کا معیار صرف کامیابی ہے۔ وہ تشدّد استعمال کر سکتا ہے۔ فلاح و بہبود کی تخریب کیلئے نہیں بلکہ ان کی تعمیر و تخلیق کے لئے۔ میکاولی کسی درمیانی راستہ کا قائل نہیں، وہ مطلق العنان ملوکیت کا حامی ہے۔

وہ صرف دو چیزوں کا مدّاح ہے ایک تو صاحب الرّائے و باتدبیر مطلق العنان فرماں روا کا۔ دوسرے خود مختار عوام کا۔ اور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ یہ دونوں امور متضاد و متصادم ہیں۔

میکاولی کہتا ہے کہ جب تشدّد کے زور پر حکومت قائم کر لی جائے تو اس کی بقا کے لئے ضروری ہے کہ عوام سیاسی طاقت میں حصّہ دار ہوں۔ ملکیت، زندگی اور رعایا کے جائز حقوق کا تحفّظ ہو ایسی ریاستوں میں مطلق العنان فرماں روائی ہی صورتِ حال کا صحیح حل ہوتی ہے، مگر اس مطلق العنان فرماں روا کو بھی احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔

میکاولی اُس پابند قانون اور آزاد خیال حکومت کا بجا طور پر مدّاح ہے جس میں عوام بھی حکومت میں حصّہ دار ہوں، موروثی کے بجائے وہ منتخب حاکم کو ترجیح دیتا ہے۔ عمّالِ حکومت کو اپنی غلطیوں کی تلافی کا وہ قانوناً پابند کرتا ہے۔

امراء کو میکاولی اچھا نہیں جانتا وہ یہ امر اُجاگر کرتا ہے کہ نہ امراء اور بادشاہ کے مفادات میں کوئی یکسانی موجود ہے اور نہ درمیانی طبقہ اور امراء کے مفادات میں کوئی ہم آہنگی قائم ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ ایک مطلق العنان فرماں روا میں اور کوئی خوبی نہ سہی کم از کم اس کا نقطۂ نظر امراء سے وسیع تو ہوتا ہے۔

وہ پیشہ ور فوجیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے وہ کہتا ہے کہ یہ فوجی اپنے ملکی بھائیوں پر تو جبر کر سکتے ہیں مگر غیر ملکی حملہ آوروں کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ اور شاہی خزانہ کو خالی کر کے بادشاہ کو تباہ کر دیتے ہیں وہ قومی رضاکار فوج کا حامی ہے اور فرانس[1] کی سی شہری فوج کو

---

[1] سولھویں صدی کے آغاز میں فرانس میں ایک قومی محصول لگایا گیا جس سے قومی شہری فوج بنائی گئی جس نے انگریزوں کو ملک سے نکال باہر کیا۔ یہ محصول جاگیرداروں کے اختیارات میں کمی اور بادشاہ کی قوت میں اضافہ کا بھی باعث بنا۔ کیونکہ اس طرح طاقت بہت زیادہ مرتکز ہو گئی تھی اور جاگیردار اب محصول عائد کرنے کا اختیار ترک کر رہے تھے۔ اس طرح ان کی قوت میں کمی شروع ہو گئی۔

نئی کہانی

رام پرتاپ بہادر ایم۔اے

اندر اور باہر

"موکو رام سے کوئی ملا دے" یہ مصرع رامائن میں تو نہیں لیکن جس بھگتی سے اُسے گایا جا رہا تھا، وہ درد اور خصوصیت بھرت جی کے گلے میں بھی شاید نہیں رہی ہوگی جب وہ رام چندر جی کی تلاش میں جنگلوں جنگلوں بھٹکتے پھر رہے تھے۔ میں اپنے مکان کی دوسری منزل پر پاخانے میں تھا، نیچے پیچھے کی گلی سے یکایک ایک سُریلا راگ سماعت کو گھیرنے لگا، پاخانہ کی گلی میں کون مدھر اور دلکش انداز سے گا سکتا ہے، میں یہی سوچ رہا تھا، پاخانہ کی چھوٹی کوٹھری جسے میں اپنے "بورڑوا" دوستوں کے سامنے "باتھ روم" کے نام سے یاد کرتا ہوں، اسی کوٹھری بند میں چونک چونک کر ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا، کہ آخر یہ موسیقی کس طرف سے پاخانے میں آ رہی ہے، مہتر نے پاخانہ کا گملہ گھسیٹتے ہوئے زور سے پکارا ــــــ "بمبا کھولو" اب شک کی گنجائش نہیں رہی، گانا میرا مہتر ہی گا رہا تھا، اور اُسی نیچے کے سُوراخ سے آواز آ رہی تھی، گملہ کو رکھتے ہوئے اپنی جوانی کی لَے میں پھر اُس نے الاپا ــــــ "موکو رام سے کوئی مِلا دے" یوں تو مہتر لوگ گاتے اچھا ہیں، لیکن اُس کڑی میں کتنی تھرتھراہٹ تھی! موسیقی کا کوئی اُستاد بھی کیا اپنی لَے کو اس طرح کنپا سکتا تھا!! اُس گندی اندھیری گلی میں سُریلی تان میں توڑ پیدا کرنے والی کپکپی میں سردی کا بھی کافی حصہ رہا ہو یہ دوسری بات ہے لیکن "رام" کا لفظ کس صفائی کے ساتھ پاخانہ کے گملہ میں گونج کر دیوار کے سہارے سوراخ میں ہو کر اوپر آ رہا تھا، ساتھ ہی ساتھ ایک ہندو کی خودی کو چاہے وہ کتنی ہی دبی ہوئی کیوں نہ ہو چوٹ لگی، میں سوچنے لگا۔ جیسا کہ بزرگوں کا خیال ہے شاید یہی وجہ تھی جو اچھوتوں اور نیچوں کو شروع ہی سے مقدس کتابوں سے دُور رکھا گیا۔

بالٹی کے پٹکنے کی تیز آواز سے میرے کانوں کو چوٹ لگی، اور میرے خیالات کی لڑی وہیں سے ٹوٹ گئی، کان لگا کر سنا تو معلوم ہوا کہ مہتر ابھی جھاڑو لگا رہا ہے، اُس کا گانا بند ہو چکا تھا، لیکن یہ عورت کی کیسی آواز! شاید مہترانی ہے، اُسے اس محلہ میں کون نہیں جانتا، اُس کے بھولے حسین چہرے پر نہ جانے کتنی بار میری نگاہیں اٹک کر رہ گئی تھیں، کس انداز سے وہ کپڑے سے کمر کس کر تتلی کر لیتی تھی، اور ہاتھ میں جھاڑو اور بالٹی لئے سڑک پر حُسن اور بدبو کی ایک لہر پھیلاتی گزر جاتی ہے، اکثر اس کو دیکھ کر میں نے لوگوں کو کہتے سُنا ہے، بڑے شہروں کی مہترانیاں بھی خوبصورت ہوتی ہیں اس کی جوانی کی آنکھیں ہمیشہ کوئی گمنام راگ الاپنے میں مسرور رہتی تھیں، پچھلے سال اس کمبخت مہتر پر مجھے کتنا غصہ آیا جب اُس نے اپنی بی بی کو بے قصور ہی گھر سے نکال دیا، لیکن کسی چیز کو چھوڑنا اور پھر اُسے اپنا لینا بھی ایسے طبقہ کے لوگوں کو آتا ہے، مہترانی مہتر سے کچھ کہہ رہی تھی، میں کان لگا کر سُننے لگا "کیوں آج گا یا ہی جائیگا یا کھانے پینے کی بھی کچھ فکر ہے؟ کیوں رے آج تو بقرا عید ہے نا آج بھی تجھے وہی دھن لگی ہے، مُسلمان ججمانوں کے ہاں سے بکروں کے سِرے اور پائے ملیں گے جم کر کھایا جائے گا" مہتر اپنے لاپرواہ لہجہ میں اور کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن اس کی بات کٹ گئی "اور کو دلو دوسروں کی بھیک کے آسرے پر، چُپ کیوں ہو گئے؟ مُنہ میں پانی بھر آیا کیا؟ ......" مہترانی نہ معلوم کیا کیا بکتی رہی لیکن پاخانہ کی گلی میں مہتر کے مُنہ میں پانی بھر آنے کی بات سُنکر مجھے متلی آنے لگی، مہتر نے گھُڑک کر کہا ــــــ "میں نے کہہ تو دیا کسی کے ہاں سے کچھ ملے چاہے نہ ملے لیکن وہ اٹھنی خرچ نہیں ہوگی..... چاول چاول رٹ لگائے ہے...... اگر بابو جی نے دیر کر کے مہینہ نہ دیا ہوتا تو........ پیسے رکھے رہن دے شام کو کام پڑے گا" مہترانی نے مہتر کو جھڑک دیا ــــــ "ہاں وہ تو ہم جانت ہیں نا۔ مُنوا حرامی کے ساتھ پیسے جوڑ کر ادّھا جو منگایا جائیگا .... اچھا آج دیکھت ہوں منّو کیسے میرے گھر پھٹکتے ہیں۔ ......" بڑبڑاتی ہوئی مہترانی گلی کے باہر نکل گئی۔

قریب ایک مہینہ سے لگاتار بدلی ہو رہی تھی، جاڑے کی بدلی ہوتی بھی ہے تکلیف دہ! اس سے کسی کو بھی تو مسرت حاصل نہیں ہوتی، پرندے جانور غریب دُکھیوں کے لئے تو اصل میں جاڑے

کا موسم ہونا ہی نہیں چاہیئے تھا، اس موسم میں جمہوری مادّہ تو ہے ہی نہیں، اور پھر اس کی بدلی اور بوندا باندی تو ہڈیوں تک کو ہلا دیتی ہے غریب غربا تو الگ متموّل طبقہ والوں سے بھی اس کی اداسی سہی نہیں جاتی، نوجوانوں کیلئے تو یہ دوزخی ایذا کا باعث ہو جاتا ہے۔

ایسے موسم میں میرا دن اس طرح شروع ہوا، اور کرتا ہی کیا، چُپ چاپ کمرے میں آکر بیٹھ گیا، بار بار وہی مصرع "موکو رام سے کوئی ملا دے" کانوں میں گونجنے لگتا تھا، مہتر صرف گانے کو ہی گا رہا تھا یا اُسے اُس سے کسی قسم کی روحانی مسرّت بھی حاصل تھی، آخر وہ التجا کس "رام" سے ملنے کی تھی؟ پاخانہ صاف کرتے وقت بھی کس جذبہ کے ماتحت وہ رام کی رٹ لگائے ہوئے تھا؟ کون "رام" اس کے "رام" ہو سکتے ہیں؟ وہ تو پیدائش سے موت کی آخری ہچکی تک غلاظلت ہی صاف کرنے کیلئے بنا ہے، اُس کے آباؤ اجداد یہی کرتے آئے ہیں، اور آگے بھی اُسے پُشت در پُشت یہی کرنا ہوگا، یہ بھی نہیں کہ مہتر اس بات سے واقف نہیں، بلکہ وہ جس لاپرواہی سے زندگی کے مسائل کو برتتا ہے وہ اس کی جانکاری کا ثبوت ہے، وہ نہ کسی کا احسان مانتا ہے اور نہ کبھی بھولے سے بھی یہ سوچتا ہے کہ اُس کی روزی کوئی اُس سے چھین بھی سکتا ہے۔ جو کماتا ہے کھا پی ڈالتا ہے، مستی سے گھومتا ہے، لنگوٹا کستا اور کشتی لڑتا ہے، شراب پیتا اور شہنائی بجاتا ہے، جس سے چاہتا ہے شادی یا زِنا کرتا ہے، پاخانے اور موریاں صاف کر کے زندگی گزار دیتا ہے بے روزگاری کا اُسے خطرہ نہیں، مشینیں اُس کی روزی چھین نہیں سکتیں، بلکہ اُس کا کام بڑھتے ہوئے شہروں اور قصبوں کے ساتھ بڑھتا ہی جاتا ہے، غریبی کی اُسے پرواہ نہیں کیونکہ شاید وہ یہ سوچتا ہے کہ غریبی بھی اس سے زیادہ غریب نہیں ہو سکتی، بلکہ یوں کہئے کہ اُس کے خیال میں غریبی اُس کے لئے اور وہ غریبی کے لئے پیدا ہوا ہے۔

جیسے میں آہستہ آہستہ اس کی زندگی سے رشک کرنے لگا ہوں، مہتر کی زندگی بھی آخر کتنی اطمینان اور بے فکری کی ہے دُنیا کی غلاظلت صاف کرے گا، دوسروں کے ٹکڑے کھائے گا اور مر جائے گا ایک دن، یہ سوچتے سوچتے کہ اس کی زندگی کتنی کارآمد اور آئیڈیل ہے، میں اپنے خیالات کی بھول بھلیوں میں معلوم نہیں کب کھو گیا، معلوم نہیں پھر ذہن میں کیا کیا آیا اور میں سوچتا سوچتا کہاں سے کہاں پہونچ گیا، پھر دیکھتا ہوں کہ خلا میں ایک ہاتھ میں جھاڑو اور دوسرے میں بالٹی لئے کھڑا ہوں، ایک دم چونک پڑا، گھبرا کر کمرے میں چاروں طرف دیکھا، کوئی اور تو نہیں مہتر کے تصوّر سے چھوٹنے کے لئے پھر میں نے کیا کیا کوشش نہیں کی، اُس سے کراہت سی ہونے لگی، اپنے چاروں طرف مجھے گندگی کا احساس پیدا ہو گیا، تو کیا اِن مہتروں کا بھلا ہو ہی نہیں سکتا، یہ ترقی کا زمانہ ہے ہر چیز آگے بڑھنے کی کوشش میں مصروف ہے، کیا یہ کمبخت مہتر ہی آگے نہیں بڑھ سکتا، ایک خیال آیا، آخر ان مہتروں، بھنگیوں، اور ڈوموں کے اُدّھار کی بھی تو بات چلی تھی، کافی شور و غل ہوا، بڑی بڑی باتیں ہوئیں، دھن والوں نے ان کی خاطر دھن کی تھیلیاں کھول دیں، ملک کے نیتاؤں اور سماج کے خادموں نے بڑے بھَے رونے روئے، جنکو کھانے کی کمی نہیں وہ انھیں کے واسطے فاقے کرنے پر آگئے، زمانے کی سب سے بڑی شخصیت ان کی خاطر مر مٹنے کو تیار ہو گئی، ان کا ایک پاکیزہ نام بھی رکھا گیا، اِن "ہریجنوں" کو تسکین دینے کے لئے کہ ان کا پیشہ اتنا خراب نہیں بڑے بڑے لوگ جھاڑو اور ٹوکریاں لیکر سڑکوں پر نکل پڑے، آخر ان کنگالوں کی اندھیری بستیوں میں بھی اُمید کی ایک ہلکی شعاع نظر آئی، سماج نے انھیں ڈھارس بندھائی، وہ لوگ بھی ان کے ساتھ آئے جو دُنیا کا بھلا ہڑتالوں سے کرنا چاہتے ہیں، مہتروں نے بھی ہڑتالیں کیں، اپنے روزی رسانوں کو لال پیلی آنکھیں دکھا کر اکثر ان لوگوں نے اپنی مزدوری بھی بڑھالی، اور سب سے بڑا فائدہ جو ان کا ہوا وہ یہ تھا کہ ان پر پہلے پہل یہ راز فاش ہوا کہ چاہنے پر ایک دن سماج کو آگے بڑھنے سے وہ روک سکتے ہیں۔ ۳۹

میرے کانوں میں پھر وہی مصرع گونجنے لگا ——

"موکو رام سے کوئی ملا دے"۔ پھر پاخانہ کی گلی یاد آئی، وہی جھاڑو بالٹی اور گملہ۔ میں نے سوچنا چاہا، آخر ہوگا کیا؟ ان کا کیا کوئی مستقبل نہیں؟ کون ہیں اِن کے "رام" جن کے لئے مہتر بیتاب تھا؟ لیکن مجھے کچھ نظر نہیں آیا، بلکہ تاریکی بڑھتی گئی، منحوس بدلی اور گہری ہو گئی تھی۔ ناقابل برداشت دماغی ہیجان کی حالت میں سوچتا رہا، کیا کسی طرح سے ان کے ہاتھ سے جھاڑو اور بالٹی نہیں چھینی جا سکتی! آج بقرا عید مُسلمانوں کا تیوہار ہے، یہی ایک ایسا تیوہار ہے جبکہ میں ان کا پورے طور سے ساتھ دیتا ہوں، لیکن اس بدلی اور مہتر نے اس طرح

میرا دن بگاڑا کہ کچھ کہتے نہیں بنتا

کافی رات گئے میں دعوت سے لوٹا، محلّہ میں کچھ غیر معمولی سنّاٹا چھایا ہوا تھا، جیسے لوگ آج وقت سے پہلے ہی اپنے چراغ گل کر کے سو گئے، دیر سے لوٹنے پر بی بی ناراض نہ ہوں، اس خیال سے ڈرتا ڈرتا مکان میں داخل ہوا، پھٹکار تو نہیں پڑی بلکہ اُس کے عوض میں سب کی پریشانیاں مجھے دیکھ کر کم ہونے لگیں، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مہتر کے ہاں نالے پر کہرام مچا ہوا ہے، دن ڈوبتے ہی مہترانی مُسلمان ججمانوں کے ہاں چلی گئی، گھر پر مہتر اور مُنوا محفل گرم کئے بیٹھے تھے، دوسروں اور کچھ بھنی ہوئی ہڈیوں پر شراب کا اَدھا ختم ہو کر زمین پر لڑھک گیا تھا، اب دوسری ... بوتل سے دَور چل رہا تھا، نشہ خوب جمنے لگا تھا، اندھیرے برآمدے میں وہ اپنی محفل روشن کئے بیٹھے تھے۔

مہتر نے کُلّڑ خالی کرتے ہوئے کہا ــــ "مار ڈالا" اور مُنہ بگاڑ کر جھومتا ہوا بکرے کا سر اُٹھا کر دانتوں سے نوچنے لگا، مُنوا نے ہڈی چوستے ہوئے پوچھا ــــ "کس رے متیا سار تو رمیہریا کہاں گئی؟" "کہوں ججمانی گے ہوئی" مُنوا جھومنے لگا جیسے کچھ سوچنے کی کوشش کر رہا ہو ــــ "ہر وقت سسوری جھمنٹے میں رہت تھی۔ ہمار میہریا ہوت تو ہم مار ی ڈالی" متیا نے ایک نلی توڑتے ہوئے کہا ــــ "ارے سرؤ نیک ہاے جو ناہیں ہاے، ناہیں تو تو نہکا تو یہاں بیٹھے ناہیں دیت" منوا کی آنکھوں میں شرارت تھی ــــ "ہمکا یہاں بیٹھے دیت چاہے نا دیت لیکن سرؤ تو نہکا تو یہاں بیٹھا کے عجیجوا کے یہاں گُلچھرّا اُڑاوت تھی" متیا جیسے نیند سے جاگا "کس لے کون عجیجوا؟ تنی پھر سے اُوکر نوّا لے تو" دوسرے بکرے کا سر منوا کے ہاتھ میں تھا ــــ "سرؤ تو ہونکا کوئی مرد کہی۔ ہم تو روج اوکا عجیجوے کے گھر واں دیکھت ہیں" متیا نے ایک کُلّھڑ کس کے پی لیا، اور آنکھوں کی پُتلیاں اندھیرے میں گُھما کر ذرا رازدارانہ لہجہ میں بولا ــــ "کس رے سچ کہت ہے؟" اپنی بی بی کو بھدّی گالی دیکر ــــ "اچھا تنی چلا چل تو اتنی دکھت عجیجوا کا گھر وا تو دکھا دے پھر اوکا ہم سمجھ لیب" یہ کہتے ہوئے وہ جھپٹ کر اندر گیا اور دو لاٹھیاں نکال لایا، ایک لاٹھی مُنوا کو پکڑا کر اپنی لنگی کا پھینٹ کستے ہوئے برآمدے سے نیچے لپکا اور پھر اندھیرے میں دونوں غائب ہو گئے۔

ادھر ٹھمر کے عزیز میاں آبکاری محکمہ کے معمولی ملازم تھے، بی بی اُن کی ایک زمانہ ہوا مر چکی تھیں، آج تیوہار کے دن دُھلا انگا پاجامہ پہنکر ایک بوتل شراب کیساتھ وہ بھی اپنے طریقہ پر کی یاد تازہ کر رہے تھے، پیچھے گلی میں شور و غل سُنکر مہترانی کو تو انھوں نے باہر نکال دیا، خود نشہ کی حالت میں لڑکھڑاتے ہوئے دروازہ پر پہنچے، مہتر کو دیکھ کر اُن کا نشہ اور تیز ہو گیا، ہاتھ اُٹھا کر اُنگلی سے اشارہ کرتے ہوئے، پوری طاقت لگا کر وہ چلّا کر بولے "کیوں بے سالے تو یہاں کہاں؟ بھاگ جا ابھی یہاں سے" لڑکھڑاتی ہوئی آواز سے متیا کے اوسان خطا کر گئے اُس کا نشہ جیسے اُترنے لگا۔ اتنے میں مُنوا گلی میں سے مہترانی کا ہاتھ پکڑے دوسرے ہاتھ میں لاٹھی لئے سامنے آنکلا، عزیز میاں کی گالی سُنکر متیا تلملا کر رہ گیا تھا، مہترانی کو دیکھتے ہی پاگل ہو گیا، بڑھ کر جو اس نے لاٹھی ماری تو عزیز میاں زمین پر آرہے، مُنوا نے بڑھ کر اسکی لاٹھی چھین لی، مہترانی رفو چکّر ہو چکی تھی۔

خبر کو پھیلتے دیر نہیں لگی، سارے محلّہ میں سنسنی پھیل گئی، ایک مسلمان کا ہندو کے ہاں مارا جانا یوں ہی کیا کم تھا! اور پھر بقر عید کے دن!! ذرا سی دیر میں آگ لگ گئی، ہندوؤں نے دروازے بند کر لئے، مُسلمان پنشن یافتہ پیشکار صاحب کے دروازہ پر صلاح و مشورے کیواسطے اکٹھا ہو گئے، پولیس موقع پر پہنچ گئی، پولیس کا اب ایسا دبدبہ ہے کہ جو پہلے پولیس کو کچھ بھی نہیں سمجھتے تھے وہ بھی اب اس کے نام سے ڈرتے ہیں، بات بڑھنے نہیں پائی، بڑے بوڑھوں نے رائے دی کہ معاملہ عدالت پر ہی چھوڑ دیا جائے۔

صبح کو پولیس نے مہتر کے گھر کی تلاشی لی، بغیر لیبل کے شراب کی خالی بوتلیں ملیں، عزیز میاں کے گھر کی بھی تلاشی لینی پڑی، ایک وارنٹ کے ماتحت عزیز میاں گرفتار ہو گئے، متیا اور عزیز میاں کی غیر موجودگی میں محلّہ کی سنسنی ختم ہو گئی۔

آج جب میری نظر اپنے برآمدے میں نیم بورڈ پر پڑی، تو "اِن" اور "آؤٹ" پر آنکھیں ٹھہر گئیں، مہتر کا خیال آیا، میں نے اُس کا "آؤٹ" یعنی گلی میں صفائی کرنا اور "اِن" یعنی برآمدے میں بیٹھ کر شراب پینا دونوں دیکھا تھا۔ سوچنے لگا کیا ابتک کوئی ایسا نہ ہوا جو اُس کا "اِن" اور "آؤٹ" دونوں بیک وقت مٹا دے۔

م۔ش۔ حقی

آتش و آہن

(مختصر، مختصر سا افسانہ)

"یہ حسن خداداد کے غاصب۔ یہ دولت کے سانپ۔ یہ مقدّر کے چہیتے!" وہ بھی ایک زمانہ تھا کہ میں حسین عورتوں کے شوہروں کو دیکھ کر دانت پیسا کرتا تھا۔

"ثریا، اجمل۔ اجمل ثریا ــــ اور میں؟ میں بھی تو اُسی لڑکی کو چاہتا ہوں؟" ان دونوں کی باہمی محبت، پروانہ وار محبت کو دیکھ کر میں دل ہی دل میں خاکستر ہوتا۔ اجمل تو نہیں مگر ثریا میرے دل کی تپش سے واقف تھی۔ میں نے کئی دفعہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے دل پر رکھ لیا تھا، میں اکثر اُس سے شرارت کرتا تھا۔ جیسے کوئی لوہے کی لاٹھ کو پکڑ کر شغلاً ہلا کر دیکھے، اس یقین واثق کے ساتھ کہ یہ ہرگز جنبش نہ کرے گی، آہ کسے معلوم کہ میں اسی آہنی صورت کا پجاری تھا۔ مجھے اسکی صلابت کو بار بار محسوس کر کے دیکھنے میں لطف آتا تھا۔ میں اپنے دل کے اندرونی داغ پر یہ نشتر اکثر چبھویا کرتا تھا۔

ثریا رات گئے تک میرے پاس بیٹھی رہی۔ اجمل کی جدائی میں وہ اکثر مجھ سے باتیں کر کے اپنا دل بہلاتی تھی اور میرے اوٹ پٹانگ فلسفے کو سُن سُن کر ہنسا کرتی تھی۔ اُس کی نظر میں شاید میں ایک معصوم آدمی تھا اور یقیناً کچھ وارفتہ بھی۔

"بیکار ہے یہ سب بیکار ہے" میں نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا "اس بگڑی ہوئی دُنیا میں ایک ہمیں کو درست رہنا لازم ہے؟ اس کج رفتار عالم میں کیا ہمارے ہی لئے راست روی رہ گئی ہے؟ اور بگڑنے دو اسے اور تباہ ہونے دو۔ یہ سماج ہرگز اس قابل نہیں کہ اسکے اصولوں کا احترام کیا جائے!" میں جانے کیا کیا بکتا رہا۔

وہ بیٹھی ہوئی مسکراتی رہی۔

"اُف یہ دروازہ تو کھلتا ہی نہیں" اُس نے امداد کے لئے میری طرف مسکرا کر دیکھا۔

"تو اسے بند ہی رہنے دو ــــ کیا ضرورت ہے"

"لو اور سُنو! میں بھی کوئی ارواح ہوں کہ شیشے میں سے پار ہو جاؤں گی!"

میں نے ہاتھ بڑھا کر دروازے کا لٹّو گھمایا۔ آج پہلی بار وہ مجھے شب بخیر کہنا بھول گئی۔

"اجمل کا خط ہفتہ بھر سے نہیں آیا۔ میرا دل سخت پریشان ہے" ثریا افسردہ سی میرے کمرے میں داخل ہوئی۔

۱۴۱ "کلکتہ میں ہیں خدا جانے کس رنگ میں ہونگے" میں نے جواباً چٹکی سی لی۔ اور پھر اپنا فلسفہ چھیڑ کر اُس کا دھیان بٹا دیا "انسان۔ فطرت۔ سماج۔ ظلم۔ بغاوت!"

وہ معمول سے زیادہ سنجیدہ بنی بیٹھی رہی۔ مگر آج میری بغاوت کی رگ بُری طرح پھڑک رہی تھی۔

وہ چلی۔ میں نے روکا۔ اُس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا "دروازہ کھول دو"

"کیا دروازہ ضرور کھُلنا چاہیے؟" "یقیناً" اُس نے زور دیکر کہا۔ میری معصوم روح ایک عظیم الشان بغاوت کے لئے بیتاب تھی مجھے سودا تھا لوہے کی دیوار سے سر ٹکرانے کا۔ آج میں اپنے حریف سے ٹکرا کر فنا ہو جانے کیلئے تیار تھا۔

"ثریا تم باعصمت ہو، باوفا ہو۔ شاید اجمل سے بھی زیادہ۔ آہ ثریا میں بے حد کم نصیب ہوں۔ میری محرومی پر ترس کھاؤ۔ اپنی اپنی عشرت آگیں زندگی میں سے چند لمحے مجھے چھین لینے دوگی تو تمہارے براق دامن پر کونسی کجلاہٹ آ جائے گی ــــ ثریا!"

آنے والی مدافعت کا اندازہ کر کے میری تمام قوتیں مجتمع ہو گئی تھیں میں نے اُسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔

دیکھو دیکھو۔ میں بہت دن سے دیکھتی ہوں۔ ایسی باتیں زیبا نہیں۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے ـــــ میرے الڑ، مجھے چھوڑدو۔ چھوڑ بھی دو۔"

میرے بازوؤں کی گرفت اور مضبوط ہوگئی۔ میرے ہونٹ اُس کے دہکتے ہوئے رخسار سے جا ملے۔ میرا کیفِ بغاوت اپنے شباب پر تھا۔

بالآخر وہ بولی۔ "اچھا ایک بات کی قسم کھاؤ۔"

میرا دورانِ خون کئی درجے دھیما ہوگیا۔

"مرتے دم تک راز رکھوگے!"

میرے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑگئی۔ میرا سر اُس کے رخسار کے برابر جھک گیا۔ میری تمام مجتمع قوت اپنے زور میں آپ پسپا ہوگئی۔ میں نے اُسے حسرت و مایوسی کے عالم میں چھوڑ دیا۔

وہ چلی گئی۔

سوچتا ہوں کیا واقعی میری نفسیاتی گہرائیوں سے واقف ہوگی؟!

محمد صدیق ایم۔ اے

ایک خط

...... خوش رہو۔

گو تم نے وعدہ کیا تھا کہ اپنی اوّلین فرصت میں تم مجھے خط لکھوگی لیکن آج چھ دن ہو گئے اور میں ابتک چشم براہ ہوں۔ کیا بھول گئیں؟

اب کی بار دہلی کا قیام میرے لئے ایک نیا باب ہے جس کی ابتدا تمہارے نام سے ہوتی ہے۔

...... یہ تمہیں معلوم ہے کہ میں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ میری فطرت کے وہ نازک اور کمزور پہلو تم لوگوں کے سامنے نہ آنے پائیں جنکی معمولی سی خراش بھی میرے دماغی سکون کو برباد کر دینے کے لئے کافی ہے۔ میں نے حُسن کی مسلسل تنقیص کو اپنا شعار بنایا اور ان محفلوں سے ہمیشہ احتراز کیا جہاں بات بنائے نہ بنے!

تم سے قبل ایک اور ناوک فگن نے مجھے اپنا شکار بنانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے بچنے کی ہر ممکن تدبیر کی لیکن زمانہ کی ستم ظریفی کو کیا کہئے کہ ہر تدبیر اُلٹی ثابت ہوئی۔ اسے میں نے اپنی فطرت کے اتنے گھناؤنے پہلو دکھائے تھے کہ اگر معمولی دل و دماغ کا آدمی ہوتا تو نفرت کئے بغیر نہ رہتا۔ لیکن تم شاید سمجھ سکو کہ بعض اوقات زندہ رہنے کی یہ کوششیں خود کتنی مہلک نکلتی ہیں ـــــ طبیعت کی پراگندگی پر کہا گیا کہ "یہ ناتجربہ کاری ہے۔" ذاتی بداخلاقیوں کی طرف اشارہ کیا تو فرمایا کہ "خیر یہ تو سب ہی کرتے ہیں۔" کیرکٹر کی خرابیاں پیش کیں تو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "اچھا اب زیادہ انکساری نہ کیجئے۔" اور پھر اس پر بھی جب اصرارِ اجتناب حد سے آگے بڑھا تو یہ کہکر کہ "اونہہ۔ ہوگا.. آپ کو کیا! آپ بُرے ہیں تو غیروں کیلئے۔ میں تو آپ کو اپنے لئے اچھّا بنالوں گی۔" مجھے ایک ایسی دماغی اُلجھن میں مبتلا کر دیا گیا کہ جس سے آج تین برس کے بعد بھی چھٹکارا نصیب نہیں۔

...... تمہیں بتاؤ کہ کیا یہ فطرت کا انتقام نہیں؟ کیا میری ہی سپر سے تلوار کا کام نہیں لیا گیا؟

اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی

میں نے دہلی کا قیام ترک کیا اور الہ آباد بھاگ آیا کہ شاید جگہ کی تبدیلی زندگی کو پھر پُرانے ڈھرّے پر لگادے اور میں اسی اطمینان سے واقعات کی لہروں میں بہنے لگوں جس پر کبھی اپنے دوستوں کے سامنے میں فخر کیا کرتا تھا ـــــ مگر توبہ کیجئے۔ بھلا کھوئی ہوئی چیز اور کھوئی ہوئی بھی نہیں بلکہ چھینی ہوئی چیز کہیں واپس ملتی ہے؟

کتابیں اُلٹیں، مضمون لکھے، آگرہ، دہلی، کلکتہ، مدراس اور نہ معلوم کہاں کہاں کے سفر کئے، دوستوں سے مباحثے کئے، سیاست میں حصّہ لیا، جلسوں میں تقریریں کیں اور جو کچھ ہو سکتا تھا سب کیا مگر ہر جگہ اور ہر حالت میں یہ محسوس ہوا کہ جیسے

ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

چونکہ عمر کا بیشتر حصّہ بورڈنگ میں گزرا ہے، مختلف قسم کے احباب سے صحبت رہی ہے اور طبیعت کے فطری رُجحان کی بدولت بڑا وقت

اپنے اور دوسروں کے نفسیاتی مطالعہ میں گزار ہے۔ اس لئے اس کیفیت کو سمجھنے میں زیادہ کاوش نہیں کرنا پڑی۔ اور ہمیشہ یہ محسوس ہوتا رہا کہ میں اپنے آپ کو ایک مسلسل دھوکا دے رہا ہوں ایک گھرا فریب ـــ لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں ہر مرتبہ یہ فریب کھل گیا اور میں چوروں کی طرح اپنی بے مائیگی پر افسوس کرتا ہوا پکڑا گیا۔

میں بیٹھا پڑھ رہا ہوں۔ کتاب بہت عمدہ ہے۔ مضمون کی سنجیدگی۔ اندازِ بیان کی لطافت توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ بارہ پندرہ صفحے ختم کر چکا ہوں کہ چند منٹ کے بعد ایسا معلوم ہوا جیسے بڑی دیر سے کسی نے دماغ کے دروازے بند کر رکھے ہیں۔ جو کچھ پڑھ رہا تھا وہ نہ معلوم کہاں غائب ہو گیا۔ نہ ہاتھ میں کتاب یاد رہی اور نہ کتاب پر سطریں دکھائی دیں۔ ایسا محسوس ہوا جیسے ہلکا ہلکا کہرہ بڑی دیر سے چھا رہا تھا لیکن ہم محسوس نہیں کر رہے تھے۔ جھنجھلا کر چند صفحے اُلٹے اور پھر سے پڑھنا شروع کیا۔

ایک سطر ـــ دو سطر ـــ تین سطر ـــ آج شریف صاحب کا اخبار نہیں آیا ـــ ڈاکیہ دکھائی تو دیا تھا ـــ کوئی خط بھی نہیں آیا۔ معلوم نہیں امی کیسی ہیں۔ ان کا خط تو کئی دن سے نہیں آیا ـــ یہ لوگ خط کیوں نہیں لکھتے ـــ چار ہفتے ہوئے ایک خط آیا تھا۔ اس میں الائچی کے دانے اور یہ جملہ کہ "آپ کو الائچی بہت پسند ہے نا؟ کھائیے" ـــ دو دانے کھائے اور باقی اسی لفافے میں رکھے ہیں ـــ لفافہ بکس کے اندرونی خانہ میں ہے ـــ دیکھوں؟ ـــ ٹھہرو ـــ اچھا پہلے کمرے کے دروازے بند کر لوں ـــ اوہو! اس میں اتنے خط جمع ہو گئے ـــ اور چوڑی کے ٹکڑے ـــ الائچی کے چند دانے ـــ دو نچے ہوئے کاغذ کے ٹکڑے جن پر کچھ لکھا ہوا ـــ ایک خط بے القاب کا ـــ

"مجھے معلوم ہوا کہ آپ کی طرف سے کوشش ہو رہی ہے۔ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آپ اپنی مرضی سے ایسا کر رہے ہیں۔ اس میں میری بڑی بدنامی ہے۔ اگر چھوٹی نانی یا ممانی جان کوشش کرتیں تو کوئی بات نہ تھی لیکن اب آپ خدا کیلئے اپنے دل کو سنبھالئے۔ میں تو دیکھئے آپ سے زیادہ مجبور ہوں مگر پھر بھی اپنے دل کو کیسا تھامے ہوئے ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ اس خط سے آپ کو بڑی تکلیف ہو گی لیکن آپ کی محبت سے اُمید ہے کہ آپ مجھے درگزر کرینگے۔ آپ کو دُنیا میں بڑے بڑے کام کرنا ہیں۔ مجھ سے لاکھ درجہ بہتر آپ کو مل جائیں گی میں تو خیر! جیسے تیسے گزار لوں گی۔ آپ اپنی حالت کو درست کیجئے اور پڑھنے میں دل لگائیے۔ دوا خدا کیلئے پیتے رہئیے گا۔ آپ گھر خط لکھ دیجئے جیسے آپ ٹال رہے ہیں اور ابھی نہیں کرنا چاہتے۔ میں نہ معلوم کتنی کوشش کے بعد آپ کو یہ خط لکھ رہی ہوں۔ کیا کروں۔ زمانہ کے ہاتھوں سے مجبور ہوں۔"

چار دفعہ یہ خط پڑھنے کے بعد یہ شعر خود بخود زباں پر رواں ہو گیا۔

ادھر سے بھی ہے سوا کچھ اُدھر کی مجبوری
کہ ہم نے آہ تو کی اُن سے آہ بھی نہ ہوئی

لاحول ولا قوۃ۔ میں تو بھول چکا تھا پھر یہ ہنگامہ کیوں؟ ارے توبہ میں رو رہا ہوں؟ یہ کیا مذاق ہے۔ اونہہ! یہ خطوط جلا کیوں نہ ڈالوں۔ نہ رہے بانس، نہ بجے بانسری! مگر جلانے سے کیا فائدہ۔ پڑا رہنے دو کبھی یادگار ہی کے طور پر کام دینگے۔ ہٹاؤ بکس میں بند کئے دیتا ہوں اور اب نہیں کھولوں گا ـــ اور نہ دماغ میں ان کا خیال آنے دونگا۔

۴۳ ـــ چلو گھوما جائے ـــ

"ضیا صاحب۔ ارے ضیا صاحب۔ آپ کو دُنیا میں سوائے پڑھنے کے اور بھی کوئی کام آتا ہے۔" میں نے ان کے کمرے کے دروازے زور سے جو کھولے تو شاید انہیں ناگوار ہوا۔ بہت خفا! فرمانے لگے "..... صاحب آپ کو تو امتحان دینا ہے نہیں پھر دوسروں کو کیوں پریشان کرتے ہیں۔"

"جی ہاں۔ مجھے بھی امتحان دینا ہے ـــ مگر ذرا دیکھئے چاندنی کیسی چھٹکی ہوئی ہے۔ آئیے گھوم آئیں ـــ چائے نہیں پیجئے گا؟ چلئے مُلّاجی کے ہاں آپ کو چائے پلا لائیں ـــ دروازہ میں تالا ڈال دیجئے ـــ

شام کا رنگیں سماں اور تیرے ہاتھوں میں کتاب
ہو نہیں سکتا تیری اس بد مذاقی کا جواب

ضیا صاحب بولے "حضرت یہ شام ہے کہ آدھی رات؟"
ہاں! ہاں! بھئی آدھی رات ہی سہی۔ مگر اب چلئے ـــ

چاندنی رات میں جب پھول کھلا کرتے ہیں
اور بڑھ جاتا ہے سودا تیرے سودائی کا

ضیا صاحب آج جگر کا ایک شعر بہت یاد آرہا ہے - اگرچہ گاتے گاتے فرسودہ ہو چکا ہے مگر پھر بھی دوسرے مصرع کی فتنہ سامانی تو جاتی ہی نہیں -

آکہ تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی نہ - نا - نا - نا - نہ - نا
نا نہ نا - نا نہ نا ...... پاتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں —

ضیا صاحب کورس ختم کرلیا آپ نے؟ کیوں؟ آپ تو نہ معلوم کب سے کتابیں دبائے بیٹھے ہیں اور اب بھی کورس نہیں ختم ہوا؟ — میں نے بھی آج طے کرلیا ہے کہ امتحان کی تیاری باقاعدہ شروع کردوں — نہیں مذاق نہیں واقعی اب پڑھنے کا ارادہ ہے - بھئی قصّہ یہ ہے کہ امتحان کے معاملے میں میں ذرا فراغ دل واقع ہوا ہوں - جو کچھ دماغ میں سماتا ہے وہ یاد کر لیتا ہوں - اور جو رہ جاتا ہے وہ کاغذ کے ٹکڑوں پر اور دوات کے لیبل پر لکھ لیتا ہوں - یہ سب امتحان گاہ میں کام دیتا ہے - اور ضیا صاحب میرے نزدیک تو یہ سب جائز ہے - میرے ایک اُستاد کا قول ہے کہ "چوری ضرور کرو لیکن پکڑے نہ جاؤ" اور جناب ہے بھی یہی - امتحان نام ہے ممتحن کو بے وقوف بنانے کا — جو زیادہ سلیقے سے بیوقوف بنائیگا وہ زیادہ نمبر پائے گا — اب آپ دیکھئے کہ میں اپنے درجہ میں ہمیشہ اوّل آتا ہوں — کیوں؟ — بات یہ ہے کہ مجھے امتحان دینے کا راز معلوم ہے — مگر ضیا صاحب اس سال اگر میں پاس نہ ہوں تو کیسا رہے؟ ہر سال تو پاس ہو جاتا ہوں - اب کی مرتبہ فیل ہو کر بھی تو دیکھوں کہ کیا معلوم ہوتا ہے — اجی نہیں گھر پر کسی کو فکر بھی نہیں ہے کہ میں پاس ہوتا ہوں یا فیل — میری کامیابی ہی پر کس کو خوشی ہوتی ہے جو ناکامی پر کوئی افسوس کریگا — دُنیا تو ناکامیوں کا نام ہی ہے اور پھر میں تو یوں بھی حد درجہ بدقسمت واقع ہوا ہوں - اگر سونے میں ہاتھ لگا دوں تو مٹی ہو جائے — میں نے اسی لئے کبھی کسی سے محبت نہیں کی - نہیں معلوم کیا افتاد اس غریب پر آن پڑے — زندگی نام ہے مَر مَر کے جئے جانے کا - ہا ہا ہا — ارے بھئی یہ ہنسی کی بات تو نہیں ہے — ضیا صاحب کبھی زاہد صاحب سے ملے ہیں آپ؟ آدمی بہت دلچسپ ہے - آج مجھ سے تجزیہ نفسیاتی پر گفتگو ہو رہی تھی کچھ محبت کا ذکر چھڑ گیا - آپ بہت مقدّس انداز میں بولے کہ "عورت یا تو کسی سے محبت کرتی نہیں اور اگر کرتی ہے تو صرف ایک مرتبہ!

اور اس پر طرہ یہ کہ "مرد اسکی محبت سے ہمیشہ ناجائز فائدہ اُٹھاتا ہے پہلے تو اُسے محبت پر مجبور کرتا ہے اور پھر اس سے کھلونے کی طرح کھیلتا ہے" میں نے کہا "میاں کیا حماقت کی بات کرتے ہو؟ عورت ہمیشہ مرد کو اُنگلیوں پر نچاتی ہے - ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ مرد اپنی طرف سے محبت کا اظہار کرے - ابتدائے اعلان کا مرتکب وہ کبھی نہیں ہوتا - یہ تو کچھ عورت ہی کی خصوصیت ہے کہ وہ قتل بھی کرتی ہے اور مسکراتی بھی جاتی ہے - ہمیشہ محبت کا اظہار پہلے خود کرے گی - کبھی زبان سے اور کبھی آنکھوں سے — وہ روئیگی — تم پوچھو "کیوں روتی ہو؟" کہدیگی "کچھ نہیں" بہت اصرار کرو تو نہایت سادگی سے نظریں جھکا کر بولے گی "میں کیا بتاؤں کیوں رو رہی ہوں — آپ میری جگہ ہوتے تو سمجھتے - بہرحال اچھا ہے نہ سمجھئے!"

اب جناب اگر آپ سمجھتے ہیں تو فی النار اور نہیں سمجھتے تو فی السقر - اور ضیا صاحب یہی نہیں اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ سے کچھ نہیں کہے گی — اپنی کتاب پر آپ کا نام لکھے گی اور پھر اسے یوں کاٹ دیگی کہ سوائے آپ کی نظروں کے اور کوئی نہ پڑھ سکے — آپ کو کبھی ضرورتاً خط لکھے گی — آخر میں اپنے نام سے پہلے لکھے گی "آپ کی ....." اور پھر صرف نام چھوڑ دیگی باقی الفاظ کاٹ دیگی — اب آپ ہی بتائیے کہ اس سے زیادہ صبر آزما طریقہ اظہارِ محبت کا اور کیا ہو سکتا ہے - بات یہ ہے جناب کہ عورت کی فطرت کا سمجھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں — اور اگر خدانخواستہ سمجھ میں آجائے تو پھر سمجھ کا خدا حافظ!

دل بدست دگرے دادن و حیراں بودن!!

خیر چھوڑئے اس قصّے کو — ہوگا - آج کون تاریخ ہے - چاند ڈوب رہا ہے - ستارے بھی کچھ دُھندلے سے ہو رہے ہیں جیسے کسی دوشیزہ کی قبر پر باسی پھول - کیوں صاحب کبھی آپ نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ روشنی کتنی ہی مدھم کیوں نہ ہو کسی نہ کسی مخرج کی مرہونِ منّت ہوتی ہے — مگر تاریکی کے اثرات کتنے ہولناک ہوتے ہیں! — میں اپنی زندگی کی تاریکیوں سے گھبرا گیا ہوں — میرا بچپن کتنا امید افزا تھا — جیسے انگور کی بڑھتی ہوئی بیل - میرے دماغ میں ترقّی کی کتنی قوّتیں موجود تھیں — میرا ذہن! میرا حافظہ!! لیکن اب؟ — اب کیا! کچھ بھی نہیں — کلیاں سب ایک طرح کی ہوتی ہیں — خوش رنگ، خوبصورت' (باقی مضمون دیکھو صفحہ ۴۸)

کسوٹی

ساغر نظامی

کسوٹی

نئی کتابیں

جاؔلب کے سو شعر

یہ مختصر سا مجموعہ محمد عادل مرزا صاحب جاؔلب چغتائی مراد آبادی کے سو اشعار کا مجموعہ ہے جسے خود مصنّف نے شائع کیا ہے۔ سو شعر جس حُسن کے ساتھ شائع ہونے چاہئیں، یہ مجموعہ اس جمالیاتی معیار کو پیش نہیں کرتا۔ لیکن اس کا حقیقی جمال خود وہ اشعار ہیں جو جاؔلب کی گداز اور حسین روح کو پیش کرتے ہیں۔

اس چھوٹی سی کتاب میں ایک "بسیط" دیباچہ منظور حسین خاں مضطر ایم۔اے لکچرار فیض عام کالج میرٹھ نے تحریر فرمایا ہے، جسے اصولِ انتقاد سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ یہ دیباچہ اصل موضوع پر روشنی ڈالتا ہے "سو شعر کی غائتِ اشاعت پر" اس میں خیالات اور اظہار و بیان کا سخت بکھراؤ پایا جاتا ہے، وہی رومانوی عہد کا نظریاتی اُلجھاؤ۔ "وہی حُسنِ مطلق" "حُسنِ رازِ سربستہ" "حسنِ درد" اور "حُسنِ تپشِ دل" تخیلاتِ رنگین وغیرہ کی تراکیب، نثر میں ایک نہیں، دو نہیں، تین تین اضافتیں "حسنِ تپشِ دل" قسم کی۔ اسی سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ منظور صاحب اُس تبدیلی سے ناواقف محض ہیں جو اُردو نثر نگاری کے اسالیب میں پچھلے چند برسوں میں عوامی ادب کے تقاضوں کی بنا پر ہوئی جس نے نیاز جیسے بر خود غلط انشا پرداز کو اپنے اسلوب کا احتساب کرنے پر مجبور کر دیا۔ انہیں یہ خوب معلوم ہو گیا کہ چند عربی اور فارسی کے نامانوس اور غریب الفاظ لکھنا "ادب" نہیں ہے۔

نثر نگاری کے اسالیب ہی نہیں یہ دیباچہ چغلی کھاتا ہے کہ وہ اُردو غزل اور اسکے ارتقاء سے بھی واقف نہیں ہیں۔ یا واقف ہیں تو اُسے ترتیب و تسلسل کے ساتھ بیان کر دینے پر قادر نہیں۔

یہی نہیں، شاعر کا جو تصوّر وہ پیش کرتے ہیں وہ بھی اوّل درجہ کا "دقیانوسی" ہے۔ جن موجودہ غزل گو شعراء پر بے نیازی کا دھوکہ ہو سکتا ہے اُن میں جگر، مرزا یگانہ، وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے، مگر سب جانتے ہیں کہ یہ بیچارے سوسائٹی سے بے نیاز ہونے پر مجبور ہیں۔ منظور صاحب فرماتے ہیں: ۔

"جگر یا جاؔلب — لیکن اپنے نغمات — جو آورد کا نتیجہ نہیں ہوتے تنہائی میں کسی کو سناتا ہوتا ہے، وہ بے نیاز ہوتا ہے اس امر سے کہ کوئی سُنے اور داد دے، وہ خود ہی قاری ہوتا ہے اور خود ہی مستمع، خود ہی عاشق اور خود ہی معشوق۔ میں غزل گو شاعر کو اسی معیار پر دیکھنا پسند کرتا ہوں، ہر چند قوم اور جماعت کے مفاد کا خون اس نظریّہ سے ہوتا ہے (آپ کی بلا سے ہوا کرے) لیکن کیا کیا جائے ایسا شاعر افراد کی سطح سے کہیں بالا ہوتا ہے اور تنقید کی ترازو میں تولا نہیں جا سکتا لہٰذا اس کا دور رہنا ہی بہتر۔"

جہاں تک ایسے شاعر کے خود ہی قاری اور خود ہی مستمع ہونے کا تعلق ہے قرینِ قیاس ہے، کیونکہ اگر یہ شاعر انسان ہے تو زبان و گوش ضرور رکھتا ہوگا، اپنی زبان سے اشعار "قرأت" کریگا اور اپنے کانوں سے "سمع" فرمائے گا۔ لیکن ایسے شاعر کی یہ تعریف کرنا کہ وہ "خود ہی عاشق اور خود ہی معشوق" ہوتا ہے محلِ نظر ہے۔ عاشق "اسم فاعل" ہے اور معشوق "اسم مفعول"۔ عاشق مرد کو قیاس کرینگے اور معشوق عورت کو، منظور صاحب کو یہ بھی بتانا چاہئے کہ بیک وقت اسم فاعل اسم مفعول اور چشم زدن میں مرد، عورت کیونکر ہو سکتا ہے!؟ یہ ممکن ہے کہ تغزّل کی انفعالیت اُسے "درمیانی درجہ کی کوئی صنف" بنا دے، ورنہ صاحب فاعل فاعل ہے اور مفعول مفعول۔ عاشق، عاشق ہے معشوق، معشوق!؟!

دیباچہ، پیش لفظ، اور تعارف، کا مقصد ناظرین کی نگاہوں میں شاعر یا ادیب کی ادبی اقدار قائم کرنا ہوتا ہے اور ادبی اقدار اُسی وقت قائم ہو سکتی ہیں، جب جنس کو نقد و نظر کے زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے ظاہر ہے کہ جاؔلب صاحب کے سو اشعار کا دیباچہ اس لئے منظور صاحب

نے تحریر فرمایا ہے کہ وہ شاعری میں جاؔلب صاحب کی شاعرانہ حیثیت کا تعارف کرائیں اور نقد و نظر کے بعد ان کی وہ قدر منوائیں جو قائم ہونی چاہیئے۔ مگر تنقید کی مخالفت کر کے وہ خود اپنے دعویٰ کی تردید کر دیتے ہیں۔ دُنیا میں میرؔ جیسا مجنون، غاؔلب جیسا مدہوش، داؔغ جیسا رند، اور اقبالؔ جیسا حکیم انتقاد کی ترازو سے نہ بچ سکا۔ سب کو سرِ بازار اور بازار کے ہر موڑ پر بالاعلان تولا گیا۔ منظور صاحب کس دُنیا کی باتیں کر رہے ہیں!؟ شاعر کی اس تعریف سے پہلے ایک جگہ بالکل متضاد بات کہتے ہیں:-

"لیکن اس دورِ ترقی میں جب شاعر کا دامن وسیع ہو چکا ہے
جس کو دیکھئے عاشقانہ اشعار جھوم جھوم کر پڑھ رہا ہے
. . . . . . بدیں وجہ دورِ حاضر کے تغزّل میں
اصلیت جدّت اور اثر نہیں رہا"۔

منظور صاحب کے نزدیک جن غزل گو شعرا نے (ریڈیو اور ریکارڈ یعنی پروپگنڈے کے روحانیت سوز اثر رکھنے والے مقامات سے) شہرت حاصل کی ہے وہ ۹۰ فی صدی شہرت کے مستحق نہ تھے۔ حالانکہ منظور صاحب یہ نہیں جانتے کہ ریڈیو اور ریکارڈنگ . . . . سے پہلے یہ غزل گو شعرا اپنی شہرت کا سکّہ اپنے جوہرِ شاعری کے ذریعہ جما چکے تھے۔ ریڈیو تک اگر کسی جوہر نے پہنچایا تو وہ ان کا حقیقی جوہر تھا جس کی سفارش ان کی شہرتوں نے کی۔

منظور صاحب کا اصل مرض یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت دلؔ شاہ جہاں پوری کے شاگرد ہیں اور اُن سے بیحد عقیدت رکھتے ہیں۔ (یہ عقیدت شاید جنون کے درجہ تک پہنچی ہوئی ہے) دلؔ صاحب کو غیر مشہور اور غیر مقبول دیکھ کر انہیں روحانی صدمہ ہوتا ہے۔ اور یہ صدمہ ان کے عمل میں طرح طرح سے پھوٹتا ہے۔

آگے چل کر اک اُلجھی ہوئی بے معنی تمہید اُٹھا کر لکھتے ہیں:-

"ہندوستان میں اس قسم (اوپر ایک قسم قائم کی گئی ہے) کے ماتحت یوں تو حسرؔت موہانی، جگرؔ مراد آبادی، سیمابؔ اکبر آبادی، یگانہؔ چنگیزی، اصغرؔ و فانیؔ وغیرہ باکمال حضرات کا کلام بلاغت نظام نہایت خلوص سے "رکھا" (؟) جاسکتا ہے لیکن میں ایک اور صرف ایک شاعر یعنی حضرت دلؔ شاہ جہاں پوری کے "نغمۂ دل" کو سب سے بہتر خیال کرتا ہوں"۔

سوال یہ ہے کہ انہوں نے تمام اُردو دُنیا کو بے علم، بد ذوق، کم نظر اور نابینا کیوں تصوّر کر لیا ہے۔ آخر اُردو ادب کے جوہریوں کی نگاہ اُس موتی پر کیوں نہیں پڑی، جس کی جوت نے منظور صاحب کی نگاہوں کو خیرہ ہی نہیں کچھ اس سے زیادہ کر دیا ہے۔ دلؔ صاحب کے مشہور و مقبول نہ ہونے کے یہی اسباب نہیں کہ ان کو پروپگنڈے کے مواقع نصیب نہیں۔ اصل وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ اُردو تغزّل کے بدلتے ہوئے رجحانات کو گرفت میں نہیں کر سکے۔ نہ صرف دلؔ صاحب بلکہ اس وقت نوحؔ، سائلؔ، اور باقیؔ ایسے تمام بزرگ جو قدیم محاورات نگاری اور معاملہ بندی کے شاعر تھے۔ اپنا کام ختم کر چکے ہیں، یہی نہیں ان کے بعد کے لوگ بھی کنارے پر پہنچ چکے ہیں۔

محمد عادل مرزا جاؔلب مراد آبادی کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس میں کوئی خصوصیت نہیں۔ جاؔلب صاحب کی شاعرانہ حیثیت کافی بلند ہے، جگرؔ کے بعد مراد آباد نے جاؔلب کو پیدا کیا، اور کوئی شک نہیں کہ ترقّی یافتہ تغزّل کی تمام دل آویزیاں اور تاثر جاؔلب کی شاعری کی روحِ رواں ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جاؔلب کے شعر میں اک دل دھڑکتا معلوم ہوتا ہے ؎

بہاریں بھی ہیں گلشن بھی ہے قرصِ ماہ و انجم بھی
مگر اس دل سے پوچھو جو کمی معلوم ہوتی ہے

قدیم تغزّل ہو کہ جدید، تاثراتی عناصر ہر جگہ ایک ہی ہیں، گیت اور غزل میں "المناکی" اور انفعالیت ہمیشہ سے "حسن" سمجھا گیا۔ شاید ایشیائی محبّت کا منتہاہی ناکامی اور بدنصیبی ہے، مشرقی زندگی میں چاروں طرف سے فرد کے ذہن پر جس قسم کے دباؤ پڑتے ہیں، اس کا لازمی نتیجہ وہ المناکی اور افسردگی ہے جو مشرقی شعراء کے کلام میں زیادہ سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ رہی مستی اور رنگینی، وہ اس المناکی اور افسردگی کا ردِّ عمل ہے۔

جاؔلب کے کلام میں المناکی اور افسردگی کوئی ایسی بُنیاد نہیں ہے جس پر اسکے تمام تر تفکّر اور تاثر کی عمارت کھڑی ہوئی ہو اکثر جگہ نہایت دلنواز شگفتگی کلیوں کے کھلنے کا سا منظر پیشِ نظر کر دیتی ہے۔ ایک جگہ کہتا ہے کہ ؎

آتی ہے اس طرح سے چمن میں بہارِ نو
جیسے کہ سامنے سے چلے آ رہے ہو تم

علو اور رفعت، فکر اور جذبہ کی اصابت بعض جگہ اس طرح نمایاں ہوتی ہے کہ بے ساختہ اسکی شاعری کی عظمت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے ؎

محبّت آج اس معیار پر پہنچی کہ عالم کو
مری وحشت بھی تیری ہی ادا معلوم ہوتی ہے

لیکن شراب پر شعر کہہ رہے ہیں، شاہد باز نہیں لیکن رند بنے ہوئے ہیں، نہ کسی سے محبت ہے نہ نفرت، لیکن کلام میں سب کچھ موجود ہے؛ غرضکہ قافیہ نے جو کچھ کہا وہی بن گئے؛ ۳۰، ۴۰ برس کی مشق کے بعد یہ لوگ کچھ اچھے شعر بھی کہہ لیتے تھے۔

کوئی شک نہیں، ریاض بعض مسائل میں مستثنیٰ تھے؛ وہ بہ حیثیت انسان سینہ میں حساس دل رکھتے تھے لیکن ان کی شاعری اور اعمالِ اخلاق میں سخت قسم کا تضاد پایا جاتا ہے؛ اسی لئے ہم ان کی شاعری کو روایتی شاعری کہنے کیلئے مجبور ہیں، یہ الگ بات ہے کہ ان کی شاعری کا اک معیار ہے اور ذہن و دماغ کی تفریح کرتی ہے؛ مگر شاعر نے جو کچھ کہا ہے وہ اسکے دل پر بھی بیتا ہے یا اس کو شراب سے واقعی ذوق رہا ہے؛ یہ ان کے کلام سے معلوم نہیں ہوتا۔

نیاز نے ریاض کا مقدمہ اسی عجب انداز میں پیش کیا ہے جس میں تبختر، شان اور ریاض نمائی سے زیادہ خود نمائی کی ادا پائی جاتی ہے۔ یہ احساس مجہول (   ) نیاز کی مختص ترین کیفیت ہے۔ نیاز خوب جانتے ہیں، مجنوں اور فراق اور دسیوں نوجوان انکے مقابلے میں انگریزی ادب پر وسیع اور گہری نظر رکھتے ہیں اس لئے ان سے جب ملیں گے اک خودی کے ساتھ ۵
گویا   احساسِ مجہول کے ساتھ۔

تمام نمبر میں فراق، نیاز، اور دوسرے لکھنے والوں کی یہ سعی رہی ہے کہ وہ ریاض کی شاعری کا کوئی صحیح پس منظر بنائیں، مگر کامیابی نہیں ہوئی، فراق نے ذرا جرأت دکھائی ہے مگر مقصد ان کا بھی قصیدہ خوانی ہے، مُرکیاں اس لئے کھائیں ہیں کہ آپ کو گمان ہے، لوگ آپ کو بھی ترقی پسند خیال کرتے ہیں۔ دوسری طرف ترقی پسند دوستوں سے زیادہ اڈیٹر نگار کی خاطر منظور ہے۔ ریاض کی غزل کو فراق نے "اداکاری" سے تعبیر کیا ہے، جھوٹ کہا ہے، مگر اس "جھوٹ" کہنے کے لئے اسے خود بھی بہت بڑا جھوٹ بولنا پڑا ہے:۔

"ناسخ کا جھوٹ ریاض کا سچ بن گیا ہے"   (فراق)

غلط کو صحیح، اور صحیح کو غلط، ثقاہت کو ابتذال اور ابتذال کو ثقاہت کر دکھانا نیاز فتحپوری کا کمال ہے، اگر انہیں ابتذال کی نمائندگی کرنی ہے تو وہ تمام عالمِ منطق، تمام دُنیائے طلاقت، کل امکاناتِ خطابت کو، جائز و ناجائز کے خیال سے آزاد ہو کر درہم و برہم کر دیں گے؛ اور دُنیا سے تسلیم کرائیں گے کہ یہ ابتذال نہیں ثقاہت ہے؛

ابھی کچھ زیادہ زمانہ نہیں ہوا کہ سماج میں شاعری کے ان رنگوں کے خلاف جذبہ پیدا ہوا جو دور رخے تمدن کا نتیجہ تھے۔ "دیوان خانہ" اور "حویلی" کی تہذیب نے جو دیواریں سماج میں کھڑی کر دی تھیں، ظاہر ہے کہ داغ اور ریاض کی شاعری ان دیواروں کے سایہ میں پلی بڑھی ہے۔ اقبال سے پہلے اُردو شاعری "اسی چھندلے عنصر" کی بنا پر اس درجہ مردود اور مسترد ہو چکی تھی کہ بچوں اور عورتوں کے سامنے شعر پڑھنا معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ حالی نہ سہی مگر اقبال نے شاعری کو وہ گہرائی اور سنجیدگی بخشی کہ شعراء کی مٹی ہوئی عظمت سماج میں دوبارہ اس طرح اُبھر آئی جیسے کیچڑ کے اندر سے کنول کا پھول؛

شاعر کے اس ارتقاء اور نکھار کو نیاز "سنجیدہ سوختگی" اور "متین برشتگی" اور کُھل کھیلنے کی حالت میں بھی "جرأت رندانہ کے فقدان" سے تعبیر کرتے ہیں؛ ان کا خیال ہے کہ آج "شمع سخن" کے پروانوں کی خاک سرد پڑ گئی ہے۔

وہ اپنے حسرتناک بڑھاپے میں سٹھیا کر اُس چوک کو یاد کرتے ہیں، جہاں "تماشائے لبِ بام" کی رسم جاری تھی اور شامِ اودھ کے دُھندلکے میں نغمہ و سرود کی گونج باقی؛

حالانکہ یہ وہ موقع تھا کہ وہ اس فرسودہ "ادبِ لطیف" کی نگارش سے پرہیز کرتے اور اس پسِ منظر کو پیش کرتے جو ہندوستانی سماج کے ابتذال کا ایک دردناک اور چیختا ہوا منظر تھا۔ یہ شعر ؎

اس طرح کہ گھنگرو کوئی چھاگل کا نہ بولے
جب چھم سے چلیں گود میں چُپکے سے اُٹھا لے

نیاز کی نظر میں محض "ناواجب شوخی" کا آئینہ دار ہے، لیکن ریاض کے علاوہ داغ کے اس قسم کے اشعار کے متعلق یا غالب کے اس شعر پر کہ ؎

ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

وہ نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ ابتذال کا چارج لگا دیں گے۔ مگر ریاض کی وکالت کے زعم میں اس شعر کے متعلق وہ ادب کے مختارِ مطلق بن کر حکم صادر کرتے ہیں کہ "اسے مبتذل کہنے کا حق کسی کو حاصل نہیں ہے"؛ غالب کو وہ مفکر شاعر نہیں طنزیاتی شاعر تسلیم کرتے ہیں؛ حالانکہ . . . .
خود انکا طرزِ انتقاد، محض لفاظی اور طنز نگار کی سی ٹھٹول بازیوں کے علاوہ کچھ نہیں؛

ریاض نمبر میں سب سے بڑا مسئلہ دہلی اور لکھنؤ کا تمدنی مجلسی نفسیاتی اور ذہنی تقابل کا ہے، جو بڑے مزہ سے چھیڑا گیا ہے، یہ عنصر فراق کے مضمون کی اساس ہے، بہ حیثیت نقاد فراق پر نظر ڈالتے ہوئے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی جائیگی۔ لیکن یہ تو کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ میر و غالب کی صف میں ریاض کو نہیں بٹھایا جا سکتا۔ فراق نیاز سے زیادہ "باتونی" ہیں اور انہوں نے کافی طاقت ریاض کی شاعری کو اعلیٰ درجہ کی حقیقی شاعری ثابت کرنے پر کی ہے، لیکن اس وکالت سے زیادہ لوگ خود ریاض کی شاعری سے نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔

زندگی کے دکھ سکھ کی وہ حقیقت جو الفاظ میں رچ کر شعر کو ابدیت عطا کرتی ہے، لکھنؤ والوں کے یہاں مفقود اور دہلی والوں کے یہاں نمایاں طور پر موجود ہے۔ میر کہتا ہے ؎

چشم خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا
ہم تو سمجھے تھے کہ اے میر یہ آزار گیا

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

عجلت میں یہ چند سطور تحریر کی گئی ہیں۔ لیکن "ہمارے نقاد" اور ان کی بے راہ روی متقاضی ہے کہ ان کے اعمال و افکار کے متعلق باقاعدہ ایک مبسوط سلسلہ لکھا جائے، چنانچہ ایشیا میں یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ آئندہ نمبر میں نیاز، مجنوں، فراق، ڈاکٹر تاثیر، ڈاکٹر عبدالحق، ڈاکٹر محی الدین زور۔ عبدالقادر سروری۔ مسعود الحسن، احتشام الدین، سجاد ظہیر، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور دوسرے اصحاب کے انتقادی نقطۂ خیال اور جملہ اعمال و افعال کو اصول انتقاد کی روشنی میں دیکھا جائیگا۔

اصل میں ہمارے ادب میں انتقاد کی بڑی کمی ہے خاص کر موجودہ عہد کے اکثر شعراء نے اپنی نثر نگاری کی اہلیتوں کا تجزیہ و احتساب نہیں کیا، یہی نہیں انتقاد کے ذوق کی تکمیل سے بھی عاجز رہے، مگر اب وقت آگیا ہے کہ سونا خود اپنی کسوٹی کو پرکھے۔

ایک رات

(شالامار پکچرز کی پہلی تصویر)

(بقیہ مضمون صفحہ ۵۶)

کلچر سے تعلق رکھتا ہے۔ راجہ کے مکان میں آنے کے بعد ننیا کو برج کی رانیوں کا لباس لہنگا شلوکا اور اوڑھنی پہنایا جاتا تو شاید مناسب ہوتا۔

میں جانتا ہوں ڈائرکٹر اس موقع پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ شلوار عام طور پر پہنی جاتی ہے اس لئے پہنائی جا سکتی ہے۔ ان دو مقامات کے علاوہ "ایک رات" کے تمام لباس اپنے اندر موزوں ترین انتخاب وصحت رکھتے ہیں۔

سوتیلی بہن کی پارٹی میں ننیا کو جو نیل او ور پہنایا گیا ہے، وہ اسے بالکل نہیں سجتا، دوسرے لباسوں کے مقابلے میں اس لباس میں اسکی عمر زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ یہاں کوئی شام کا لباس زیب کرانا تھا۔ گو یہ ضرور ہے کہ اس پارٹی میں اس کی سوتیلی بہن نے ننیا کو شریک نہیں کیا ہے، اور وہ یونہی بے تکلف علیحدہ بیٹھی ہوئی ہے۔

ترتیب و پلاٹ

کہانی دو معصوم صفت محبت کرنیوالے مرد و عورت سے شروع ہوتی ہے، جو ایک منزل پر آکر سماج کے اخلاقی بندھن کو توڑنا چاہتے ہیں، مگر ننیا کی معصومیت دونوں کو ناکام بنا دیتی ہے۔ اسکے بعد راجن اور ننیا کسی قسم کا باغیانہ اقدام نہیں کرتے، یہ مقام بڑا انتقادی اور نفسیاتی مقام ہے۔

سماج میں عورت کی پوزیشن باوجود ترقی آزادی اور روشنی کے ابھی تک رجعت غلامی اور تاریکی میں جکڑی ہوئی ہے، اس سے زیادہ خود عورت کا ذہن و روح ان پرانے سماجی ریتی رواج اور اعتقادات کے جال میں پھنسا ہوا ہے جو اسے پرانے اور دقیانوسی ماحول سے وراثت میں ملے ہیں۔ اس لئے افسانہ نگار نے نئی ذمہ داریوں کو قبول کرنے سے اپنا دامن بچایا ہے اور عاقبت اسی میں سمجھی ہے کہ ننیا کی نفسیات اور قائم کردہ کردار راجہ کی سیرتی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر ایک قدرتی ترتیب کو جاری رکھے اور پھر بھی مگر قیاسی پلاٹ کے ذریعہ کہانی کے انجامی مرکز تک

پہنچے۔ اس لحاظ سے کہانی میں کوئی نقص نہیں ہے اور وہ ترتیب و پلاٹ کے لحاظ سے درست ہے۔

تشکیل

میں یہ یقین کرتا ہوں کہ ایک رات کے ڈائرکٹر کا جمالیاتی ذوق عام ڈائرکٹروں سے بالکل مختلف اور بلند ہے کیونکہ اس تصویر میں تشکیل کی ادنیٰ سی غلطی نہیں پائی جاتی غالباً اس لئے کہ تصویر کی جو فضا اور ماحول ہے، شاید اس ماحول و فضا کے ایک ایک جزیہ کو اسکے ڈائرکٹر ذاتی طور پر مشاہدہ کر چکے ہیں۔

اداکاروں کی تعداد

ایک رات میں اداکاروں کی تعداد دو مناظر میں اجتماعی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ ایک چائے کی پارٹی میں، ایک عدالت میں۔ ایسے مواقع پر زیادہ تعداد کی وجہ سے مجبوراً ایسے چہروں والے افراد کو جمع کر دینا پڑتا ہے کہ جو جمالیاتی اور رنگارنگی کے نقطۂ نگاہ سے وہ توازن باقی نہیں رکھتے جس میں وقار اور کم تری حسن اور بدصورتی، اور مجموعی طور پر "حقیقت بھی قائم رہ سکتی"۔ چنانچہ چائے کی پارٹی میں نینا کی سوتیلی بہن کی جو سہیلیاں جمع ہوئی ہیں ان میں یہ تناسب باقی نہیں رہا، کوئی بھی اُن میں حسین لڑکی نہیں ہے۔ اس کے جواب میں ڈائرکٹر کہہ سکتے ہیں کہ نینا کی سوتیلی بہن جیسی ہے ویسی ہی اسکی سہیلیاں ہیں، مگر وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ عوامی اور جمالیاتی نقطۂ نگاہ سے ان کا جواب تسکین بخش نہیں ہوگا۔

۵۲

البتہ عدالت کا منظر، اس لحاظ سے بالکل مکمل ہے، یہ ایک مہمی منظر ہے مگر تکمیل کے ساتھ نگاہوں کے سامنے آتا ہے اور کامیابی کے ساتھ گزر جاتا ہے۔

اداکاری

رہی اداکاری، سو فلم انڈسٹری میں شاید کوئی سوشل تصویر ایسی نہیں ہے جس میں کسی ہیروئن نے نینا کی طرح حقیقت کا مجسمہ بن کر دکھایا ہو۔ نینا کی ہنسی، نینا کی مکالمت، اندازِ گفتگو، اس کا طور و طریق، اسکی چلت پھرت، اسکی آنکھوں کی جنبش، اسکی حیا، اسکی بے باکی، سب ایک گھریلو کنواری لڑکی کی حقیقی زندگی سے تعلق رکھتی ہے، خاص کر اسکی آواز اور اندازِ گفتگو اتنا ہی دلربا اور اثر ریز، بے ساختہ اور پاکیزہ ہے جس قدر شمالی ہند کے ایک ایسے گھرانے کا ہو سکتا ہے جیسا کہ ایک رات میں دکھایا گیا ہے۔ اس لئے واقعیت اور فن اداکاری کے لحاظ سے اسکی کامیابی بہت بڑا درجہ رکھتی ہے۔ ایک رات کی تمام عمارت نینا کے تبسم پر قائم ہے۔

اوّل سے آخر تک نینا کا رول بغیر کسی نقص اور اکراہ کے بے ساختہ طور پر ادا ہوا ہے اور اسکی اداکاری میں حسن و تکمیل کی اتنی مقدار جمع ہو گئی ہے کہ وہ تقسیم ہو کر تمام باقی افراد کی اداکاری میں توازن قائم کر دیتی ہے۔

راجن (ہیرو) یعنی پرتھوی راج بی اے کی اداکاری میں یہاں بھی انکی مخصوص خصوصیات نمایاں ہوئی ہیں۔ خاص قسم کی شرمیلی مردانگی پُر وقار اندازِ مکالمت، شاندار وجود، مردانہ صبر و ضبط شریفانہ تہذیب و صبر مخصوص حرکات، چہرہ کے مختص خطوط، اپنی گھبراہٹ، اپنی مسکراہٹ، اپنی مسرت اپنا غم، پرتھوی راج کی اداکاری اپنے اندر ایک شخصیت پوشیدہ رکھتی ہے۔ جب شخصیت کو سامنے لانا ہو تو پرتھوی راج کو چُننا چاہیئے، وہ پُر وقار شریفانہ افراد کی نمائندگی کرنے میں مخصوص درجہ رکھتا ہے، میراں بائی میں راجہ کا کام اس کا وہ اختراعِ فائقہ ہے جو ایک بار ظاہر ہو کر پھر دوبارہ ظاہر نہ ہو سکا۔

مجھے یاد نہیں رہا، کے این سنگھ اور مبارک کا کیا رول ہے، مگر چترلال اور راجہ نے حقیقی مصاحب اور حقیقی راجہ کو پیکر بخش دیا ہے، چترلال نے اوّل سے آخر تک اپنے رول میں تکمیل و توازن کا کمال کامیابی سے باقی رکھا ہے نینا کے باپ کا اندازِ گفتگو قطعی بے روح ہے۔ اور نینا کی سوتیلی ماں نے اپنی شخصیت کو فراموش نہیں کیا۔ باقی ضمنی کرداروں میں راجہ کا ملازم اور نینا کی خادمہ نے بڑی کامیابی سے اپنا رول ادا کیا ہے۔ دیکھنے میں تو یہ ضمنی کردار ہیں لیکن اگر یہ جامد ہو جاتے تو ایک رات ٹھٹھر کر رہ جاتی۔

عکّاسی

ایک رات کی عکّاسی، فنّی لحاظ سے موزوں ترین معیار رکھتی ہے۔ البتّہ پارٹی میں نینا کے جو پوز دیئے گئے ہیں، وہ غلط ہیں اور منظر کو کمتر بنا دیتے ہیں۔ صرف یہی ایک ایسا مقام ہے ورنہ عکّاسی شروع سے آخر تک ایک معیار قائم رکھتی ہے۔

ہدایت کاری

رہی ہدایت کاری سو غور کرنے سے بآسانی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس معمولی مسائل سے تعلّق رکھنے والی کہانی میں جو اعلیٰ روح تناسب کام کر رہی ہے۔ اسکا کامل کریڈیٹ ایک رات کے ڈائرکٹر مسٹر ڈبلیو زیڈ احمد کو حاصل ہے، جو معمولی سے معمولی جزئیات کو اہمیت دیتے ہیں اور فنّی طور پر جمالیات، اداکاری، تہذیب و تمدّن، کلچر، نفسیات اور جملہ باتوں کے متعلّق علم و وقوف رکھتے ہیں، یہی نہیں ان کو عالمِ تصویر میں نمایاں کر سکتے ہیں۔ ایک رات کا ڈائرکشن کسی طرح اعلیٰ تصویروں کی ہدایت کاری سے کم نہیں۔ انہیں مُبارک ہو کہ شمالی ہند میں یہ تصویر اعلیٰ تصویروں کا ساریکارڈ قائم کر رہی ہے۔

میں تو حیران رہ گیا جب حیدرآباد میں میرے ایک جاگیردار دوست نے کہا کہ چلو، ایک رات دیکھو، میں اسے آج چودھویں بار دیکھنے جا رہا ہوں۔

ساغر

تصویرکدہ

ساغر نظامی

ایک رات

(شالامار پکچرز کی پہلی تصویر)

نثر و نظم، تحریر و تقریر، محض اظہار کا فرض ادا کرسکتی ہے لیکن صدیوں کے بعد انسانی ذہن نے فلم ہی ایک ایسا فن ایجاد کیا ہے جس میں اظہار کی قابلیتوں کے ساتھ ساتھ "ابلاغ" کی کامل اہلیت موجود ہے، فلم آرٹ، صناعت و ادب، اظہار و ابلاغ کا ایک ایسا نادر امتزاج ہے جسکی مثال انسانی تمدن و آرٹ کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

ابلاغ کی قطعی محسوس اور واضح قابلیتوں نے اس فن کو انسانی سماج کیلئے ایک ایسا ذریعہ قرار دیدیا ہے کہ لمحۂ پیدائش سے لیکر موت کی منزل تک جس قدر انسانی مسائل اور ضروریات ہیں ان سب کی تکمیل و ترویج، اصلاح و تبلیغ کے لئے اس ذریعہ سے کام لیا جاسکتا ہے۔

یورپ و امریکہ، جرمنی و جاپان نے اس حقیقت کو سمجھا اور برتا، ہندوستان غلام ملک ہے، یہاں نہ کوئی حقیقی منصف حکومت ہے نہ قومی حکومت، اس لئے فلم انڈسٹری سے بھی وہ کام نہیں لیا جاسکتا جو تعمیرِ حیات میں دوسرے آزاد ملکوں میں لیا جاتا ہے۔

پھر بھی ہزار مجبوریوں کے عالم میں صنعتِ فلم نے ہندوستان میں جس قدر ترقی کے مدارج طے کئے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ اگر اس ملک کو یورپ کے سے آزاد وسائل حاصل ہو جائیں اور اپنے ملک کی پیداوار اور نظم و نسق پر اختیار دیدیا جائے تو فلم انڈسٹری بہت جلد مرکزِ عروج تک پہنچ سکتی ہے۔

ابھی دس پندرہ سال بھی نہیں ہوئے کہ صنعتِ فلم بالپن کی گود میں ٹھنک رہی تھی، مگر اب اس نے آرٹ کا ایک معتدل معیار قائم کرلیا ہے اور اس کی آغوش میں نوجوانی مسکرانے لگی ہے، گو اپج اور رنگا رنگی کی بڑی کمی ہے۔ تقلید اور مسابقت نے اس جوہر کو بہت دبا دیا ہے، ایک ہی قسم کی موسیقی، ایک ہی قسم کی نتیجہ خیزی، ایک ہی قسم کی زندگی اور ایک ہی قسم کی کلچری خصوصیات میں فلمی جہان اُلجھا ہوا ہے، مگر بعض گوشوں میں ترقی و تجدّد، متعلم اور معتدل تغیّر کی کوششیں بھی کارفرما نظر آتی ہیں۔ انہیں کوششوں میں سے ایک ہلکی سی کوشش شالامار پکچرز بمبئی کی تازہ تصویر "ایک رات" بھی ہے۔

اس تصویر کا سماجی پس منظر کچھ دوسری تصویروں سے مختلف نہ سہی مگر پھر بھی زندگی کو بڑی حد تک قیاسی صورت میں پیش کیا گیا ہے، شاید اسکی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ موضوع کے لحاظ سے اسکے ہیرو، اور ہیروئین اور دوسرے اداکار، حقیقت سے بےحد قریب ہوگئے ہیں۔

کہانی "ایک رات" کی کہانی اتنی سی ہے کہ نینا ایک ہندو امیر گھرانے کی لڑکی ہے، اس کی ماں مرچکی ہے۔ سوتیلی ماں زندہ ہے اور ایک بہن۔

نینا کی جوانی اپنی عمر کے خول سے اس طرح نمودار ہو رہی ہے جیسے صبحدم موجیں لیتی ہوئی جھیل میں سے کھلتی ہوئی کنول کی کلی، سوتیلی بہن کی جوانی جنگلی دھتورے کے پھول کے مانند ہے، الڈھر اور راجڈ، مگر اس کی ماں زندہ ہے اس لئے دنیا بھر کا چین و آرام اور نیک آرزوئیں اُسی کے لئے ہیں۔ نینا کا باپ اسکی سوتیلی ماں کے دامِ اثر میں اُلجھا ہوا ہے، سوتیلی ماں نینا کے شگفتہ اور قدسی شکار حُسن کو دیکھ کر جلتی ہے۔

اس گھرانے کے پڑوس میں دوسرا گھرانا ہے،

اس میں راجن ایک نوجوان رہتا ہے اور ننیا اور راجن دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، ننیا کی سوتیلی ماں اس بھید کو تاڑ جاتی ہے حد سے زیادہ جلتی ہے راجن اک فوجی ڈاکٹر، سجیل، وجیہ اور مہذب نوجوان ہے، ننیا کی سوتیلی ماں اپنی بیٹی سے اس کا بیاہ رچانا چاہتی ہے۔ آخر وہ ایک دن ننیا کے بلوغ کی طرف اشارہ کر کے اپنے شوہر کو راضی کر لیتی ہے اور خود ننیا کے لئے بر تلاش کرنے کا وعدہ کرتی ہے اور کر بھی لیتی ہے۔

چترلال ایک آوارہ شخص کے ذریعہ وہ ایک عیاش و آوارہ راجہ کو ننیا کے ساتھ شادی کرنیکے لئے پھانستی ہے اور راجہ اس لئے تیار ہو جاتا ہے کہ لڑکی بھی خوبصورت ہے اور لڑکی کے باپ کا روپیہ بھی۔

اسی دوران میں راجن کو اپنی ملازمت پر جانا پڑتا ہے، اسکے جانے کے بعد ننیا کی شادی کے انتظامات ہوتے ہیں۔ راجن چھٹی لے کر واپس آتا ہے، تو اس سے ننیا کی سوتیلی ماں اپنی لڑکی کی شادی کے بارے میں بات چیت کرنے کیلئے مکان پر جاتی ہے۔ مگر راجن مسترد کر دیتا ہے۔ وہ ننیا کے باپ سے ملکر بھی متنبہ کرتا ہے کہ وہ راجہ سے ننیا کی شادی کر کے بہت بڑی غلطی کر رہا ہے، مگر وہ اسکی ایک نہیں سنتا، راجہ سے بھی کہتا ہے مگر وہ اور اسکا مصاحب چترلال بھی اس کا مذاق اُڑاتے ہیں۔

آخر وہ ننیا سے ملتا ہے اور کہتا ہے آؤ ہم تم رات کو بھاگ چلیں، وہ جھجکتی ہے مگر پھر بھاگنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ وقت مقرر کر کے راجن اسکا انتظار پائیں باغ میں کرتا ہے۔ مگر معصوم ننیا کو اندازہ نہیں ہوتا کہ اسکی ماں یہ سب کچھ سمجھ رہی ہے اور بھاگنے کی ہر راہ بند کی جا چکی ہے۔ آخر راجن ناکام ہو کر واپس چلا جاتا ہے۔ ننیا کی شادی زبردستی راجہ کے ساتھ کر دی جاتی ہے۔

ننیا کا ہونے والا شوہر۔ راجہ ایک عیاش آوارہ اور عورت سے کھلونے کی طرح کھیلنے والا غیر معصوم شخص ہے۔ اسکی ایک داشتہ اس پر چھائی ہوئی ہے وہ اُسے یقین دلاتا ہے کہ یہ شادی میں نے محض روپیہ کیلئے حاصل کی ہے۔ چترلال کو اپنی زر اندوزی سے کام ہے وہ راجہ کی داشتہ، راجہ، اور ننیا ہر شخص کو بیوقوف بناتا ہے۔

شادی کے بعد راجہ کا جوشِ عیش پرستی اسے اُبھارتا ہے۔ وہ ننیا اپنی نئی بیوی سے ملنا چاہتا ہے، داشتہ تعاقب کرتی ہے اور ملنا ناممکن بنا دیتی ہے اسی طرح راجہ داشتہ سے بھی نفرت کرنے لگتا ہے اور چاہتا ہے راہ سے اس کانٹے کو نکال دے معصوم ننیا راجہ کا کلچر اور طور طریق دیکھ کر حیران و نافر ہے چترلال راجہ کا مصاحب اُسے نئی راہوں پر ڈالتا ہے اور طرح طرح راجہ سے جبر و تعدی کرا کے ننیا کے باپ سے روپیہ اینٹھتا ہے۔

بالآخر ایک رات تنگ آکر راجہ کی داشتہ شراب میں زہر ملا دیتی ہے، خود بھی مر جاتی ہے اور راجہ کو بھی مار دیتی ہے اور اس واقعہ کے متعلق یادگار میں اک تحریر چھوڑتی ہے۔

قمار خانہ میں نہ پہنچنے کی بنا پر چترلال راجہ کی کوٹھی میں آتا ہے، مگر دونوں کو مُردہ پا کر حیران ہوتا ہے ننیا بھی گھر پر نہیں ہے وہ اس سے پہلے تنگ آکر چلی جاتی ہے۔ راجن اپنے گھر پر اُداس ہے نوکری چھوڑ چکا ہے۔

بہر حال اس قتل کے الزام میں چترلال راجن کو گرفتار کراتا ہے، مقدمہ ہوتا ہے۔ چترلال وہ تحریر جو راجہ کی داشتہ چھوڑ کر مری تھی ۲۰ ہزار میں ننیا کے باپ کو فروخت کرنا چاہتا ہے۔ ننیا راجن کی محبت سے مغلوب ہو کر اسکی جان بچانے کی خاطر باپ سے چاہتی ہے کہ روپیہ دیدے، مگر وہ انکار کر دیتا ہے۔ ننیا اپنی ترکیب سے یہ تحریر چترلال سے چھین لیتی ہے۔ یہ تحریر کورٹ میں پیش ہوتی ہے۔ جرح کے وقت راجہ کی داشتہ کا شوہر نمودار ہو کر اسکی تصدیق کرتا ہے۔ بالآخر راجن اور ننیا کی محبت کامراں ہوتی ہے۔"

مقصد کہانی کی بُنیاد قطعی سماجی ہے، پس منظر میں سماج کے رتی رواج سوتیلی ماں کا سلوک، ہندو سماج میں عورت کی بے وقعتی، دھن دے کر من خرید لینے کی رسم' اور بے من، تن سپرد کرد ینے کا طریق، روایتی شان و شوکت، بے جان عزّت کا تخیّل اور راجہ سوسائٹی کی ذلیل و قابلِ نفرت فضا کے خلاف "ایک رات" نہایت نازک احتجاج ہے۔

اس تمام انبوہ کی جان یہ حقیقت ہے کہ تن کی خرید و فروخت ہوسکتی ہے من کی تسخیر ممکن نہیں، عورت کی نفرت و محبّت اٹل ہے اور سچی محبّت بالآخر کامیاب ہو کر رہتی ہے۔

نفسیاتی گہرائیاں کہانی کی بُنیاد سماجی مشکلات ہیں ہندو سماج میں عورت کی مجبور پوزیشن اور سوتیلی ماں کے گھر میں بن ماں کی بیٹی کی ہندوستان میں بدبختانہ حیثیت ہے چنانچہ سوتیلی ماں راجن سے اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہتی ہے مگر نینا اور راجن کا معاہدہ ابدی ہو چکا ہے، شادی کے بعد بھی وہ راجہ (شوہر) سے محبت نہیں کرتی بلکہ نفرت کرتی ہے اور راجن کو سمجھاتی ہے جو اسکی طرف سے غیر یقینی عہد شکنی کا وہم رکھتا ہے۔

رنگ محل کا حیران کن اور پُر شکوہ ماحول، اور اک بد اعمال شخص کی معصیت کا جال، نینا کو بہک جانا چاہیئے تھا، مگر محبّت انسان کو کتنی قوّت بخش دیتی ہے، اس کا اندازہ نینا کے کر [illegible] سے ہوتا ہے۔ اس تمام سماجی اور نفسیاتی اُلجھاؤ کو مسٹر احمد کے ڈائریکشن نے اپنی تمام بلند اور فنّی خصوصیات کے ساتھ نہایت تناسب اور فطری انداز میں ظاہر کیا ہے۔

مکالمات نینا کی شخصیت اور اسکی اداکاری تمام تصویر پر ساون کی گھٹا کی طرح چھائی ہوئی ہے جس طرح ساون کی گھٹا انسانی نفسیات اور قوّتِ احساس کو صرف اپنی طرف متوجّہ کر لیتی ہے۔ نینا کا کمال اداکاری دیکھنے والوں کو اپنی طرف ہی متوجّہ رکھتا ہے ورنہ مکالمات بُرے نہیں، صلاح الدین احمد کے لکھے ہوئے ہیں، یہ ادبی دُنیا کے مدیر بھی ہیں اور خود اہلِ قلم ہیں، مکالمات میں کردار کے لحاظ سے بے ساختگی کے کیف و کم کو باقی رکھا گیا ہے اور جب کوئی کردار بولتا ہے تو معلوم ہوتا ہے، یہ اُسی کی زبان اور اُسی کا دل ہے۔

یہی وہ معیار ہے جسے مکالمات میں ہر مکالمہ نگار کو قائم رکھنا چاہیئے۔

گیت بھی بُرے نہیں، مگر کسی تصویر کے گیتوں کی خصوصیت میرے نزدیک یہ ہونی چاہیئے کہ وہ اسکرین سے اُچھلیں اور گلیوں میں گونجنے لگیں، جذبات کی شدّت ان گیتوں میں نہیں ہے۔ یہ شدّت خود ایک رات کے نغمہ نگار پنڈت اندرجیت شرما میں بُنیادی اور طبعی طور پر نہیں ہے۔ پھر بھی گیت ایک سطح رکھتے ہیں۔ اس تصویر کی تہذیب و تناسب کا اندازہ صرف ایک بات سے کیا جاسکتا ہے کہ کسی بھی موڑ پر ہیرو مغنّی کی حیثیت میں نمودار نہیں ہوتا۔ اگر احمد صاحب ایک آدھ بول پرتھوی راج صاحب سے گوا دیتے تو کم از کم یہ تاریخ تو بن جاتی کہ وہ بھی گنگنا لیتے ہیں!؟

خیر، مگر یہ حقیقت پرستی کا کمال ہے، کہ ایک رات کے ماہر ڈائرکٹر نے اس سمّی عنصر سے اپنی تصویر کو پاک رکھا ہے۔ ایسی مثالیں صرف انگریزی تصویروں ہی میں ملتی ہیں۔

موسیقی ایس۔ کے پال۔ فنِ موسیقی اور قدیم و جدید تقاضوں کے ماہر معلوم ہوتے ہیں، گو ایک رات کی موسیقی۔ نغموں، راگ، راگنیوں اور شوخ آوازوں کا انبار نہیں ہے، پھر بھی نغموں میں شدّت کی کچھ مقدار تو ہونی ہی چاہیئے تھی، مگر جو کچھ ہے، وہ دلکش اور دلدوز ہے۔

پس منظر موسیقی کا جہاں تک تعلق ہے وہ نہایت دلنواز ہے تصویر میں رومانی اثر و فضا پیدا کرنا اصل میں پس منظر موسیقی کا کمال ہے۔ یہ ایک ماحول پیدا کرتی ہے اور انسانی روح کو غافل کر کے مسرّت و توجّہ کے اُس مرکز پر لے آتی ہے جو منظر کا اصل مرکز ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لحاظ سے ایس۔ کے پال بیحد کامیاب ہوئے ہیں۔

ایک رات کی پس منظر موسیقی نے تمام تصویر کے رومانی حلقوں میں ایک تسلسل، و تعلّق پیدا کر دیا ہے، اور زندگی و سماج ایک رشتہ میں پروئی ہوئی آنکھوں کے سامنے تھرکنے لگتی ہیں۔

لباس میں راجن (فوجی ڈاکٹر) کے جسم پر فوجی وردی کے ساتھ تلوار کا پر تلہ لٹکانا حیرت کی بات ہے۔ فوجی ڈاکٹر کرچ نہیں رکھتا، پھر یہ تعلقہ تو ۱۴ روپیہ پانے والے لڑاکا فوجی سپاہی کے لباس کا جزو ہے نہ کہ فوجی ڈاکٹر کا، نینا کو ساری کے علاوہ زیادہ تر شلوار میں دکھانا سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ مکالموں کی زبان اور کُل تصویر کے کلچر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پنجاب نہیں، یو۔پی کے کسی ماحول کی کہانی ہے۔ راجہ و مصاحب اور جملہ متعلقین کے جو لباس ہیں اُن سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ تصویر کا ماحول دوآبے کے (بقیہ مضمون دیکھو صفحہ ۸۵ پر)

پُجارن

ریکارڈ نمبر ۱۶۵

حضرت ساغر نظامی کی مقبول ترین شاہکار نظم جو انہوں نے خود اپنی درد بھری مست اور جاذب آواز میں ریکارڈ کی ہے

ہمیں مسرت ہے کہ شائقین کرام کی خدمت میں ہمیں بالکل انوکھی چیز پیش کرنے کا فخر حاصل ہے۔ ریکارڈ کیا ہے موسیقی و شعریت کا ایک اچھوتا مرقّع ہے جس میں ایک شاعر کے دلچسپ جذبات کو اسکی اپنی ہی جاذب واز نے ادا کیا ہے اور شاعر بھی کون؟ جناب ساغر نظامی جو اپنے تخیل کی بلندی الفاظ کی شیرینی اور آواز ل مترنم جاذبیت کے سبب ہندوستان کے شعراء میں ایک ممتاز ترین حیثیت رکھتے ہیں۔

جناب ساغر نے اس ریکارڈ پر اپنی دلکش ترین نظم "پجارن" کو پیش کیا ہے۔ جوں جوں وہ اپنی جذبات میں ڈوبی مترنم آواز سے اس محبوب نظم کو ادا کرتے جاتے ہیں سامعین کے دل پر ایک حسین تصویر نقش ہوتی جاتی ہے ہاں تک کہ ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور دل یہی چاہتا ہے کہ اس دلفریب نظم کو سنتے ہی رہیں اقعی یہ نادر ریکارڈ بار بار سننے کے قابل ہے۔

"ہز ماسٹرس وائس"